جب طوفان گذر چکا

تو کبوتر آسمانوں سے نیچے اترا۔ اور اس کی چونچ میں زیتون کی ایک سبز ڈالی تھی، اور اس ڈالی کو دیکھ کر وہ سب زمین کی اس وادی میں پہنچے اور خداوند خدا کی بزرگی کا نشان قائم کرنے کے لئے آس پاس کی پہاڑیوں کے نیلے بھورے پتھر جمع کر کے انہوں نے ایک عبادت گاہ بنائی۔ اور اس میں وہ آسمانوں کے بادشاہ کی حمد کرنے لگے جس نے انہیں طوفان سے بچایا۔ اور تب خداوند اسرائیل کے خدا کا جلال زیادہ ہوا اور کائنات نور سے معمور ہوگئی اور وادی میں رنگ برنگے پھول کھل گئے۔ اور خانقاہ کے چاروں طرف انگور کی بیلیں اور زیتون اور انجیر کے درخت اگ آئے۔

اور یوں ہوا کہ اس خانقاہ میں ازابلا رہتی تھی۔ جو لوریٹو کی مریم کی کنواریوں میں سے ایک تھی۔ اس کے بالوں کی لٹیں سرخی مائل سنہری اور اس کی آنکھیں نیلی اور بچوں کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ اس کی پیشانی پر فرشتوں کی تقدیس جھلکتی تھی۔ اور ازابلا خانقاہ کی سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ خوش آواز اور سب سے زیادہ نیک لڑکی تھی۔ جب وہ صبح کی سروس کے وقت موم بتیوں کی دھندلی روشنی میں کوائر کے ساتھ ''ہیل میری فل آف گریس'' گاتی تھی۔ تو قربانگاہ کے پیچھے محرابوں کے اندھیرے میں فرشتوں کے پروں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی تھی۔ اور ازابلا خانقاہ کے مدرسے کی سب سے زیادہ ذہین اور سب سے زیادہ ہر

دلعزیز طالب علم تھی۔ وہ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں سوچتی تھی اور اچھی کتابیں پڑھتی تھی اور اچھے فلم دیکھتی تھی..... ایک قدم جنت میں'' اور بربنا دیت کا نغمہ'' اور'' بادشاہت کی کنجیاں'' اور اس طرح کے سارے فلم اس نے دیکھ رکھے تھے۔ اور جب ازابلا خانقاہ کی دوسری کنواریوں کے ساتھ لوریٹو کی مریم کی مقدس راہبات کی نگرانی میں وادی کے خوبصورت سایہ دار راستوں پر سے گزرتی ہوئی کیتھڈرل یا آدی کی طرف جاتی تو راہ گیر ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتے آج بھگتن کے اسکول کی بابا لوگ ٹہلنے جارہی ہیں۔ یا کالا اسکول آج سینما جارہا ہے۔

اور اس سرسبز وادی میں رہنے والی ازابلا کی خانقاہ کالا اسکول اس لئے نہیں کہلاتی تھی کہ اس میں کالا لوگ پڑھتے تھے بلکہ اس لئے کہ اس کی راہبات کا لباس سیاہ اور اس کی لڑکیوں کے فراک سیاہی مائل نیلے ہوتے تھے اور اس خانقاہ کا خدا خاص الخاص گورے لوگوں کا خدا تھا اور کالوں کی روحانی اصلاح اور تربیت کے لئے خانقاہ کے باغ کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا چیپل الگ سے بنا دیا گیا تھا، کیونکہ طوفان کے بعد ہی خداوند مسٹر نوح کے خدا کے کالے کالے بچوں کے لئے کشتی میں چند نشستیں علیحدہ ریزرو کر دی گئی تھیں، اور خداوند خدا کے یہ کالے بچے گورے بچوں کے خانے میں کسی طرح داخل نہ ہو سکتے تھے۔

اور یوں ہوتا ہے کہ مقدس مریم کی سیاہ پوش راہبات خانقاہ کی لمبی سفید کار میں جب باہر نکلتی تھیں۔ تو کار کی کھڑکیوں پر کریب ڈی شین کے نیلے پردے کھینچ دیئے جاتے تھے۔ کیونکہ وہ ناپاک دنیا کی خرافات کے نظاروں سے اپنی پاک اور معصوم نگاہوں کو ملوث نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اور یوں ہوتا کہ یسوع کے سیدھے

راستے پر چلنے والی ایک اچھی کیتھولک کی طرح ازابلا بھی خانقاہ کی دنیا سے باہر اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں ہمیشہ نیچی رکھتی۔ اور جب نومبر اور دسمبر کے برفانی مہینوں کا کہرا وادی پر چھا جاتا تو ازابلا دوسری لڑکیوں کے ساتھ خانقاہ کے بڑے ہال میں آتشدان کے قریب بیٹھ کر الجبرا کے سوال حل کرتی اور وادی کے غریب بچوں کے لئے اونی چیزیں تیار کرتی۔ اور جب باہر برف گر رہی ہوتی اور دیوار کے درختوں کی ساری ٹہنیاں اور خوبانی اور آلوچے کے سارے پیڑ نرم نرم سفید برف سے لد جاتے تو وہ سب بڑے بڑے دریچوں والے موسیقی کے کلاس روم کے لکڑی کے فرش پر جمع ہو کر اپنے پسندیدہ رقص کرتیں اور پیانو پر رکھے ہوئے چاندی کے اونچے اونچے شمعدانوں کی روشنی میں کنواری مریم کی تقدیس کے گیت گاتیں۔ اور فرصت کے لمحوں میں ازابلا اپنی رفیق کے ساتھ دریچے کی نشست پر بیٹھ کر میڈونا کی تصویریں بناتی اور اسی طرح کی دوسری اچھی اچھی باتیں کرتی۔

پر اکثر ازابلا کو بہت دکھ ہوتا کہ اس کی عزیز ترین دوست کا جی ایسی اچھی اچھی باتوں میں نہیں لگتا۔ وہ خانقاہ بھر میں اس کی سب سے پیاری سہیلی تھی۔ اور وہ اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اور روزمیری میں ان کے برف جیسے سفید پلنگ بھی پاس پاس تھے اور اس کا نام راحیلہ تھا۔

اور یوں ہوتا کہ راحیلہ بائبل ہسٹری کے سبق کبھی یاد نہ کرتی اور ..... (OMMACULATE CONCEPTION) کی تھیوری سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے مطالعے کے گھنٹے میں وہ اپنے چچا زاد بھائی عمران کو لمبے لمبے دلچسپ خط لکھا کرتی جو اس برفانی وادی سے بہت دور پہاڑوں کے اس پار ان سبز

میدانوں میں رہتا تھا۔ جن میں سے پگھلی ہوئی چاندی جیسے کئی دریا بل کھاتے ہوئے گذر کے مشرقی سمندروں میں جا گرتے تھے۔ اور راحیلہ کی کتابوں میں مریم اور اس کے الوہی بیٹے اور مقدس خاندان اور مشرق کے تین عقلمند بادشاہوں کی رنگین تصویروں کے ساتھ عمران کی تصویریں بھی رکھی رہتیں۔ بلکہ عمران کی تصویروں کی تعداد زیادہ تھی۔

اور ازابلا کو یہ سب جان کر بڑا دکھ ہوتا۔ رات کو جب دعائے شب کے بعد خانقاہ کی روشنیاں بجھا دی جاتیں۔ اور مدر انجلینیا ڈورمٹری کا چکر لگا کر اپنے حجرے کی طرف چلی جاتیں تو ازابلا اپنے چھوٹے سے سفید بستر کے پاس دازانو جھک کر زیر لب سوتے وقت کی دعا دہراتی۔ ''مقدس مریم، خداوند کی ماں، ہم گنہگاروں کے لئے دعا کیجئے۔ اور پلیز میری! راحیلہ کے لئے بھی دعا کیجئے۔'' پھر وہ سو جاتی اور سوتے میں اسے لگتا جیسے اس کے پلنگ کے آس پاس خوب تیز روشنی ہو رہی ہے اور ورجن میری نے راحیلہ کو معاف کر دیا ہے کیونکہ اس نے عمران کو خط لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کی ساری تصویریں آتشدان میں پھینک دی ہیں۔

اور سردیوں کی ایسی راتوں میں جب برفانی ہوائیں خانقاہ کے دریچوں سے ٹکرا کر شور مچاتی تھیں۔ ازابلا کو اپنی پرسکون نیند میں بڑی اچھی اچھی سنہری دھوپ کا سماں دکھائی دیتا تھا۔ پر پھیلائے ہوئے فوارے کے چاروں طرف سفید خوشبودار پھولوں کے انبار ہی انبار۔ اور روپہلے پروں والے فرشتوں کے بازوؤں میں آسمان کی بلندیوں کی طرف اٹھتی ہوئی مقدس کنواریاں۔ اور دور دراز کی صحرائی اور کوہستانی خانقاہوں میں رہنے والے، اور بانسریوں پر الوہی نغمے

چھیڑتے ہوئے خوبصورت راہب، اور اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں جو راحیلہ کو ہرگز نظر نہ آ سکتی تھیں۔

اور ایک بار ایسا ہوا کہ بہار کی ایک خوشگوار سہ پہر جبکہ خانقاہ کی فضا پر ایک مطمئن اور بشاش سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، کچھ راہبات باغ کی کیاریوں میں کام کر رہی تھیں، باورچی خانے میں یسوع کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی عید کے لئے انڈے رنگے جا رہے تھے۔ اور کلاسوں میں خاموشی سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ یکا یک سیب اور بادام کے جھنڈ میں چھپے ہوئے عبادت خانے کا گھنٹہ زور زور سے بجنے لگا اور سب کے دل ایک لحظے کے لئے ڈوب سے گئے اور بخشش کی دعائیں لبوں پر لرز اٹھیں۔ کیونکہ یہ گھنٹہ اتنے زور زور سے اور بے وقت تب ہی بجایا جاتا تھا۔ جب خانقاہ کے کسی باسی کی روح دنیا کے پل کو عبور کر کے ابدی خلائے بیکراں میں جا سماتی تھی اور سب اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر قطار در قطار خاموشی سے عبادت خانے کی طرف جانے لگے۔ کیونکہ سسٹر ایولین کو جو ایک عرصے سے سخت ترین جسمانی تکالیف انتہائی صبر و سکون سے برداشت کر رہی تھی، مریم نے اپنے پاس آسمانوں پر بلا لیا تھا۔ راہبات کے چہروں پر مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ کتنی خوش قسمت تھی کہ اتنی جلدی، اس کم عمری میں مریم کے پاس پہنچ گئی۔ اور جتنی راہبات اور لڑکیاں ایولین کے آخری وقت میں اس کے پاس موجود تھیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کا نیلے پتھروں والا اجرہ ایک لحظے کے لئے آسمانی نور سے جگمگا اٹھا تھا اور اس نے اس نور میں مریم کا جگمگاتا چہرہ دیکھ کر ہوا میں اپنے بازو پھیلا دیئے تھے۔ کتنی قابل

رشک موت تھی۔ اور جب اس کے جنازے کے جلوس کے آگے اونچی اونچی شمعدانیں لئے مقدس باپ ناشپاتی اور سیب کے جھنڈ کے سایوں میں کھو گئے اور جب چیپل میں اس کی موت کا ماس ختم ہو گیا اور سب باری باری قربان گاہ کے کالے پردے کو چوم کر نیچے اتر آئے تو راحیلہ سب سے آخر میں شاہ بلوط کا بھاری، سفید روغنی دروازہ آہستہ سے بند کر کے عبادت خانے کی پچھلی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے قریب ہی ایک پتھر پر ازابلا دعا کی کتاب بند کر کے خاموشی سے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اور پھر اس نے راحیلہ سے کہا مت روؤ راحیلہ! ایولین سویٹ جیزس کے بازوؤں میں پہنچ چکی ہے۔ لیکن راحیلہ کی سمجھ میں یہ قطعی نہیں آیا اور وہ کہتی رہی ایولین کیوں مر گئی۔ کیوں مر گئی۔ اور ازابلا لرز اٹھی۔ راحیلہ ایسی کفر کی باتیں کیوں سوچتی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ یسوع کے گلے میں شامل نہیں ہے۔ اور بپتسمہ کی نعمت سے محروم رہی ہے، اسی لئے راحیلہ پھر چلا اٹھی۔ کیا ہے تمہارا سویٹ جیزس۔ اور ازابلا نے جلدی سے صلیب کا نشان بنالیا اور سوچنے لگی کہ اسے خدا سے کوئی شکایت نہیں، وہ اپنی دنیا اور اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہے۔ اور پھر اس نے خداوند کی بے شمار رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور دن اسی طرح گذرتے رہے۔ ایسٹر کے بعد موسم گرما کی ہوائیں چلنے لگیں۔ اور راحیلہ اور خانقاہ کے بورڈنگ کی بہت سی لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی جاتیں اور بارشوں کا زمانہ آنے پر خانقاہ کا مدرسہ دوبارہ کھلتا۔ پھر پت جھڑ کے مہینے آ جاتے اور سردیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ کرسمس کے استقبال کی تیاریاں

شروع ہو جاتیں۔ فضا میں کرسمس کے نغمے گونجنے لگتے۔ اور خاموش اندھیری راتوں میں الاؤ کے گرد بیٹھ کر پرانی اور محبوب حمدیں گائی جاتیں۔ سائیلنٹ نائٹ، ہولی نائٹ، ہولی نائٹ، ہولی مدر اینڈ دی چائلڈ۔ اور سٹار آف ونڈر اسٹار آف لائٹ۔ والے گیت۔ اور بیت الحم کا ستارہ اسی تابانی سے جھلملاتا جیسے اس رات بیت الحم کے اس اصطبل پر جھلملایا کرتا تھا۔ جہاں خداوند خدا کے اکلوتے بیٹے نے بھوسے کے ڈھیر پر جنم لیا تھا۔ پھر کرسمس کا شاندار پجٹ ہوتا اور اس کے بعد سال نو کی ضیافت مریم اور سینٹ پال اور سینٹ فلورا اور ساری مقدس روحوں کے تہواروں کی خوشیاں منائی جاتیں اور پھر اسی سیدھے راستے پر سے گذرنے کے لئے زندگی کا ایک اور سال شروع ہو جاتا۔ اور ازابلا انتہائی اشتیاق سے اس وقت کی منتظر تھی۔ جب تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے ''ہماری لوریٹو کی لیڈی'' کے آرڈر میں باقاعدہ داخل کر لیا جائے گا۔ اور اس کی سرخی مائل سنہری لٹوں کو مونڈ کر اس کا سر سفید چھجے والے سیاہ ہڈ میں اور اس کی پیشانی سفید پٹی میں چھپا دی جائے گی۔ اور جب وہ ایک ملکوتی وقار کے ساتھ اپنی کمر سے نقرئی صلیب کی زنجیر لٹکائے اپنا سیاہ لبادہ سرسراتی خانقاہ کے برآمدوں اور غلام گردشوں میں سے گذرا کرے گی تو راحیلہ کے بچے اپنے ساتھیوں کو فخریہ بتائیں گے کہ ان کی ممی نے سسٹر ازابلا کے ساتھ پڑھا تھا۔ پھر ایک مبارک وقت ایسا آئے گا جب اس کی دنیاوی زندگی کے دن خداوند خدا کی مرضی کے مطابق پورے ہو جائیں گے اور اسے اوپر اٹھا لیا جائے گا۔ اور اسے باغ کی سایہ دار روشوں پر سے اسی طرح لے جائیں گے جیسے ایولین کو لے گئے تھے۔ اور اس کے سیاہ تابوت کے ساتھ بہت سی شمعیں

ہوں گی جس طرح کورپس کرسٹی کے تہوار کے جلوس میں سب کے ہاتھوں میں ایک ایک اونچی سی شمع ہوتی ہے۔

اور ازابلا یہ سب سوچ سوچ کر بے حد خوش ہوا کرتی اور اسکول کے پہلے گھنٹے میں دینیات کے وقت قریب بیٹھی ہوئی راحیلہ کو چپکے چپکے ساری ضروری باتیں یاد کرا دیتی پیدائش کا بیان اور رومیوں کا خط اور داؤد کے نغمے اور یوحنا اور لوقا کے باب تاکہ اگر مدرسپریر پڑھاتے پڑھاتے کوئی سوال کر بیٹھیں تو راحیلہ کو سٹپٹانا نہ پڑے۔اور وہ پڑھتیں۔اور خدا کی روح سمندر کی سطح پر منڈلا رہی تھی۔اور یہ چھٹا گھنٹہ تھا۔اور یسوع نے کہا خداوند خدا میرے باپ کا جلال زیادہ ہو اور وہ زیتون اور انجیر اور شراب اس کے سامنے لائے۔اور یہ اٹھارواں گھنٹہ تھا۔اور اس نے تھوڑی تھوڑی مچھلیاں سب کو دیں۔اور یوں ہوا کہ وہ مچھلیاں اتنی ہی رہیں۔اور خداوند خدا نے ایک کبوتر آسمان نے کنواری مریم کے پاس بھیجا اور یوں ہوا کہ وہ روح القدس سے بھر گئی۔اور یوں ہوا۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک شام راحیلہ کی اٹھارویں سالگرہ کی ضیافت کے موقع پر جب اس نے دیکھا کہ راحیلہ عمران کے علاوہ اور بہت سے نوجوانوں سے بھی اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔جو باتیں اسے صرف عمران سے ہی کرنی چاہئیں تھیں۔تو اسے یہ بات اس قدر خوفناک طور پر نامناسب معلوم ہوئی کہ اس نے چاہا کہ چپکے سے فوراً صلیب کا نشان بنا لے۔لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔کیونکہ دوسرے لمحے ایک بے حد شاندار اور خوبصورت سا نوجوان جو کافی دیر سے پیانو کے قریب کھڑا اپنی سیاہ آنکھوں کے تبسم کے ذریعے ایوان رقص میں موجود ساری

خواتین کے نازک اور معصوم دلوں پر سینکڑوں بجلیاں گرا رہا تھا۔ اس کے پاس آ گیا اور رومال سے پیشانی پونچھ کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کہنے لگا۔ کہ آج کی شام کس قدر گرم ہے اور ازابلا نے کہ اپنی خوش خلقی کے لئے مشہور تھی۔ اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور پھر جب آرکیسٹرا کے سازوں پر زور زور سے چوٹیں پڑنا شروع ہوئیں، تو راحیلہ اپنے مہمانوں کو فرداً فرداً محظوظ کرتی ہوئی ان کی طرف بھی آئی اور اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتی ہوئی فلور پر لے گئی۔ جہاں وہ رقص کرنے والوں کے مجمع میں کھو گیا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ دوسرا ناچ شروع ہونے سے قبل کے وقفہ میں راحیلہ نے ازابلا کا اس سیاہ متبسم آنکھوں والے نوجوان سے تعارف کرایا۔ چنانچہ یوں ہوا کہ اس نے ازابلا سے درخواست کی اگلے اسپینش والز میں وہ اس کے ساتھ ناچے۔ اور رقص کے بعد اس نے دوبارہ گرمی کی زیادتی کی شکایت کی اور پھر وہ ہال سے باہر آ کر نیچے باغ میں اتر گئے۔ اور وہ فوارے کے قریب ستاروں کے نیچے بہت دیر تک بے حد دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ اور اس نے بتایا کہ وہ کون کون سی سرزمینوں میں گھوم چکا ہے۔ اور کیا کیا چیزیں دیکھ رکھی ہیں، پھر اس نے ازابلا سے پوچھا کہ اس نے کون سے نئے فلم دیکھے ہیں اور کیا کیا کتابیں پڑھی ہیں۔ اور سے فرانسیسی اور لاطینی اور جرمن کے علاوہ اور کون کون سی زبانیں آتی ہیں۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے جرمن موسیقی سے عشق ہے۔ اور زرد گلاب کے پھولوں سے، اور دھوپ کی رنگت والے سرخی مائل نارنجی بالوں اور نیلی آنکھوں سے، اور اس وقت ہوا گرم تھی۔ اور اس میں زرد گلاب کے شگوفوں کی خوشبوئیں ملی ہوئی تھیں، اور راحیلہ کے

خوبصورت باغ کے کنارے پل کے نیچے کوہستانی ندی مدھم سا شور کرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ اور جگمگاتی ہوئی دنیا ان کے چاروں طرف دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور پہاڑی راستوں پر چرواہے بانسریاں بجاتے ہوئے گذر رہے تھے۔ اور ایوان رقص میں اس کی طرح کے اور بہت سے شاندار اور سیاہ لباسوں والے آدمی خوبصورت عورتوں سے اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ اور چاندی کے برتنوں پر برقی فانوسوں اور تیزی سے گھومتے ہوئے سفید برقی پنکھوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

اور دوسری جگمگاتی ہوئی روشن صبح ازابلا دوسرے مہمانوں کے ساتھ راحیلہ کے خوبصورت جھنڈ کی سیر کر کے واپس آ رہی تھی۔ تو اس نے دیکھا کہ باغ کے سرے پر ندی کے پل کے پاس کا پچھلی رات کا چاند چند اور آدمیوں کے ساتھ کھڑا گھوڑوں پر زین کسوا رہا ہے۔ اور جب وہ ان کے قریب سے گزری تو وہ تعظیماً اپنی ٹوپی اتار کر مسکرا دیا اور پھر اپنے دوستوں کی طرف مڑ کر ان سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

اور پھر دوسری شام آئی اور راحیلہ کے گھر پر طعام شب کے بعد اسے اچانک یاد آیا کہ یہ سینٹ فرانسس کے تہوار کی رات ہے۔ اور اس نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس مقدس رات کے احترام کی پروا کسی کو نہیں۔ سب لوگ کھیل کود میں بے طرح مصروف تھے۔

اور تب ایسا ہوا کہ اس رات اس نے نیندوں کی بستی میں پہنچ کر دیکھا کہ راحیلہ کے مہمان خانے کی خوبصورت نیلگوں خواب گاہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ اور فضا میں فرشتوں کے نغمے لرزاں ہیں اور پھر اسے ایک بے حد خوبصورت

اور شاندار انسان نظر آیا۔ جس نے گہرے عنابی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی ٹوپی میں ایک لمبا سا نیلا پر لہرا رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں چاندی کی بانسری تھی اور ازابلا صلیب کا نشان بنا کر فوراً دوزانو جھک گئی۔ ''سینٹ فرانسس.....!'' اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں آہستہ سے کہا۔ اور اس شخص نے اپنی بانسری کی جنبش دے کر بے حد شیریں اور بے حد گہری آواز میں جیسے کہیں دور دینیوب کے پانیوں پر چاندنی رات میں گٹار بجایا جا رہا ہو اسی آہستگی سے جواب دیا۔ ''میں سینٹ فرانسس قطعی نہیں ہوں۔'' اور پھر وہ ایک قہقہہ لگا کر غائب ہو گیا اور روشنی بجھ گئی اور فضاؤں کے راگ بند ہو گئے۔ اور ازابلا اسی طرح دوزانو بیٹھی رہ گئی۔ اور یک لخت اس نے محسوس کیا نیندوں کی بستی کی ساری شمعیں ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ اور پھر خواب گاہ کے خوبصورت نیلے ایرانی قالین پر سے اسے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں اوپر اٹھا لیا گیا اور دریچے سے باہر چاندنی رات کی ہوائیں چلنا بند ہو گئیں اور فضا میں گرمی بڑھ گئی۔

اور یوں ہوا کہ ایک کبوتر مریم کے پاس آیا، اور یوں ہوا کہ وہ روح القدس سے بھر گئی۔

سرراہے

موسم گرما کے چاند کی کرنیں دور دور تک سفید اور بھوری چٹانوں پر بکھر گئی تھیں۔ اور ہواؤں میں رات کے پھولوں کی تیز مہک اڑ رہی تھی۔ اور دیوداروں کے پرے ہوٹل کونچینٹل میں شومین کا ''کارنیول'' بج رہا تھا۔ اور چنار کے درختوں کے نیچے رسپنا کانقرئی پانی نیلگوں سنگریزوں پر سے آہستہ آہستہ شور کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ اور اس وقت پرانی کشتیوں کے پل پر چلتے چلتے دفعتاً رک کر اس نے کہا۔

''تمہارے خیال میں کیا یہ ایسی مکمل رات نہیں جس میں خودکشی کر لی جائے۔''

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کہ وہ خوب ہنسے گا۔ کتنا عجیب خیال ہے۔

وہ جو نارنجی بالوں اور گہری سبز آنکھوں والی ایک گڑیا تھی، جو ہنس اینڈرسن کی پریوں کی کہانیوں کی رنگین تصویروں والی کتاب میں سے نکل کر دنیا میں آ گئی تھی۔ اور رانپنزل اور روز ریڈ کی طرح اس نے صنوبروں کے جنگل میں پام کیک کا ایک گڑیا گھر بنایا تھا۔ جس میں صرف چوکولیٹ کریم سے بنے ہوئے لوگ رہ سکتے تھے۔ بالکل جیسے ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' والے خرگوش کا چھوٹا سا سفید گھر تھا۔ اور اس کے دریچے میں ایک گلابی چونچ والا کاکاتو ا بیٹھا اپنے پروں سے اپنی چونچ صاف کرتا رہتا تھا۔ اور اس کی سرخ چھت پر ایک بڑی سی سفید ایرانی بلی بھی بیٹھی رہتی تھی۔ یہ سب اس نے خود ہی سوچ رکھا تھا۔ ظاہر ہے۔ اور ہینس اینڈرسن کی

کہانیوں والی سوتی جاگتی گڑیاں عجیب باتیں ہرگز نہیں سوچ سکتیں وہ صرف اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر ''ممی ممی'' کہہ سکتی ہیں۔

اور اس لئے یہ سب سن کر دنیا کے چھوٹے چھوٹے انسانوں نے اپنی اپنی ناکیں اوپر اٹھالیں۔

اور میں زرین تاج جو، ان چھوٹے چھوٹے انسانوں میں سے ایک ہوں میں نے بھی اپنی چھوٹی سی ناک اوپر اٹھالی۔

اور اس سے کہنا شروع کیا۔ ''اے کہ تم صرف ایک چینی کی بڑی سی نہایت احمق گڑیا ہو۔''

لیکن وہ خاموش رہی۔ ہوٹل کونٹینینٹل کی موسیقی بھی دور اپنے پردوں پر ٹھہر گئی اور فضا پر ایسا سکوت طاری ہو گیا۔ جیسا آندھی آنے سے پہلے ہوتا ہے۔

اور ایسا ہوا کہ ہم دونوں اپنے کمرے میں دریچے میں بیٹھے کچھ نہ کرنے میں مصروف رہے۔ یعنی وہ اور میں ہمارے باغ کے نشیب میں سیب کے شگوفوں کے نیچے چھوٹی موٹی پریاں رہتی ہیں۔ ایک دفعہ بارش کے بعد سفید برساتی مشروم جمع کرتے ہوئے میں نے اسے پریوں کا پتہ بتایا تھا۔ اس وقت دریچے میں بیٹھ کر کچھ نہ کرتے ہوئے شدت سے میرا جی چاہا کہ میں پریوں سے ملوں۔

''بڑی گڑبڑ ہے بھئی۔'' بے حد اکتا کر اس نے دفعتاً کہا۔

''ہاں، بڑی گڑبڑ ہے پریاں کہیں نہیں ملتیں۔'' میں نے کہا۔

''سخت انتشار کا عالم۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

''بہت سخت انتشار کا عالم۔'' میں نے دوبارہ جواب دیا۔

''سکون مفقود۔'' اس نے رائے ظاہر کی۔

''قطعی مفقود۔'' میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

''تمہیں وہ خودرو سفید پھول یاد ہیں۔''

''خودرو سفید کیا؟''

''میں اپنے ساتھ سفید جنگلی پھول لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔ اور ان پھولوں کی پنکھڑیاں بہار کی گرم شام کے نقرئی جھونکوں سے گھبرا کر نہ گر سکیں گی۔''

کیونکہ وہ ہمارے خوابوں کی طرح ہیں۔ جو ان جانی ہواؤں کے ساتھ بھٹکتے پھریں۔ اندھیرے کے سایوں میں چھپی ہوئی تمہاری سیاہ آنکھوں کو دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔

ان کی گہرائیوں میں کہیں حقیقت نظر نہ آ جائے۔

لیکن میرے سفید خودرو پھولوں کو یاد رکھنا۔

رات گذرنے کے بعد تم جاگ اٹھو گی۔

لیکن جو خودرو کلیاں خوابوں کے اندھیارے میں ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔''

اور فضا پر مکمل سکوت چھا گیا۔ اور پیانو پر رکھے ہوئے جاپانی واز کا اکیلا سفید پھول اپنے ڈنٹھل سے الگ ہو کر نیچے پیانو کے پردوں پر گر پڑا۔ پر وہ اتنا چھوٹا اور اتنا ہلکا تھا کہ اس کے گرنے سے پردوں میں سے ذرا سی آواز بھی پیدا نہ ہوئی۔

''پر ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔'' اس نے کہا۔

اور پھر یہ ہوا کہ بڑے زور کی آندھی اٹھی۔ اور آگ جیسا سرخ چاند اندھیرے میں پہاڑیوں کی سیاہ چوٹیوں سے ٹکرا گیا۔ اور طوفان کے بہاؤ میں

پھولوں کے سارے ہرے پودے جھک گئے۔ اور نئے درختوں کی تمام پتلی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر روشوں پر گر پڑیں اور اس نے سب دریچے بند کر دیئے۔ اور پھر وہ اپنے آپ سے اور بھی زیادہ اکتا کر فان میر کی اس تصویر کی طرف غور سے دیکھنے لگی جو میں یعنی زریں تاج نے روغنی گلوں میں ری پروڈیوس کر کے موسیقی کے ٹرنٹی کالج کا امتحان پاس کرنے پر اسے تحفے میں دی تھی۔ اور اسے ندی پار کے صنوبروں کے جنگل والے چوکولیٹ کے مکان کا خیال آیا (کچھ کچھ یوں جیسے سڑک کی دوسری طرف خوبانیوں اور لیچیوں کے جھنڈ کے پیچھے صاحبزادیاں سعید الظفر خاں کی ایلزبتھین وضع کی دومنزلہ کوٹھی ہے) جس کی دیواروں پر آیوئی چمٹی ہوئی تھی۔ اور جس کے دریچے میں گلابی چونچ والا کاکاتو ابیٹھا تھا۔ اور جب جھکڑ کا زور کم ہوا اور سرخ چاند مدھم پڑ کے نیلگوں پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اور صبح کا دھندلکا وادی کے راستوں پر بکھرنے لگا تو شور مچاتے ہوئے پہاڑی نالے کے پرے جیزس اینڈ میریز کے اداس سرمئی رنگت والے عبادت خانے میں سے شکرانے کی نماز کے گھنٹوں کی آواز بلند ہوئی کہ خداوند ہمارے خدا نے ہمیں ایک اور طوفان سے بچالیا۔

اور جب صبح کے آفتاب کی روشن کرنیں دریچے میں سے اندر داخل ہوئیں۔ اور میرے چھوٹی سی ناک کی کافی خوبصورت نوک سردی سے محفوظ ہوگئی۔ تو ابا میاں کے لئے انڈے کا پوچ تیار کرتے کرتے میری نظریں فان میر کے اس شاہکار پر پڑ گئیں۔ جسے میں نے ووڈ اسٹاک میں اوریجنل سے ری پروڈیوس کیا تھا۔

''اللہ، بھئی کیوں اتنی گڑبڑ ہے۔'' گڑیا مارملیڈ بھی کھاتی جا رہی تھی۔

''ہُم'' صنوبروں کے جھنڈ اور شومین کے نغمے مجھے یاد آ گئے۔

''رات اتنی بڑی آندھی آئی تھی۔'' گڈو نے بتایا۔

پھر گڑیا شفتالو اور چیری کے پھولوں والی اپنی جاپانی چھتری اٹھا کر پہاڑی نالے کے اس پار اپنی موسیقی کی کلاس لینے چلی گئی۔

اور بگولے کی سی تیزی کے ساتھ پنچو واپس آیا جو سیپ کے شگوفوں تلے بسنے والے چھوٹے چھوٹے معصوم انسانوں میں سے ایک تھا۔

''گڑیا کہاں ہے؟'' اس نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔ اور پھر اس نے آہستہ سے کہا کہ ''اب اس کا دماغ ٹھیک ہے نا؟''

میں زریں تاج چپ چاپ پوچ تیار کرتی رہی۔

تو پھر میں ممی سے کہہ دوں نا؟ اور پنچو جواب کا انتظار کئے بغیر بگولے کی سی تیز رفتاری سے غائب ہو گیا۔

پیانو پر جاپانی داز کے قریب رکھی ہوئی تصویر کی ڈچ لڑکی اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جھپکتی رہ گئی۔

اور پھر ابا میاں کو پوچ کھلا دینے کے بعد میں گلابی آنکھوں والے اپنے سفید خرگوشوں کو دیکھنے کے لئے باہر آئی۔

پنچو جھکی ہوئی خوبانیوں کے نیچے ایک نیلے پتھر پر بیٹھا ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے سخت غور و فکر میں مصروف تھا۔ اور ''عبداللہ'' پی رہا تھا مجھے خرشوگوں کی طرف جاتے دیکھ کر اس نے نہایت بے فکری سے سیٹی بجانی شروع کر دی۔ ٹار

اور اس وقت وہ اتنا ہی معصوم اور شریف نظر آیا۔ جتنا معصوم اور شریر وہ اپنے سکول کے دنوں میں لگا کرتا تھا۔ اور سینٹ جارجز یا رائل اکیڈمی سے چھٹیوں میں گھر آ کر شور مچاتا تھا۔

''گڑیا اسکول چلی گئی؟'' اس نے دوسرا سگریٹ جلایا۔

''پتہ نہیں.....ہنہ.....''

''تم دونوں بلیاں آج پھر لڑی ہو؟''

''جناب میں بلی ہرگز نہیں ہوں۔ تم خود اس قدر کے لڑاکا پلے۔''

''فوہ۔''

''بلکہ لڑاکا مرغے۔''

''فوہ.....فوہ.....''

''یا اللہ تو فرخندہ آپا کو آج ہی پہلے ''گیٹ'' سے بھیج دے۔''

''ہُم۔ عرض یہ ہے کہ پہلے ''گیٹ'' سے انور آ رہا ہے۔''

''ایں؟''

''ہُم۔''

پھر پخو اس پتھر پر سے اٹھ کر اپنی نیلی اسپورٹس کار صاف کروانے کے لئے سیٹی بجاتا اور سگریٹ پیتا ہوا گیراج کی طرف چلا گیا۔ اور روش کی اودی اور سفید اور سرمئی بجری پر اس کے بوٹوں کی رگڑ سے دیر تک شور ہوا کیا۔ اور سردی کے مارے اس کو بڑے زوروں کا زکام ہو گیا تھا۔

اور اپنا صبح کا ناشتہ ختم کرنے کے بعد میرے سارے خرگوش جھاڑیوں میں بھاگ گئے۔ اور مالیوں نے رات کی آندھی سے باغ کے پامال شدہ حصوں کی صفائی شروع کر دی۔ بدلتے موسم میں آندھیاں بالکل اچانک اور بڑے زور شور سے آتی ہیں۔

پھر کیپٹن انور اور فرخندہ آپا آئیں۔ اور فرخندہ آپا کے پاس ایک نہایت خلیق میزبان کی حیثیت سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ان کو البم دکھایا گیا۔ تاکہ سہ پہر کی چائے سے لے کر شام کے کھانے تک کے وقفے کی بوریت میں کچھ کمی کی جا سکے۔ اور چھوکیپٹن انور کی جائے قیام پر راجپور گیا ہوا تھا۔ اور پہاڑی نالے کے پرے کانونٹ کے پرانے میوزک روم میں بیکار لڑکیوں کے ساتھ ای فلیٹ میجر اور اے مائینز پر سر کھپانے کے بعد واپس آ کر گڑیا انتہائی اکتاہٹ سے آم کی آئس کریم بنانے میں مشغول تھی۔ اور دنیا بے حد فضول اور غیر دلچسپ جگہ معلوم ہو رہی تھی۔

کہ فرخندہ آپا البم کے ایک صفحے پر رک گئیں۔

؟.....

''فرخندہ آپا، یہ گڑیا کا بھائی ہے بے چارہ۔''

؟.....

''جی گڑیا یعنی نادرہ کا بڑا بھائی۔

''او.....لیکن نادرہ کا تو.....''

''جی ہاں، فرخندہ آپا، دراصل گڑیا کی دو ممی ہیں، اور دو ابا میاں ہیں۔ اور ایک

بھائی ہے یعنی پنھو۔"

"ایں؟"

"ہُم۔ گڑیا کی ممی تو اس کی اپنی ممی ہیں اور خالہ بیگم نے اس کو متبنیٰ بنا کر رکھا ہے اور خالہ بیگم پنھو کی ممی ہیں۔" اتنے طویل رشتے سمجھاتے سمجھاتے میں فوراً اور بھی زیادہ بور ہوگئی۔

اور گڑیا بے تعلقی سے پینٹری کے دروازے میں بیٹھی ایک حماقت زدہ ککری بک پڑھ رہی تھی۔

پھر خالہ بیگم نے پچھلے برآمدے میں سے نماز کے تخت پر سے سلام پھیر کر اترتے ہوئے آواز دی۔ "تم سب لڑکیاں آج شام کو گھر پر نہ رہو۔ اور جاؤ باورچی خانہ صاف کرو۔"

اور گڑیا کا جی مرنے کو نہیں چاہا۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر مرنے کی خواہش بے حد عام اور بے وقعت چیز ہے۔ اور میں زریں تاج جو زندگی کے متعلق ایک نہایت صحت مند نظریہ رکھتی ہوں۔ میں نے اس وقت بوریت کو کم کرنے کے لئے اس سے اپنی خاص فرنچ یا فارسی شروع کرنا چاہی۔ لیکن وہ فوراً پینٹری کی الماری میں سے ایک اور ککری بک نکال لائی۔ اور باورچی خانے کے پچھلے باغ میں کھلنے والے نیچے دریچے میں بیٹھ کر ایک اطالوی یا جاپانی یا شاید ترکستانی پڈنگ کی ترکیب پر غور کرنے میں مصروف ہوگئی۔ پھر اسی وقت اپنے قبیلے کی ایک اور فرد، فرحت کا فون آیا جسے صبح صبح پتہ چل گیا تھا۔ کہ بے حد اہم مہمان آ رہے ہیں۔

"پتنگ آ گئی۔ کیا نام ہے ان کا؟"

''ہاں بھئی آ گئی۔تمہارے منہ میں شکر گھی اور ٹافی۔''

''کون آ گئی؟'' خالد بیگم نے پچھلے برآمدے سے دریافت کیا۔اور اس لئے اپنی فارسی شروع کی گئی۔

بلے، ونام اوں مرد مومن خپتون دکتورا انور است و.....'' فارسی کے دریا اور بہائے جاتے۔لیکن ڈرائنگ روم نہ ٹھیک کرنے کے سلسلے میں خالہ بیگم کی تیسری ڈانٹ سنائی دی۔

اور ریسیور رکھا ہی تھا کہ دوبارہ گھنٹی بجی۔خیال ہوا کہ بیچاری فرحت بات ختم کرنی چاہتی ہے۔فارسی کی رو میں بغیر اچھی طرح سنے جلدی جلدی جواب دیئے گئے۔

''عارف صاحب تشریف رکھتے ہیں۔''

''بلے؟''

''ہلو۔عارف صاحب۔ہلو۔''

''نمی دانم۔''

''جی۔''

''من نمی دانم کہ اوں.....۔'' وقفہ

''ہلو.....'' پھر دوسرے سرے پر قطعی طور پر جھنجھلاہٹ کے ساتھ ریسیور رکھ دیا گیا۔

پھر شام کو ڈاکٹر انور کے آنے سے ذرا پہلے پٹھو نے آ کر کہا۔ارے بھئی دوپہر انور نے راجپور سے فون کیا تھا۔یہاں سے کوئی جواب ہی نہیں ملا۔نہ جانے کس

زبان میں بات کی جارہی تھی۔ اس نے سوچا۔ شاید اس نے غلط نمبر ڈائل کیا ہوگا۔ اور تقریباً ہارٹ فیل ہو گیا۔ اپنی ہونے والی منگیتر کی بہن صاحبہ کا کس قدر نفیس امپریشن پڑا ہوگا۔ فون پر کیا فارسی بولتی ہیں۔

اور رات کے کھانے پر فرخندہ آپا پہلی بار پنو سے ملیں۔ فرخندہ آپا جو سلیکس پہنتی تھیں اور سر پر جارجٹ کے اسکارف کی ٹربن لپیٹتی تھیں۔ اور کسی آئی۔ سی۔ ایس کے لئے منتظر ہو بیٹھی تھیں۔

اور کھانے کے بعد برساتی سے لے کر پھاٹک تک کے راستے میں حسب ذیل مکالمہ شروع ہوا۔

''مسٹر عارف۔ ڈو یو ڈانس؟'' (ڈانس کا الف ذرا کھینچ کر پڑھئے)

''نو''

''اوہ۔ آئی لو ڈانسنگ۔ اسپیشلی رمبا اینڈ ٹینگو۔''

وقفہ

''مسٹر عارف ڈو یو پلے؟'' (پلے کی یے کھینچئے)

''یس، فرخندہ آپا۔''

''ووٹ؟'' انتہائی شگفتگی سے سوال ہوا۔

''کرکٹ'' پنو نے مستعدی سے کہا۔

''اوہ۔ آئی مین۔ اینی انسٹرومینٹس۔ لائیک وائیلن اور پیانو۔ آئی لو پیانو۔''

(لو کے ل پر خوب زور دیجئے)

.....خاموشی.....

''مسٹر عارف۔''

(چھینکیں)..... ''ار..... فرخندہ آپا مجھے بڑا سخت زکام ہو رہا ہے۔ کہیں آپ کو نہ لگ جائے۔''

''اوہ نو.....!''

اور زیادہ چھینکیں.....

اور سڑک پر پہنچ کر پنٹو، انور کے ساتھ اپنی نیلی اسپورٹس کار میں بگولے کی سی تیزی سے بھاگا۔

پھر منگنی کے آفیشیل اناؤنسمنٹ کے لئے ہوٹل کونٹینینٹل میں ڈنر دیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر انور سے اچھی طرح باتیں کرنے کا موقع ملا۔ جو ایک بہت اچھا انسان تھا۔ سلجھے ہوئے خیالات، بے حد پر مذاق اور انتہائی ذہین، بالکل جیسا پنٹو کے ایک دوست کو ہونا چاہیے تھا۔

اور بالکونی کے قریب بچھی ہوئی طویل سفید میز پر تیز سرخ گلاب کے پھولوں کے ڈھیر کی دوسری طرف گڑیا بے حد اخلاق سے انور سے باتیں کرتی رہی۔ بالکونی سے باہر دیودار اور صنوبروں کے پرے، افق کی نیلگوں لکیر پر مسوری کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

اور رات کے آخری لمحوں تک وہ سوچتی رہی۔ ندی کے پار کے پلم کیک والے مکان کے نقرئی شمعدان شاید اب بھی روشن ہوں۔ مگر صنوبروں پر سے سرسراتا ہوا ایک خنک اور تیز جھونکا آیا۔ اور ایوان طعام کے دریچوں کے پٹ زور سے بند ہو گئے۔

فرحت نے مبارک باد کا گیت ختم کرنے کے بعد پیانو پر زور سے انگلیاں پٹکیں۔ اور سارا مجمع میزوں پر سے کھڑا ہو گیا۔ رقص، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے رنگین گھوڑوں کی ریس اور دوسرے خوب شور مچانے والے کھیلوں کے لئے گروہ بننے شروع ہوئے اور پنچو فرداً فرداً سارے مہمانوں کو تفریحات میں حصہ لینے کے لئے بلاتا ہوا کیپٹن انور کے ساتھی مسٹر کاظمی کی طرف آیا۔ جو ابا میاں کو پنجاب کی یونینسٹ گورنمنٹ کی پالیسی کے نکات سمجھانے پر مصر تھے۔ اور فرخندہ آپا کو دیکھتے جاتے تھے۔

''آپ رقص فرمائیں گے؟'' پنچو نے پوچھا۔

''لاحول ولا۔ مسلمان پر لہو و لعب حرام ہے۔''

''ار..... اچھا، تو آپ یہیں بیٹھے رہیں گے۔ کسی کھیل میں بھی شریک نہ ہوئیے گا۔''

''ذی ہوش آدمیوں کا بچوں کی طرح لکڑی کے گھوڑوں اور کاغذی ٹوپیوں میں دلچسپی لینا سخت مضحکہ خیز حرکت ہے۔''

ڈنر کی رات کے اختتام پر جب اس نے گھر واپس آ کر پیانو پر رکھے ہوئے نقرئی شمعدان کی مدھم روشنی میں سونے کے لئے اپنی گہری سبز آنکھیں بند کیں تو جھلملاتی شمعوں کے دھندلے سائے اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ جیسے ایک بار خوابوں کے ساحلوں سے اس نے، اس دوسرے انسان نے آہستہ سے پکارا تھا۔

آسمان کا زرنگار فرش اگر میرے پاس ہوتا۔ سیاہ اور نیلگوں رات کی نقرئی اور

سنہری روشنیوں اور جھلملاتے دھندلکوں کا فرش، تو میں اسے تمہارے قدموں کے نیچے بچھا دیتا۔

لیکن میں غریب ہوں اور میرے پاس صرف خواب ہیں۔

اور میں نے اپنے خواب تمہارے راستے میں بچھا دیئے ہیں۔

آہستہ آہستہ قدم رکھو

کیونکہ تم میرے خوابوں پر سے گزر رہی ہو۔

دور، صنوبروں کے برے، ہوٹل کونٹینینٹل کی گیلری میں وہ دو ایک ہیٹ ایک ریک کے سہارے کھڑے رات کا آخری سگریٹ ختم کر رہے تھے۔

''تم اس سے واقعی شادی کر رہے ہو۔ وہ لڑکی جس کے ساتھ ایک ماضی ہے۔'' مسٹر کاظمی نے اپنے سگریٹ کی راکھ جھٹکی۔

ہر مرد کے ساتھ اس کی شادی کے وقت اس کا ماضی نہیں ہوتا کیا؟

''ہوں۔''

''اور اس کا ماضی کیا تھا؟''

''ذوالفقار۔''

'انور اس کا مستقبل ہو سکتا ہے۔''

پھر وہ دو گیلری کی نارنجی روشنی میں سے گزر کر مرمریں پورچ میں اتر گئے۔ جہاں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

رات کے سائے طویل ہو گئے۔

ندی کے اس پار، خوابوں کے ساحل پر ذوالفقار کے بالکل اپالو جیسے ہونٹوں پر

تبسم بکھر گیا۔ ''تمہارے خیال میں یہ ایسی مکمل رات نہیں جس میں خودکشی کر لی جائے؟''

پھر وہ سوتی جاگتی گڑیا اپنے چھوٹے چھوٹے سفید ہاتھوں سے اپنی بچوں کی سی بڑی بڑی آنکھیں ملتے ہوئے جاگی۔ وہ سب سچ نہیں تھا۔ وہ سب سچ نہیں تھا! اس نے چپکے سے اپنے آپ کو بتایا۔ سفید خودرو جنگلی پھول اور سیب کے شگوفے اور شومین کے نغمے۔

جب کہ میں زریں تاج نے اسے ان سب چیزوں کا یقین دلایا تھا۔ جب اپنی اور اس کی سالگرہ کی پارٹیوں پر سچ مچ کے چوکولیٹ کے چھوٹے چھوٹے قلعوں پر شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ جب دسمبر اور جنوری کے برفانی مہینوں میں ابا میاں کے ساتھ ضلعوں کے دور دراز کے گاؤں کے دورے پر جاتے ہوئے رات کے خیموں میں آگ کے قریب بیٹھ کر بڑی بڑی رنگین تصویروں والی ایڈونچرز کی کہانیوں کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ اور باہر ہوا کے سرد جھونکوں کے ساتھ ساتھ آم کے باغوں کے کنارے پر پڑاؤ کے نزدیک ٹھہرے ہوئے عملے اور سامان کی بیل گاڑیوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں۔ جب دور ار ہر کے کھیتوں کی منڈیروں پر اور الاؤ کے گرد آلہا، دول اور برہا کی تانیں بلند ہوتی تھیں۔ اور ہرے سنگھاڑوں اور کنول کے پتوں سے چھپے ہوئے تالابوں کے کنارے کنارے ہاتھیوں رنگ برنگی اور منقش پالکیوں، چوپہلوں اور رتھوں پر انتہائی شوق کے ساتھ سواری کی جاتی تھی۔ جب سکول میں پہلی برفباری کے بعد اسنو مین بنایا جاتا تھا۔ اور رات کو مدرسپیریئر کے کمرے میں آتشدان پر قہوہ اور ٹافی تیار کی جاتی تھی۔ زندگی کا یہ چھوٹا

سا طلسم بالکل ٹھیک تھا اور پریوں کی جرمن کہانیوں کی طرح بالکل سچ۔ اور جرمنی سے تعلق رکھنے والی ہر بات بے حد مزیدار تھی۔ رائن کے نقرئی پانی اور شاہ بلوط کے جنگل اور پھر جرمن نام۔ میونخ، وی آنا، مونارٹ، نیشے، فاؤسٹ کی مارگریٹ، گوئٹے، پھر اقبال۔ اس کے الفاظ کا اتنا زبردست طلسم کہ جی چاہتا تھا بس مر جاؤ۔ مرد قلندر اور شاہین قہستانی اور چراغ لالۂ صحرا اور رومی درازی اور بس جیسے بخارا، سمرقند، الحمرا یا قرطبہ کی قسم کا ایک شہر ہے جس کے چاروں طرف نقرئی صحرا اور سبز نخلستان پھیلے ہوئے ہیں۔ اور فصیل کے اس پار کاروانوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اور دور عظیم الشان مسجدوں کے اونچے اونچے میناروں سے اذان کی لرزہ خیز آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ اور ایسے بازار ہیں جن پر چھتیں پڑی ہیں (جیسے کچھ کچھ بمبئی کا کرافرڈ مارکیٹ یا پشاور کا بازار قصہ خوانی جو نام سے بے حد الف لیلوی لگتا ہے) اور جن کے راستوں میں قالین بچھے ہیں۔ اور بے انتہا تیزی سے دوڑتے ہوئے شاندار عربی گھوڑوں پر سوار مرد مومن سرپٹ چلے آ رہے ہیں۔ (جیسے ٹائرن پاور ''سوئیز'' میں تھا) اور کچھ اس قسم کا رومان جو خالدہ ادیب خانم، جمال الدین افغانی اور نامق کمال کے ناموں سے وابستہ ہے۔ اور نامق کمال کے ڈرامے اور باتصویر ترکی اخباروں کے وہ پلندے جو انقرہ، قسطنطنیہ اور قاہرہ سے آیا کرتے تھے۔

اور پھر گڑیا نے اپنی لمبی لمبی پلکیں پوری طرح ایسے جھپکائیں۔ گویا اب وہ قطعی طور پر مشین گن چلانے جا رہی ہے۔ ''سنا تم نے۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے۔''

''فیصلہ! آپ بھلا کیا فیصلہ کریں گی!'' مجھے بے حد ہنسی آئی۔

اور وہ بہت سخت خفا ہو گئی۔ اور خفا ہوتے وقت وہ محض اتنی بڑی سکول کی لڑکی نظر آئی۔ جس نے ابھی جونیئر کیمبرج نہ کیا ہو۔ نیلے رنگ کا ٹیونک پہنے اور سیدھے طریقے سے بالوں کی دو چوٹیاں ربن سے باندھنے والی باسکٹ بال کھیلنے اور ڈرامے اسٹیج کرنے کی شوقین، جو پہلی بار شا اور ویلز پڑھ کر سخت متحیر اور مرعوب ہو جائے جو زندگی سے خائف ہو۔

''گڑیا آؤ۔ خرگوشوں کو صبح کا ناشتہ کرائیں۔'' میں نے اسے آواز دی۔

''ہنہ۔''

''تو چلو پیانو بجائیں گے۔''

''فون۔''

''اچھا تو لو یہ اپنی ککری بک پڑھو۔''

''فوں۔ فوہ۔''

''دراصل قصہ یہ ہے گڑیا۔ کہ تم کو زندگی سے صلح کر لینی چاہیے۔''

''جی، آپ فراری ہیں بالکل شکست خوردہ ذہنیت ہے آپ کی۔'' اس نے تقریباً چلا کر کہا۔

''واقعہ یہ ہے۔'' میں نے کھنکار کے بڑے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''نادرہ بیگم آپ ابھی سخت امیچیور ہیں۔ اور ہر امیچیور دماغ پر اس عمر میں فلسفے کا دورہ پڑتا ہے۔

بس ایک آدھ سال کی بات اور ہے۔ جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور یہ سب سوچ کر اپنا وقت خراب نہیں کیا کرو گی۔''

وہ اور بھی زیادہ خفا ہو گئی۔

اور پھر مجھے انور کا خیال آیا۔ جو خوابوں کے ساحل کے اسی طرف کھڑا تھا۔ اور خودرو سفید جنگلی پھولوں والے ذوالفقار کا اور فرخندہ آپا اور پٹھو کا۔ اور میں نے اس سے کہا ''گڑیا۔ انور سے سنجیدگی کے ساتھ شادی کر لو۔ ذوالفقار تو تم جانتی ہو کیسا نالائق ہے۔ خرافات ہے بالکل۔ بلکہ اس کو دیکھ کر تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی جانے کیا کر بیٹھے گا۔ الٹا لٹک جائے گا، یا کیا باؤلا سا۔''

اور ذوالفقار مجھے پسند نہیں تھا۔ اس کی موجودگی یقین دلاتی تھی۔ کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور وہ سب کچھ ہے۔ وہ سب کچھ جو آپ سوچ سکتی ہیں۔ بلکہ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ ان سب چیزوں کے متعلق باتیں کر سکتا تھا جن کو آپ بالکل نہیں جانتیں۔ وہ جہاں کہیں بھی موجود ہوتا کمرے میں یا سڑک پر یا ٹینس کورٹ پر ایسا محسوس ہوتا۔ کہ فضا اور ماحول میں اس کی وجہ سے ایک ٹھیک قسم کا ''ٹون'' پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر خیال آتا تھا۔ کہ کمرہ خوب گرم اور روشن ہے۔ اور چاروں طرف ریشمیں کشن بکھرے ہوئے ہیں۔ اور لیمپ کے رنگین شیڈ مدھم مدھم روشنی بکھیر رہے ہیں۔ اور آگ پر قہوے کی بھاپ اٹھ رہی ہے۔ پٹھو اور انور چوکولیٹ کریم ہیرو نہیں تھے۔ ذوالفقار چوکولیٹ کریم ہیرو تھا۔ یعنی وہ کچھ ایسا تھا جیسے موسم گرما کی طویل دوپہر کی حدت۔ جب باغ میں شہد کی رنگین مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اور وہ ایک اونچے سے مرمریں ستون پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اور نادرہ کی زندگی کے سائے اس ستون کے نیچے لرز رہے تھے۔ دیوداسی کے ناچ کی طرح ہمیں چاکولیٹ کریم ہیرو نہیں چاہئیں اور نہ دیوداسی کے ناچ۔ اور اس نے اپنے

تیار کئے نغمے سنائے تھے اور اپنی کتابیں دکھائی تھیں۔ وہ کیا پڑھتی ہے کیا سوچتی ہے کیا کرتی ہے اس کی زندگی ایسی کیوں ہے اور اس کا ماحول اور اس کے عزیز۔ اسے اپنی زندگی سے بہت سی شکائتیں تھیں۔ وہ سکون چاہتی تھی۔ لیکن کیا عجیب دنیا تھی۔ ہر طرف چیخ پکار اور مستقل باتیں۔ خالہ بیگم اور ممی اور ان کی ملنے والیاں سب مل کر ہر وقت باتیں کرتیں۔ نوکر باتیں کرتے۔ پخو اور اس کے دوست شور مچاتے۔ زریں تاج جو دنیا کی ہر چیز میں اپنی ٹانگ اڑانے کی شوقین تھی۔ اور اس کی انتہائی بکواسی سہیلیاں بالکل بے تکی باتوں پر متواتر ہنستی رہتیں۔ یہ سب چیزیں زریں تاج کے نزدیک زندگی کی صحت مندی کی علامت تھیں۔ لیکن اس نے کہا۔ وہ ایسی پہلوانی زندگی نہیں چاہتی وہ خزاں کی چاندنی کی ایسی خاموشی پسند کرتی ہے۔ پھر اس نے کہا۔ ''میرا کالج، جس کے عظیم الشان یونانی ستون اور نیویارک کے اسکائی سکریپر طرز کی طویل عمارتیں دیکھ کر تم کو بالکل پتہ نہیں چلے گا۔ کہ تم ہندوستان میں ہو۔ جہاں تم چاروں طرف امریکن لہجے کی انگریزی سنو گے جس کے مرمریں اور نیلگوں سوئمنگ پول کے کناروں پر تمہیں خیال آئے گا کہ شاید تم کیلیفورنیا کے ساحل پر کھڑے ہو۔ اور زریں تاج، جو تمہارا مذاق اڑائے گی۔ کیونکہ اس کے خیال میں تم بھی بہت امیچو رہو گے۔ وہ کسی چیز کو سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تم کو بتائے گی۔ کہ تم ایک۔ PSEUDO، دنیا میں رہتے ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک ''واقعہ'' کہتی ہے۔ وہ تم کو نہیں سمجھ سکے گی۔ وہ مجھ کو بھی نہیں سمجھ سکتی اور پخو میرا بھائی۔ میں اس کو نہیں جانتی۔ ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں اور اوپر سے ہم کتنا بنتے ہیں۔

یہ سب باتیں اس نے ذوالفقار سے کہی تھیں۔

پھر آندھیوں کا موسم ختم ہو گیا۔ اور پت جھڑ اور خزاں کی خشک ہواؤں کا۔

اور خاموشی سے برف گرنے لگی۔ جیسے کوئی دل ہی دل میں رو رہا ہو۔

اور پنو بنگلو واپس چلا گیا۔ اور میجر انور بھی۔

اور اپنے کمرے کے دریچے میں کچھ نہ کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر ہم سب بیٹھے بیٹھے حلول ہو جائیں برف کی طرح۔ تو افوہ کتنا مزا آئے۔ ہم سب کے سب پنو اور انور اور میں یعنی زریں تاج، اور گڑیا اور فرخندہ آپا جیسے سکول میں دھوپ نکلنے کے بعد اسنو مین پگھل جایا کرتے تھے۔

لیکن کوئی بھی نہیں پگھلا۔ اور فرخندہ آپا اندر آئیں۔ جو نئی حکومت کے کسی نئے محکمے میں ایک نازک سا عہدہ سنبھال کر کہیں جانے والی تھیں۔ اور انہیں دیکھ کر وہ ساری باتیں یاد آ گئیں۔ اسپیشلی رمبا اینڈ ٹینگو اور ان کی ساری پتنگیں۔ ان کی وہ مسوری والی پتنگ کہاں ہے؟'' فرحت نے چپکے سے پوچھا۔

''اور گڑیا کی پہلی والی پتنگ۔ وہ تو اڑ گئی۔'' میں نے بتایا۔

اور فرخندہ آپا نے پوچھا۔ ''زریں تاج! آج کل کیا کر رہی ہو۔''

''فرخندہ آپا! میں نے فی الحال فلسفہ اور روحانیت سے رجوع کیا ہے۔'' میں نے سوچ کر جواب دیا۔

''لیکن یہ پتنگوں وغیرہ کا تذکرہ جو تم کر رہی تھیں؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''جی ہاں۔ فرخندہ آپا۔ یہ جو مختلف انواع و اقسام کی رنگا رنگ پتنگیں آسمان پر اڑتی نظر آتی ہیں۔ بالکل میٹافزیکل پتنگیں، فرخندہ آپا۔''

اور پھر اسی رات ریڈیو پر خبر آئی۔ کہ آئی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ پی ختم۔ بالکل اوس پڑ گئی اب کیا ہو گا فرخندہ آپا۔ یاد آئے وہ دن جب کرسمس کے زمانے میں صاحب لوگ کے انداز میں ترائی کے جنگلوں میں کیمپ لگائے جاتے تھے۔ ایک خیمے میں بابا لوگ کی نرسری، ایک میں نشست، ایک میں طعام، ہاتھی اور شکار ہائے کیا کیا زمانے تھے۔ جو گزر گئے قریب تھا کہ وہ رو پڑیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ کیا کیا بہاریں تھیں۔ جوان آنکھوں نے دیکھ لیں۔ پر آپا اب تو صبر شکر کر کے قناعت سے بیٹھنا ہے۔ میرا جی چاہا کہ اس سانحے کے غم میں خوب اپنی فارسی بولوں۔

لیکن گڑیا خاموشی سے ککری بک پڑھتی رہی۔ اور برف گر رہی تھی اور چوکولیٹ کے گڑیا گھر کے باہر دنیا کا انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ اور وہ کاظمی صاحب نے ڈاکٹر انور کو رائے دی تھی کہ تعلقہ داری ختم کی جا رہی ہے۔ اب نادرہ بیگم سے شادی کرنے کا کیا فائدہ جہیز میں وعدے کے مطابق ماسٹر بیوک نہیں مل سکے گی۔

اور پھر آخری روز ذوالفقار اس کے پاس آیا۔ وہ نئی حکومت کی طرف سے بھیجے جانے والے سفارت خانے کے ساتھ قاہرہ جا رہا تھا۔ اور اس نے افسوس ظاہر کیا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ جیسا کہ پہلے انہوں نے پروگرام بنایا تھا۔ حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ وہ اسے نہیں بھولے گی۔ اور وہ ہمیشہ بہترین دوست رہیں گے۔ اور یہ بھی کہ اس کی بہترین خواہشیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گی۔

اور برف زیادہ تیزی سے پڑنے لگی۔ اور گلابی چونچ والا کاکاتوا سردی کی

شدت کی وجہ سے گڑیا گھر کے دریچے میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اور پھر بہت تیزی سے بارش کا ایک ریلا آیا۔ جیسے ساری دنیا کو بہالے جائے گا۔

اور جب میجر انور نے کار اسٹارٹ کی۔ تو وہ تھک کر پچھلی سیٹ کے کشنوں پر سو چکی تھی۔

اور پھر ایک نہایت، بے انتہا، بہت ہی عجیب بات ہوئی۔ وہ یہ کہ جھکی ہوئی خوبانیوں کے نیچے ایک نیلے پتھر پر بیٹھ کر پنو پھر غور و فکر میں مصروف ہو گیا۔ پنو جو سارے فیشن ایبل مشغلوں میں دلچسپی لیتا۔ ٹھیک قسم کے خیالات سوچتا، سیب کے شگوفوں تلے بسنے والوں کی طرح خوشگوار باتیں کرتا اور ایک دم جانے کیا ہوا۔ کہ قطعی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔

اور ایک بار اس نے ذوالفقار سے پوچھا تھا۔ ''تم یہ سب باتیں کیسے کر لیتے ہو؟'' اور ذوالفقار نے کہا تھا۔ ''بس ایسے ہی، ذرا تفریح آتی ہے۔''

اور پنو کا جی چاہا۔ کہ خوب ''تفریح'' کرے۔ لیکن اب اسے کوئی تفریح موزوں نظر نہیں آئی۔ اور وہ بہت جلد یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ لوگ اتنی آسانی سے خوش کیسے ہو لیتے ہیں۔ پنو جو لکڑی کے رنگین گھوڑوں کی ریس میں ''بکی'' بن کر خوب شور مچاتا تھا اور جس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ زن سے نکل جانے والی ایک سپر قسم کی اسپورٹس کار میں بیٹھ کر بگولے کی طرح اڑتا پھرے۔

اور جب گلابی آنکھوں والے میرے سفید خرگوش اپنا شام کا کھانا ختم کر کے ادھر ادھر جھاڑیوں میں بھاگ گئے۔ تو میں اس کے قریب آئی۔ اور وہ معصومیت اور شرارت کے ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔

اور اس سے قبل کہ میں زریں تاج اسے ایک چھوٹا سا، نفیس سا لیکچر پلاؤں۔ اس نے تقریباً چلا کر کہا۔ ''میں امیچیو رنہیں ہوں۔ میں قطعی امیچیو رنہیں ہوں۔'' اور وہ نیلے پتھر پر سے اٹھ کر باغ کے نشیب کی طرف چلا گیا۔ جہاں سیب کے درخت کے نیچے چھوٹی چھوٹی پریاں رہتی تھیں۔

پھر شدت سے میرا جی چاہا کہ کاش یہاں پر صرف پریاں ہوتیں اور خرگوش اور گلابی چونچ والے کاکاتوے۔

لیکن میں نے دیکھا کہ چاروں طرف دنیا کے راستوں کے کناروں پر صرف چھوٹے چھوٹے انسان بیٹھے سستا رہے تھے اتنے بہت سارے پخو اور انور اور ذوالفقار اور پھر ایسے لوگ جو محض پروفیشنل طور پر انسان بن کر زندہ رہ رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں خیالات، ہمدردیاں، فیصلے، رائیں، جن کی یہ ذرا ذرا سی ٹریجک شخصیتیں اور ہستیاں کائنات کے اس بہت بڑے جھمیلے میں تھوڑی سی بھی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اتنے ڈھیروں کاظمی صاحب اتنی بے شمار فرخندہ آپائیں۔

اور پخو کہہ رہا تھا۔ آدم کے بیٹوں کو کیا ملتا ہے۔ خواہشیں، ان کے بدلے قناعت کی تلقین اور پھر شکر بجالانے کا حکم۔ اور برف بڑی آہستگی سے گر رہی تھی۔ جیسے کوئی چپکے چپکے، دل ہی دل میں روتا ہو۔

پھر برفباری کے بعد پہاڑی نالے کے پرے جیزس اینڈ میریز کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے۔ کہ خداوند ہمارے خدا نے جس نے ہم سے اپنی آسمانی بادشاہت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہمیں برف اور طوفان کی بجلیوں کی آگ اور دنیا کی دوسری مصیبتوں سے بچایا۔ اور میں زریں تاج جو زندگی کے متعلق ایک نہایت بشاش

صحت مند نظریہ رکھتی ہوں۔ میں نے پنو سے کہا۔ ''کیا تم وہ ساری حمدیں بھول گئے۔ جو سینٹ جارجز کے لڑکوں کے ساتھ ماس میں دوزانو جھک کر گایا کرتے تھے۔ اور مولی صاحب کا وہ ڈنڈا۔ اوراھد نا الصراط المستقیم۔ صراط المستقیم پر چلو میرے بھائی۔''

اور پھر ایسا ہوا۔ کہ یکا یک پنو نے دوبارہ صراط المستقیم پر چلنا شروع کیا۔ اسے ہر چیز میں ''تفریح'' آنے لگی۔ وہ اپنا طیارہ بعض مرتبہ اس قدر اونچا لے گیا۔ کہ مرتے مرتے بچا۔ وہ رات رات بھر بال روم میں رقص کرتا رہا۔ ''اسپیشلی رمبا اینڈ ٹینگو۔'' اس نے فرخندہ آپا سے شادی کر لی اور چار مہینے بعد انہیں طلاق دے دی۔ اس کی نیلی اسپورٹس کار ہر وقت سڑک پر رہنے لگی۔

دیوداروں کے پرے ہوٹل کونٹینینٹل میں شومین کا ''کارنیول'' پہلے سے زیادہ تیزی سے بجتا رہا۔

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!

جولائی ۲۴ء کی ایک ابر آلود سہ پہر جب وادیوں اور مکانوں کی سرخ چھتوں پر گہرا نیلا کہرا چھایا ہوا تھا اور پہاڑ کی چوٹیوں پر تیرتے ہوئے بادل برآمدوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔ سوائے کے ایک لاؤنج میں، تاش کھیلنے والوں کے مجمع سے ذرا پرے ایک میز کے گرد وہ پانچوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ پانچوں۔ ان پورنا پربھاکر، ناہید انور امام، راجکمار آسمان پور، لفٹننٹ کرنل دستور رستم جہانگیر اور ڈوئن کارلو۔ اگر اس وقت ڈاون لکر، کا کوئی ذہین اور مستعد رپورٹر اپنے کالموں میں ان کا مفصل تذکرہ کرتا تو وہ کچھ اس طرح ہوتا: ..... ''ان پورنا پربھاکر، برجیشور راؤ پربھاکر، ارجن گڑھ کے فنانس منسٹر کی دل کش بیوی گہرے سبز رنگ کے میسور جارجٹ کی ساری میں ملبوس تھیں جو ان کی سبز آنکھوں کے ساتھ خوب 'جا'' رہی تھی۔ ان کی کشمیری کام کا اوور کوٹ سفید رنگ کا تھا جو انہوں نے اپنے شانوں پر ڈال رکھا تھا۔ ان کے خوبصورت کانوں میں کندن کے مگر جھلکورے کھا رہے تھے۔ جن کی وجہ سے ان کی چمپئی رنگت دمک رہی تھی۔ ناہید انور امام گہرے نارنجی بڑے پائنچوں کے پاجامے اور طلائی کارچوب کی سیاہ شال میں ہمیشہ کی طرح بے حد اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ راجکمار روی شنکر سیاہ شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامے ..... میں معلوم ہوتا تھا کہیں ڈنر میں جانے کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں۔ کرنل جہانگیر براؤن رنگ کی شیپ اسکن جیکٹ میں ملبوس بے فکری سے

سگار کا دھواں اڑاتے غیر معمولی طور پر وجیہہ اور شاندار نظر آتے تھے۔ مس انور امام کا بے حد مختصر اور انتہائی خوش اخلاق سفید کتا بھی بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔''

برابر کی میزوں پر زور و شور سے برج ہو رہا تھا۔ اور ان پانچوں کے سامنے رکھا ہوا قہوہ ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ غالباً ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ تین دن سے برابر بارش ہو رہی تھی۔ نہ کہیں باہر جایا جا سکتا تھا۔ نہ کسی ان ڈور قسم کے مشغلے یا موسیقی میں جی لگتا تھا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ سیزن حد سے زیادہ ڈل ہوتا جا رہا ہے۔ جنگ کی وجہ سے زمک بند کر دیا گیا تھا۔ اور اس میں فوجیوں کے لئے کینٹین بن گئی تھی۔ سڑکیوں پر، ہوٹلوں اور دوکانوں میں، ہر جگہ ہر تیسرا آدمی وردی میں ملبوس نظر آتا تھا۔ اپنے ساتھیوں میں سے بہت سے واپس جا چکے تھے۔ جنوبی ہند اور یو۔ پی۔ والے جون ہی سے اترنے لگے تھے۔ دلی اور پنجاب کے لوگوں نے اب آنا شروع کیا تھا۔

ان پورنا پر بھاکر دل ہی دل میں اس دھن کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو اس نے پچھلی شام نی نی سے پیانو پر سنی تھی۔ ناہید انور امام کرسی کے کشن سے سر ٹیکے کھڑکی سے باہر نیچے کی طرف دیکھ رہی تھی، جہاں کورٹ یارڈ کے پختہ فرش پر اکا دکا آدمی آ جا رہے تھے۔ دونوں طرف کے ونگز کے برآمدوں میں بیرے کشتیاں اٹھائے سائے کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کرنل جہانگیر جو ایران، مصر، انگلستان اور جانے کہاں کہاں گھوم کر اسی مہینے ہندوستان واپس لوٹے تھے۔ پچھلے پندرہ دن میں اپنی سیروں کے سارے قصے سنا کر ختم کر چکے تھے اور اب مکمل قناعت، اطمینان اور سکون کے ساتھ بیٹھے سگار کا دھواں اڑا رہے تھے۔ راجکمار

روی کو اجمیر والے عظیم پریم راگی کی قوالی اور اور فرانسیسی شرابوں کا شوق تھا۔ فی الحال دونوں چیزیں وہاں دستیاب نہ ہو سکتی تھیں اس لئے انہیں اس وقت خیال آ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی راجکماری اندرا ہی سے صلح کر لیتے تو برا نہ تھا۔ لیکن وہ محض ایک اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ اور راجکماری راجپوتانہ کی ان سے دس گنی بڑی ریاست کی لڑکی تھی۔ اور ان سے قطعی مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ اور سال بھر اپنے میکے میں رہتی تھی۔ برجیشور راؤ پر بھا کر اسی وقت چہل قدمی کر کے واپس آیا تھا اور لاؤنج کے نصف دائرے کے دوسرے سرے پر اپنے چند دوستوں کے ساتھ گولف اور اسٹاک ایکسچینج پر تبادلۂ خیالات میں مصروف تھا۔ قریب کی ایک میز پر انعام محمود سپرنٹنڈنٹ پولیس جو عنقریب ڈی۔ آئی۔ جی ہونے والے تھے۔ برج کھیلتے کھیلتے سوچ رہے تھے کہ اگر وہ سیاہ آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والی پرتگالی لڑکی نی نی جس نے کل رات پیانو بجایا تھا۔ کم از کم آج ہی کی سرد اور غیر دلچسپ شام ان سے ملاقات کر سکتی تو بہت غنیمت تھا۔ اس سلسلے میں مزید ڈپلومیٹک گفتگو کی غرض سے راجکمار روی کی کرسی کی طرف جھک کر انہوں نے آہستہ سے کچھ کہا۔ راجکمار روی نے بے تعلقی سے سر ہلایا۔ گویا بھئی ہم سادھو سنت آدمی ہیں موہ مایا کے اس چکر سے کیا۔

کرنل جہانگیر نے سگار کی راکھ جھٹک کر ذرا بلند آواز سے پکارا۔

''..... برجیش ..... چلو کم از کم بلیر ڈ ہی کھیلیں۔''

''روی کو لے جاؤ..... ہم بے حد ضروری مسائل حل کر رہے ہیں۔'' برجیش نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا اور پھر اپنی باتوں میں اس انہماک سے مصروف ہو

گیا۔ گویا اگر اس نے دوسری طرف ذرا سی بھی توجہ کی تو ٹاٹا اور سپلا کے شیرز کی قیمتیں فوراً گر جائیں گی۔

''ان پورنا رانی، دیکھو تو تمہارا شوہر کس قدر زبردست، بوریت، کا ثبوت دے رہا ہے۔'' کرنل جہانگیر نے بے حد اکتا کر شکایت کی۔

''بھئی اللہ..... برجیش گڈ وہی اتنا بور۔ جایئے آپ لوگ جا کر کھیلیے۔ ہم تو اب بیگم ارجمند کے ساتھ چائے پینے جا رہے ہیں۔'' ناہید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ناہید بیگم تمہیں کنور رانی صاحبہ سے جو تازہ ترین خبریں معلوم ہوں۔ ہمیں رات کے کھانے پر ضرور بتانا۔'' راجکمار روی بھی اٹھتے ہوئے بولے۔

''قطعی۔'' ناہید اپنی نقرئی آواز میں تھوڑا سا ہنسی۔ پھر وہ دونوں اپنے اوور کوٹ اور شال سنبھالتی وسط کے ہال کے بڑے زینے کی طرف چلی گئیں۔

''..... نی نی..... نی نی..... کیا نام ہے واللہ! گویا جلترنگ بج رہی ہے۔'' انعام محمود نے چند لحظوں تک ڈون کارلو کو کرسی پر سے اتر کے اپنے چھوٹے چھوٹے سفید قدموں سے اپنی مالکہ کے پیچھے پیچھے بھاگتا دیکھتے رہنے کے بعد اب ذرا اونچی آواز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''بہت تیز ہوتے جا رہے ہو بھائی جان۔ ذرا نیچے سے آنے دو اپنی بیگم کو۔ کان کھنچوائے جائیں گے تمہارے۔'' کرنل جہانگیر نے ڈانٹ پلائی۔

''خواتین کہاں گئی ہیں؟'' انعام محمود نے پوچھا۔

''بیگم ارجمند کے کمروں کی طرف۔''

''رانی بلبیر سنگھ بھی ہوں گی وہاں؟''

''یقیناً۔''

''نفرت ہے مجھے اس بڑھیا سے۔'' انعام محمود پھر تاش کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شام کی چار کے بعد سب پھر لاؤنج میں جمع ہوئے اور سوچا جانے لگا۔ کہ اب کیا کیا جائے۔

'' کاش خورشید ہی آ جاتا۔'' راجمار روی نے خواہش ظاہر کی۔

''خورشید..... واقعی..... جانے آج کل کہاں ہوگا۔'' کرنل جہانگیر نے کہا۔ اور پھر سب مل کر بے حد دلچسپی سے کسی ایسے شخص کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ جسے خواتین بالکل نہیں جانتی تھیں۔ اکتا کر ناہید نے مسوری ٹائمز کا تازہ پرچہ اٹھا لیا اور اس کے ورق پلٹنے لگے۔

سب ذلیل فلم دکھائے جا رہے ہیں۔ روبرٹ ٹیلر۔ اس سسی سے مجھے نفرت ہے۔ ڈورتھی لیمور میرے اعصاب پر آ جاتی ہے۔ کیتھرین ہپ برن روز بروز زیادہ بدشکل ہوتی جا رہی ہے۔ ہیک مینز میں کسی روسی نام کا کیپرے ہو رہا ہے۔ وہ بھی سخت خرافات ہوگا۔'' راجکمار روی نے ناہید کی کرسی کے پیچھے سے پرچے کے صفحات پر جھانکتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا بہترین پروگرام یہی ہے کہ شریفوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر قہوہ پیا جائے۔''

.....''اور ان پورنا رانی سے پیانو سنا جائے۔'' کرنل جہانگیر نے جلدی سے صاحبزادہ ارجمند کی تجویز میں اضافہ کر دیا۔ سب ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کر

کے ان پورنا کو دیکھنے لگے جو اپنی شیریں ترین مسکراہٹ بکھیرتی اسی وقت بیگم ارجمند کے ساتھ ان کی میز کی طرف آئی تھی۔

وہ سب لاؤنج سے نکل کر نشست کے بڑے کمرے میں آ گئے۔

''اب ان پورنا رانی کو پکڑو۔'' کسی نے برابر کے کمرے میں زینے پر سے اترتے ہوئے آواز دی۔

''جادو جگاتی ہے اپنی انگلیوں سے لڑکی۔'' کنور رانی بلبیر سنگھ نے ڈیپلکس سونگھتے ہوئے اپنی بزرگانہ بلندی پر سے ان پورنا کی تعریف کی اور پھر رومال میں ناک ٹھونس کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''ناہید بیٹا، تمہیں شاید زکام ہو گیا ہو گا؟'' ان پورنا جب پیانو پر سے اٹھ آئی تو صاحبزادہ ارجمند نے ناہید کو مخاطب کیا۔

''ارے نہیں رجو بھیا..... کیا گائیں ہم؟'' ناہید نے ہنستے ہوئے چاروں طرف نظر ڈال کر دریافت کیا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

جب ناہید اپنی نقرئی آواز میں ''نندیا لاگی میں سوئے گئی گوئیاں۔'' الاپ رہی تھی۔ اس وقت ان پورنا کو اپنی نٹنگ سنبھالتے ہوئے دفعتہً خیال آیا۔ زندگی کم از کم اتنی ناگوار نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے پرخطر طوفانوں اور تند رو آندھیوں سے محفوظ ایک چھوٹے سے گرم اور روشن کمرے میں آگ کے سامنے بیٹھے چوکولیٹ پیتے پیتے ہی عمر بیتی جا رہی ہے۔ کیا بچپنا ہے۔ اسے اپنے اس تخیل پر ہنسی آ گئی۔ تان پورے کے تار اور پیانو کے پردے چھیڑتے ہوئے

اسے ہمیشہ چاندنی رات اور کنول کے پھولوں کا خیال آ جاتا تھا۔ اور اس سمے ہوٹل کی نچلی منزل کے چاروں طرف کیاریوں میں لہلہاتے سفید پھول جولائی کی بارش میں نکھر رہے تھے۔ چاند کبھی کبھی بادلوں میں سے نکل کر دریچے میں جھانک لیتا تھا۔ اور پھر چھپ جاتا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے فضاؤں سے پگھلی ہوئی موسیقی برس رہی ہے۔

..... سچ مچ موسیقی کے بغیر اس روکھی پھیکی اجاڑ زندگی میں کیا رہ جاتا۔ درگاہ اور پوروی اور ماروا اور بہار۔ کیسی نکسی چاندنی اور پل نہ لاگیں موری انکھیاں..... اور تان پورے کے چاروں تاروں کی گمبھیر گونج میں جیسے ہستی کی ساری تڑپ، سارا درد سمٹ آتا ہے۔ اور گھنگھروؤں کی جھنکار میں، اور مانی پوری کی لچک، بھارتیہ ناتیم کی گونج اور گرج، اور کتھک کی چوٹ اور دھمک میں..... اور جب بھیگی رات کے گہرے سناٹے میں کہیں اور گتار بجتا ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ ان پورنا نے سوچا۔ اس خوبصورت آرام دہ دنیا میں جو لوگ دکھی ہیں انہیں سب کو رات کے کھانے کے بعد ''نیند لاگی میں سوئے گئی گوئیاں'' الاپنا چاہئے۔

ان پورنا نے نٹنگ کرتے کرتے کشن پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ناہید کا یہ گیت بہت پسند تھا۔ جو وہ اس وقت گا رہی تھی۔ اسے ناہید کے وہ سارے پوربی گیت پسند تھے جو اس نے اکثر سنائے تھے۔ آہ..... موسیقی..... موسیقی..... برجیش اکثر مذاقاً کہا کرتا تھا کہ جس طرح قصے کہانیوں کی پریوں اور شہزادیوں کی جان کسی بینگن، سرخ مرچ یا طوطے میں بند ہوتی ہے۔ اسی طرح ان پورنا کی جان اس کے تان پورے میں بند ہے۔ جب وہ پیانو بجاتی تھی تو برجیش اپنے کمرے کا

دروازہ اندر سے بند کر کے کلکتے کے کلایو اسٹریٹ کی خبریں پڑھتا تھا یا آرام سے کرسی پر لیٹے لیٹے سو جاتا تھا اور ناہید خوفزدہ ہو کر کہتی ہائے اللہ کیسا ٹپکل قسم کا شوہر ہے!.....لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ برجیش نے ان پورنا کو چھ سات سال قبل پہلی بار مہابلیشور میں دیکھا تھا۔ اور اس کے صرف ایک ماہ بعد ہی ان پورنا کو اپنے نام کے آگے سے شیرالے ہٹا دینا پڑا تھا۔ وہ دونوں سال کا زیادہ حصہ ریاست کے صدر مقام پر راجپوتانہ میں گزارتے تھے۔ جاڑوں میں کبھی کبھی اپنے عزیزوں سے ملنے پونا یا بمبئی چلے جاتے۔ اور گرمیوں میں شمالی ہند کے پہاڑوں پر آ جاتے۔ اب کی مرتبہ انہوں نے طے کیا تھا کہ اگلے سال وہ دونوں کشمیر جائیں گے جو ان پورنا نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے نینی تال کی جھیل میں رقصاں روشنیاں پسند تھیں اور مسوری کی بے پناہ رنگینیاں اور چہل پہل۔ شملہ بہت غیر دلچسپ اور بہت سرکاری تھا۔ زیادہ سے زیادہ تفریح کر لی جا کر بے وقوفوں کی طرح ''اسکینڈل پوائنٹ'' بیٹھ گئے یا ڈے وی کو چلے گئے۔ ان پورنا کو مسوری پسند تھی۔ اور اپنا شوہر۔ اور اپنے دونوں بچے اور اپنے مخلص اور دلچسپ دوستوں کا حلقہ جو ہر سال وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ اسے اس صوبے کی سب چیزیں بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ یہاں کے لوگوں کا کلچر۔ ان کا باتیں کرنے کا خوبصورت انداز۔ ان کے شاندار اور تصویروں ایسے لباس۔ ان کے رنگ برنگے غرارے اور سیاہ شیروانیاں۔ ان کے مشاعرے۔ ان کی کلاسیکل موسیقی کا اعلیٰ معیار۔ جب موسم بہت غیر دلچسپ ہو جاتا یا بارش کی وجہ سے وہ ناہید کے گھر تک نہ جا سکتی تو اپنے کمرے میں بچوں کے لئے ٹنک کرتی، یا برآمدے

میں بیٹھ کر اپنی ہمسایہ بیگم ارجمند سے باتیں کرتی۔ اس کے دونوں بچے پچھلے سال سے کین ویل ہاؤس میں پڑھ رہے تھے۔ بڑا لڑکا بالکل رجیش جیسا تھا۔ سنجیدہ، کم سخن، لیکن اپنی بات منوانے والا۔ بچی ان پورنا کی طرح تھی۔ شیریں تبسم۔ اور سبز آنکھوں والی۔ چار سال کی عمر میں کتھک ناچ ایسا ناچتی تھی کہ بس دیکھا کیجئے۔ یہ ان پورنا کا محبوب مشغلہ تھا کہ آرام کرسی پر لیٹ کر میرا کی آئندہ زندگی کے لئے پروگرام بنائے۔ اور اس نے سوچا تھا کہ اگلے سال وہ اسے شمبھو مہاراج کے پاس لکھنؤ لے جائے گی۔

ناہید اپنا گیت ختم کر چکی تھی اور خوب زور زور سے تالیاں بجائی جا رہی تھیں۔ باہر بارش تھم گئی تھی۔ اور رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

ڈنر کے بعد سب پھر وہاں جمع ہو گئے اور وہ کمرہ باتوں اور قہقہوں کے شور سے جاگ اٹھا۔ سب دیواروں کے قریب بکھرے ہوئے صوفوں پر بیٹھ کر قہوہ، سگریٹ، پائپ اور دوسری اپنی اپنی پسند کی چیزیں پینے میں مصروف ہو گئے۔ مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ جنگ کی صورت حال، سوسائٹی کے تازہ ترین اسکینڈلز، ٹینس اور کرکٹ کے متعلق پیشین گوئیاں..... بھتنے، روحیں، قسمت کی لکیریں۔

''بھئی ہم کو تو اب نیند آ رہی ہے۔ ہم جاتے ہیں۔ شب بخیر۔'' برجیش اپنی چائے کی پیالی ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو ابھی۔ کیا بدمذاقی ہے۔'' کرنل جہانگیر نے ڈانٹا۔

''بچاری ان پورنا..... ہائے ہائے..... ایسی شاعرانہ، آرٹسٹک مزاج کی

لڑکی۔ اور کیسے روکھے پھیکے آدمی سے پالا پڑا ہے۔'' بیگم ارجمند نے ذرا دور دریچے کے نزدیک رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''آہ۔ یہ ہمارے ہندوستان کی بے جوڑ شادیاں۔'' کنور رانی بلبیر سنگھ نے ناک پر سے رومال ہٹا کر سماج کی دگرگوں حالت پر ایک مختصر سی آہ بھری اور پھر ڈیپکس سونگھنے لگیں۔ بیگم ارجمند اور کنور رانی بلبیر سنگھ سارے دن اپنے ونگ میں اپنے کمروں کے آگے برآمدے میں بیٹھی بیٹھی مسوری بھر کے اسکینڈلز ڈائریکٹ کرتی رہتیں۔ سوائے کی دوسرے منزل سے دنیا کا اک جنرل طائرانہ جائزہ لے واقعات عالم پر تبصرہ اور آخری فیصلہ صادر کیا جاتا تھا۔ رفعت آرا اپنے بہنوئی سے شادی کرنے والی ہے۔ آمنہ طلاق لے رہی ہے۔ نسیم نے ہندو سے شادی کر لی۔ میجر ارشاد تیسری بار عشق میں مبتلا ہو گیا ہے یہ ناہید جو مستقل بیمار رہنے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے قطعی اس کنگ جارج میڈیکل کالج والے خوبصورت ڈاکٹر سے عشق ہو گیا ہے۔ جو بیگم حمید اللہ کا بھانجا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دوستوں نے بیگم ارجمند کے برآمدے کا نام ''اوبزرویشن پوسٹ نمبر ون'' رکھ چھوڑا تھا ''اوبزرویشن پوسٹ نمبر ٹو'' ہیک مینز کی پچھلی گیلری تھی۔

اور پھر دفعتہً اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر سب کرنل جہانگیر کی طرف بے حد دلچسپی سے متوجہ ہو گئے۔ جو تھوڑے دیر سے نی نی کا ہاتھ دیکھنے میں مشغول تھے۔ نی نی گوا کے پرتگالی حاکم اعلیٰ کی زرد رو سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی تھی۔ جو چند روز قبل اپنے والدین کے ہمراہ بمبئی سے آئی تھی اور آتے ہی اپنے اخلاق اور اپنی موسیقی کی وجہ سے بے حد ہر دلعزیز ہو گئی تھی۔ سب اپنے اپنے ہاتھ دکھانے

لگے۔ بھوتوں اور روحوں کے قصے چھڑ گئے باتوں باتوں میں کرنل جہانگیر نے دعویٰ کیا کہ وہ اسی وقت جس کی چاہو روح بلا دیں گے۔

اور پھر سب کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ آ گیا۔ اب موسم کے 'ڈل' ہونے کی شکایت نہ کی جاتی۔ جب بارش ہو رہی ہوتی یا برج میں جی نہ لگتا تو سب کرنل جہانگیر کے سٹنگ روم میں جمع ہو جاتے۔ برج کی میز پر انگریزی کے حروف تہجی الگ الگ کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ کر ایک دائرے میں پھیلا دیئے جاتے۔ بیچ میں ایک گلاس الٹا الٹا رکھ دیا جاتا۔ سب چاروں طرف چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ گلاس پر دو انگلیاں ٹکا دی جاتیں اور پھر وہ گلاس خود بخود اچھلتا ہوا مختلف حروف پر جا رکتا اور ان حروف کو جمع کر کے روحوں کا پیغام حاصل کیا جاتا۔ اس میں بڑے مزے کے لطیفے ہوتے۔ بعض دفعہ غلط روحیں آ جاتیں۔ جاتے وقت روح سے درخواست کی جاتی کہ اب فلاں کو بھیج دیجئے گا۔ جین ہارلو اور لیزلی ہاورڈ کو کئی بار بلایا گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے آ کر ایک مرتبہ بتایا کہ اگلے دو تین سال کے اندر اندر ان کا بیٹا ہندوستان کا حاکم اعلیٰ بن جائے گا۔ روحوں کی پیشین گوئیاں بعض دفعہ بالکل صحیح نکلتیں۔ ان سے سیاسیات پر کم شادی اور رومان پر زیادہ سوال کیے جاتے۔ لڑکیاں خوب خوب جھینپتیں۔ بہت دلچسپی سے وقت گذرتا۔ کرنل جہانگیر انتالیس چالیس کے رہے ہوں گے۔ لیکن اب تک کنوارے تھے اور مسئلہ تناسخ کے بے حد قائل۔ انہیں دنیا میں صرف تین چیزوں سے دلچسپی تھی۔ باغبانی، روحانیات اور نرگس۔ پونا میں ان کی ایک بھتیجی تھی۔ جسے وہ چاہتے تھے۔ اور اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اور بیگم ارجمند نے یہ طے کیا تھا کہ یہ نرگس ان کی بھتیجی

وتیجی قطعی نہیں ہے۔

وہ خواتین کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ انہوں نے ژند اوستا اور ایران کے صوفی شعراء اور جرمن فلسفیوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کئی سال یورپ میں گزارے تھے، پیرس میں روحوں کے Seances میں شامل رہ چکے تھے۔ اور سب ملا کر بے حد دلچسپ شخص تھے۔

ایک روز ڈنر کے بعد سب لوگ حسب معمول پھر نشست کے کمرے میں آ گئے ان پورنا نٹنک میں مشغول تھی۔ انعام محمود نی نی کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ ناہید ڈون کارلو سے سو جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ آنکھیں پھیلائے بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ برجیش ایک کونے میں ایک آئی سی ایس صاحب بہادر سے ہندوستانی ریاستوں کی سیاست پر الجھ رہا تھا۔ پیانو کے قریب ایک اسٹول پر رانی کرم پور تلاری کا منظور نظر مظہر الدین بیٹھا پائپ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ مظہر الدین بہتر سے بہتر سوٹ پہنتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹلوں میں ٹھہرتا۔ پونٹیک سے کم بات نہ کرتا۔ اور سب جانتے تھے کہ یہ ٹھاٹھ کس طرح ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے اتنا بے تحاشا روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ اس کی شکل اچھی خاصی تھی۔ ذہن کے معاملہ میں یونہی، لیکن بات کرنے میں بہت تیز۔ پہلے وہ ادھیڑ عمر کی بیگم فرقان الدولہ کا منظور نظر تھا۔ اب کچھ عرصے سے رانی کرم پور تلاری کے ساتھ دکھائی دیتا تھا۔

بیگم ارجمند اور ان پورنا وغیرہ اس سے بہت کم باتیں کرتی تھیں۔ لیکن ان کے شوہروں کی سوسائٹی میں وہ کافی مقبول تھا۔ پائپ کی راکھ جھٹک کر اس نے ان

پورنا سے پوچھا۔ ''مسز پربھاکر آپ کو مسئلہ تناسخ سے دلچسپی ہے؟''

''میں نے کبھی اس طرف خیال نہیں کیا۔ کیوں، کیا آپ کو بھی روحانیت سے شغف پیدا ہو گیا؟'' ان پورنا کو بادل ناخواستہ لیکن اخلاقاً کیونکہ وہ مظہر الدین کے قریب بیٹھی تھی۔ اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑا۔

''کرنل جہانگیر تو لگتا ہے اس مرتبہ ہم سب کو بالکل سنیاسی بنا کر چھوڑیں گے۔ آج کل جسے دیکھئے اپنی اپنی شکار اور اساک ایکسچینج کی باتیں چھوڑ کر روحوں سے الجھ رہا ہے۔'' مظہر الدین نے کہا۔

کرنل جہانگیر نے اس کی بات سن لی۔ وہ بولے۔ ''ان پورنا کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن ہم سب اس مایا جال کو تج کر جٹائیں بڑھائے دوتارہ بجاتے سامنے ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں کی طرف رخ کرتے نظر آئیں۔''

''اگر میری بیوی بھی اپنا تان پورہ اٹھا کر بنوں کو نکل گئی تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا کرنل۔'' برجیش نے اپنے مخصوص انتہائی غیر دلچسپ طریقے سے کہا۔

''چپ رہو یار۔ تم اپنے بازار کے بھاؤ اور گولف سے الجھتے رہو۔ یہ مسائل تصوف ہیں بھائی جان۔'' صاحبزادہ ارجمند نے ڈانٹ بتائی۔ برجیش ایک خشک سی ہنسی ہنسا اور پھر نہایت مستعدی سے ان صاحب بہادر کو ارجن گڑھ اسٹیٹ کی پالیسی سمجھانے میں مصروف ہو گیا جو غالباً اگلے مہینے سے وہاں کے ریذیڈنٹ بننے والے تھے۔

پھر قہوہ کے دور کے ساتھ زور شور سے کرما اور آواگون کی بحث چھڑ گئی۔ کرنل جہانگیر کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ مثلاً اس وقت انھوں نے ناہید سے کہا

کہ پچھلے جنم میں وہ پرتھوی راج تھے اور ناہید ان کی کوئی بہت قریبی عزیز تھی۔

''غالباً سنجوگتا؟'' کسی نے پوچھا۔ سب ہنسنے لگے۔ پھر مزے مزے کی قیاس آرائیاں شروع ہوئیں۔ کون کون پچھلے جنم میں کیا کیا رہا ہوگا۔

''کرنل پچھلے جنم میں ناہید کی شادی کس سے ہوئی تھی؟'' بیگم ارجمند نے انتہائی دلچسپی سے اپنی سیاہ آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''کوئی جون پور کا کن کٹا قاضی رہا ہوگا۔'' راجکمار روی بولے۔ بڑا زبردست قہقہہ پڑا۔ ناہید کی نسبت پچھلی کرسمس میں کسی پولیس افسر سے ہوئی تھی۔ اور سب دوستوں نے مل کر اسے مبارکباد کا تار بھیجا تھا..... جس میں صرف یہ جملہ تھا۔

''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔''

کرنل جہانگیر ان پورنا کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے۔

اور پھر یک لخت کرنل جہانگیر نے بے حد سنجیدہ لہجہ میں اور بڑی مدھم آواز سے آہستہ آہستہ کہا۔..... ''ان پورنا تمہیں یاد آتا ہے۔ کسی نے تم سے کبھی کہا تھا..... جب چاندنی راتوں میں کنول کے پھول نکھرتے ہوں گے۔ اور بہار کی آمد کے ساتھ ساتھ ہمالیہ کی برف پگھل کر گنگا کے پانیوں میں مل رہی ہوگی۔ اس وقت میں تم سے دوبارہ ملوں گا۔ یاد ہے؟''

ان پورنا حیرت زدہ سی اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکاتی کرنل کو دیکھنے لگی۔ کمرے میں دفعتہً بڑا احساس سکوت طاری ہوگیا۔

کرنل نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ کشن پر رکھ کر پھر کہنا شروع کیا۔ ''یاد کرو..... اس کا نام کمل اندر تھا۔ پچھلے جنم میں تم اس کی رانی تھیں۔ چاندنی راتوں میں اپنے

راج محل کی سیڑھیوں پر جو گنگا میں اترتی تھیں۔ وہ دینا بجاتا تھا اور تم سنتی تھیں۔ تم ناچتی تھیں اور وہ دیکھتا تھا۔ پھر تمہاری شادی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ہی وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔ اور تمہاری قسمت کی لکیریں کہتی ہیں کہ تم اس جنم میں اس سے ضرور ملو گی۔ ایسا ضرور ہو گا۔ ستارے یہی چاہتے ہیں۔ کرنل رک کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔ سب بت بنے اس کی آواز سن رہے تھے، جو لگ رہا تھا، رات کے اس سناٹے میں کہیں بہت دور سے آ رہی ہے ان پورنا اسی طرح پلکیں جھپکاتی رہی۔ بیگم ارجمند کی آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں۔

''.....اوہ کرنل ہاؤ فنٹاسٹک.....'' ناہید نے چند لمحوں کے بعد اس خاموشی کو توڑا پھر رفتہ رفتہ قہقہے اور باتیں شروع ہو گئیں۔ کرنل کی پیشین گوئی سب کے خیال میں متفقہ طور پر شام کا بہترین لطیفہ تھا۔

برجیش نے آئی۔ سی۔ ایس صاحب بہادر سے گفتگو ختم کرنے کے بعد اپنے کونے سے ان پورنا کو آواز دی۔ ''چلو بھئی اب چلیں سخت نیند آ رہی ہے۔'' پھر سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد نشست کا کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔

اور سب سے آخر میں، ان سب باتوں پر اچھی طرح غور و خوض کرتا ہوا ڈون کارلو اپنی کرسی پر سے نیچے کودا اور ایک طویل مطمئن انگڑائی لینے کے بعد چھوٹے چھوٹے قدموں سے باہر کے زینے کی سیڑھیاں پھلانگتا نیچے کورٹ یارڈ میں پہنچ گیا۔ جہاں اپنے گھر جانے کے لئے ناہید رکشا میں سوار ہو رہی تھی۔

موسم روز بروز زیادہ غیر دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ مرد دن بھر لاؤنج میں برج

کھیلتے۔ ان پورنا بچوں کو لے کر ٹہلنے چلی جاتی۔ یا اپنے سٹنگ روم میں میرا کو طبلے کے ساتھ کتھک کے قدم رکھنا سکھاتی رہتی۔ جب وہ تان پورے کے تار چھیڑتی تو دفعتہً اسے محسوس ہوتا کوئی اس سے کہہ رہا ہے میں تم سے دوبارہ ملوں گا۔ میں تم سے دوبارہ ملوں گا..... ستارے یہی چاہتے ہیں..... ستارے یہی..... کیا حماقت ..... گدھے پن کی حد ہے اسے غصہ آ جاتا۔ پھر ہنسی آتی۔ اس قسم کے باولے پن کی باتوں کا وہ خود مذاق اڑایا کرتی تھی۔..... ان پورنا..... ان پورنا..... اتنی موربڈ ہوتی جا رہی ہے۔ ان پورنا جس کے شیریں قہقہے سوسائٹی کی جان تھے۔

''کرنل کم از کم روحیں ہی بلا دو۔ بہت دنوں سے مہاراجہ اشوک سے گپ نہیں کی۔'' ناہید نے بے حد اکتا کر ایک روز کرنل جہانگیر سے کہا۔ وہ سب ''اونٹ کی پیٹھ'' سے واپس آ رہے تھے۔

''خدا کے لئے اب یہ حماقت کا بکھیڑا نہ پھیلانا۔ میرے اعصاب پر آ جاتی ہیں تمہاری یہ روحوں سے ملاقاتیں۔'' بیگم ارجمند نے ڈانٹا۔

''کرنل واقعی تم کمال کے آدمی ہو۔ اچھا میرے ہاتھ کے امپریشن کا تم نے مطالعہ نہیں کیا؟'' ناہید نے بیگم ارجمند کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''..... ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس.....'' کرنل نے کچھ سوچتے ہوئے بڑی رنجیدہ آواز میں کہا اور چپ ہو گئے۔

''کیوں کرنل تمہیں کیا دکھ ہے؟'' ناہید نے 'تمہیں' پر زور ڈال کر پوچھا۔

''دکھ.....؟! شش۔ شش۔ بچے دکھوں کی باتیں نہیں کیا کرتے۔'' وہ لائبریری کی سڑک پر سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔

اس روز کنور رانی بلبیر سنگھ نے اپنی ''اوبزرویشن پوسٹ نمبر ون'' پر سے پیشین گوئی کی..... ''دیکھ لیا..... ان پورنا اس مرتبہ ضرور کوئی نہ کوئی آفت بلائے گی۔ یہ اس دل چلے کرنل نے ایسا شگوفہ چھوڑا ہے..... اور برجیش کیسا بے تعلق رہتا ہے۔ اور یہ ہندوستانی ریاستوں کے حکام..... تم نہیں جانتیں مائی ڈیر..... ان لوگوں کی زندگیاں ہوتی ہیں کیا۔ 'مورلز' ہوتے ہیں..... جبھی تو دیکھو برجیش! اس کم عمری میں اتنی جلدی فنانس منسٹر کے عہدے پر پہنچ گیا۔''

''دنیا نہ جانے کدھر جا رہی ہے۔'' بیگم ارجمند نے ان کے خیال کی تائید کی۔

اور پھر آخر ایک روز راجکمار روی نے چائے کے وقت سب کو بتایا کہ ''وہ'' واقعی آ رہا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ سے تقریباً ایک ایک فٹ اچھل پڑے۔ کئی دن سے کسی شخص کا مستقل تذکرہ ہو رہا تھا۔ کئی پارٹیاں اور پکنکیں ایک خاص مدت کے لئے ملتوی کی جا رہی تھیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ دیکھ لینا وہ ضرور اس دفعہ شادی کر لے گا۔ قطعی نہیں۔ وہ شادی کرنے والا ٹائپ ہی نہیں۔ بھئی موسیقی کی پارٹیوں کا اس کے بغیر لطف ہی نہیں۔ ارے میاں انعام محمود نی نی کی طرف سے باخبر رہنا۔ ''وہ'' آ رہا ہے۔ بھئی ڈاکٹر خان کو اطلاع کر کے ایمبولینس کاریں منگوالی جائیں نجانے کتنی بچاریاں قتل ہوں گی کتنی زخمی۔

''آخر یہ کون ڈون ژوان صاحب ہیں جنہوں نے اپنی آمد سے پہلے ہی اتنا تہلکہ مچا رکھا ہے۔'' ناہید نے اکتا کر پوچھا۔

''ڈون ژوان.....! قسم سے ناہید بیگم خوب نام رکھا تم نے۔ ''وہ'' ہے دراصل خورشید احمد۔ پچھلے سال کئی سال سے اپنا ہوائی بیڑہ لے کر سمندر پار گیا ہوا

تھا۔اسی سال واپس آیا ہے۔اور اتوار کی شام کو یہاں پہنچ رہا ہے۔باقی حالات آپ خود پردۂ سیمیں پر ملاحظہ فرمائیے گا۔'' راجکمار روی نے کہا۔

اسی زور سے بارش شروع ہوگئی۔اور اپنی امی کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے ناہید کئی روز تک ان پورنا اور دوسرے دوستوں سے ملنے کے لئے سوائے نہ آ سکی۔

دوسرے دن شام کو بالآخر ''وہ'' آ گیا۔اس کے ساتھ اس کے دو دوست اور تھے جو اس کے ہوائی بیڑے سے تعلق رکھتے تھے۔

چائے کے بعد ڈائننگ ہال کی سیڑھیاں طے کر کے وہ بلیرڈ روم کی طرف جا رہا تھا۔اور اس وقت ان پورنا نے اسے دوسری بار دیکھا۔

کیونکہ وہ مکمل اندر تھا۔ان پورنا کے دل میں کسی نے چپکے سے کہا۔

اس وقت تک ان پورنا کا اس سے باقاعدہ تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔اس لئے ڈائننگ ہال کے زینے پر سے اتر کے چھت پڑے ہوئے راستے کی جانب جاتی ہوئی ان پورنا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے پہچانے بغیر بلیرڈ روم میں داخل ہو گیا۔جہاں سب دوست جمع تھے۔

تھوڑی دیر بعد نشست کے بڑے کمرے میں واپس آ کر ان پورنا دیوار کے قریب پڑے ہوئے ایک بڑے صوفے پر گر گئی۔اس نے دیوار پر لگے ہوئے بڑے آئینے میں اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرنی چاہی۔اس نے پیانو پر ایک نغمہ نکالنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کشنوں پر سر رکھے اسی طرح پڑی رہی۔بالکل خالی الذہن۔

اتنے میں وسط کے ہال کے زینے پر سے اتر کر مسز پدمنی اچاریہ اندر آئیں۔اس

نے سوچا کہ وہ ان سے میرا کے ''پل اوور'' کے لئے وہ نمونہ مانگ لے جو وہ صبح بن رہی تھی۔ مگر مسز اچاریہ اسے ایک ہلکا سا 'ہلو' کہنے کے بعد آئینے میں اپنے بال ٹھیک کر کے باہر چلی گئیں۔ اور وہ..... اس نے کچھ نہ کہا۔ کمرے کی کھڑکیوں میں سے باہر لاؤنج میں بیٹھے ہوئے لوگ حسب معمول برج کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ پھر اندھیرا پڑے بلیرڈ روم سے واپس آ کر برجیش برآمدے سے گزرا، اور وہ اس کے ساتھ اپنے کمروں کی طرف چلی گئی۔

دوسرے روز صبح جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر ونگ کے برآمدے میں سے گزرتی زینے کی سمت جا رہی تھی، وہ زینے کی مختصر سی سیڑھیوں کے اختتام پر کلوک روم کے قریب کھڑا سگریٹ جلاتا نظر آیا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزری تو اس نے آگے آ کر بے حد اخلاق سے 'آداب عرض' کہا۔ غالباً پچھلی شام بلیرڈ روم میں ان پورنا سے اس کا غائبانہ تعارف کرا دیا گیا تھا۔

''میں خورشید ہوں۔ خورشید احمد۔''

''آداب۔ برجیش کے دوستوں میں سے میں نے صرف آپ کو اب تک نہیں دیکھا۔''

''جی ہاں۔ جب میں ہندوستان سے باہر گیا تھا۔ اس وقت تک برجیش نے شادی نہیں کی تھی۔''

اور تب ان پورنا سے کوئی چپکے سے بولا۔ اس سے کہو تم غلط کہتے ہو۔ تم خورشید احمد قطعی نہیں ہو۔ تم بالکل صفا کمل اندر ہو۔ پورن ماشی کی چاندنی میں نکھرتے سفید شگوفوں اور دینا کے گیتوں والے کمل اندر۔ کنول کے پھول کے دیوتا۔ فوراً سے

اپنے اس بچپنے پر ہنسی آ گئی۔ اس بے موقع ہنسی کو ایک انتہائی خوش اخلاقی کی مسکراہٹ میں تبدیل کرتے ہوئے اس نے کہا..... ''اچھا آیئے نیچے چلیں۔ ہمارا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔''

چائے پیتے پیتے کنور رانی بلبیر سنگھ نے بڑی بزرگانہ شفقت سے خورشید سے پوچھا ''بھیا تم کرت ہو؟'' انہیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ بھی مردوئی کے اسی حصے کا ہے جس طرف ان کا تعلقہ تھا۔

''فی الحال تو بمبار طیارے اڑاتا ہوں۔ لڑائی کے بعد نوکری نہیں ملی تو مرغیوں کی تجارت کیا کروں گا۔ بڑی مفید چیز ہوتی ہے پولٹری فارمنگ.....''

''شادی اب تک کیوں نہیں کی؟'' بیگم ارجمند نے اس کی بات کاٹ دی۔

''وہ وجہ دراصل یہ ہوئی بیگم ارجمند، کہ کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتی۔ اور جن لڑکیوں سے میں ملا وہ یا تو جلد بازی میں آ کر پہلے ہی شادی کر چکی تھیں یا کسی اور کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھیں یا عنقریب ہونے والی تھیں۔ اس کے علاوہ بیگم ارجمند میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں بچتے۔ کہ ایک بلی بھی پال سکوں۔''

جب خواتین بیگم انور امام یعنی ناہید کی امی کی مزاج پرسی کے لئے رکشاؤں میں سوار ہو گئیں تو راجکمار روی نے پوچھا۔ ''خورشید میاں تم بہت اترا رہے ہو۔ لیکن تمہارے اس تازہ ترین عشق کا کیا ہوا جس کا ذکر اپنے خطوط میں کر کر کے تم نے بور کر دیا تھا۔

''چل رہا ہے۔'' اس نے اس بے فکری سے جواب دیا۔ گویا موٹر ہے جو ٹھیک

کام دے رہی ہے۔

اور بہت سی دلچسپ اور انوکھی باتوں کے علاوہ اس نے طے کیا تھا کہ اگر کوئی لڑکی اسے سچ مچ پسند آ گئی تو وہ فی الفور اس سے شادی کر لے گا۔ چاہے وہ کتنی ہی کالی بھجنگی ایسی کیوں نہ ہو۔ ویسے وہ کیپ فٹ کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے گاہے بگاہے غم دل میں مبتلا ہو جایا کرتا تھا۔

لیکن پچھلے دنوں والا واقعہ خاصی سنجیدہ شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اسی مارچ کے ایک غیر دلچسپ سے اتوار کو جبکہ اس کی میس کے سارے ساتھی یا سو رہے تھے یا اپنے اپنے گھروں کو خط لکھنے میں مصروف تھے۔ اور کینٹین میں کام کرنے والی ساری لڑکیاں 'اوف ڈیوٹی' تھیں، اور مطلع سخت ابر آلود تھا۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے اس وقت اس نے فوراً اس لڑکی سے عشق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس کی تصویر اسی روز نئے لسنر (Listner) میں دیکھی تھی۔ وہ ایک خاصی خوش شکل لڑکی تھی اور شمالی ہند کی کسی نشر گاہ سے دوپہر کو انگریزی موسیقی کے ریکارڈوں کا 'اناؤنسمنٹ' کرتی تھی۔ چنانچہ بے حد اہتمام سے اسی وقت ایک 'ریڈیو فین' کی حیثیت سے اسے ایک خط لکھا گیا۔ آپ کے ریکارڈوں کا انتخاب بے حد نفیس ہوتا ہے۔ اور اپنی نقرئی آواز میں جب آپ فرمائشی ریکارڈوں کے ساتھ ساتھ سننے والوں کو ایک دوسرے کے پیغامات نشر کرتی ہیں انہیں سننے کے بعد سے صورت حالات یہ ہے کہ ہم میں سے ایک کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ دوسرے کو اختلاج قلب کا عارضہ ہو گیا ہے۔ تیسرے کو اعصابی شکایت اور باقی سب کو ابھی دل و دماغ کے جتنے امراض تحقیق ہونے باقی ہیں وہ سب لاحق ہونے

والے ہیں۔ اور پرسوں رات کے ڈرامے میں جو آپ کینڈیڈا بنی تھیں تو چاروں طرف اتنے حادثات وقوع پذیر ہوئے کہ ہمیں ریڈیو بند کر کے ایمبولینس کار منگوانی پڑی۔ پھر ایک دوست صاحب خاص طور پر سفر کر کے اس لڑکی کو دیکھنے گئے۔ اور تقریباً نیم جاں واپس آئے۔ پھر ایک صاحب سے جو اسی نشر گاہ کے ایس ڈی کے دوست تھے۔ معلوم ہوا کہ بڑی بد دماغ لڑکی ہے۔ کسی کو لفٹ نہیں دیتی۔ اسٹوڈیوز میں اپنے کام سے کام رکھتی ہے اور سب اس سے ڈرتے ہیں۔ پھر اس کو مختلف ناموں سے دس پندرہ خط لکھے گئے۔ عرصے کے بعد اس کا جواب آیا۔ خط میں بڑا فیشن ایبل پتہ درج تھا جو بڑی رومینٹک بات لگی۔ اور بڑا مختصر سا خط جو، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں کو ہمارے پروگرام پسند آتے ہیں، سے شروع ہو کر، امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے، پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد پھر دو تین خط لکھے گئے۔ سب کا جواب غائب۔ آخر میں خورشید کا مسوری آنے سے چند روز قبل اسی لڑکی کا ان سارے خطوں کے جواب میں ایک اور مختصر خط ملا تھا۔ جس پر اور بھی زیادہ فیشن ایبل اور افسانوی پتہ درج تھا۔ ..... فیری لینڈ، ونسنٹ ہل، مسوری۔

اور اب جب سے خورشید اور اس کے دونوں دوست مسوری پہنچے تھے۔ یہی فکر کی جا رہی تھی کہ اس فیری لینڈ کو تلاش کیا جائے۔

اگلی صبح، اپنے سوائے والے دوستوں کو بتائے بغیر پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ ونسنٹ ہل کی طرف چل پڑے۔ بہت اونچی چڑھائی کے بعد ایک خوبصورت دو منزلہ کوٹھی نظر آئی۔ جس کے پھاٹک پر ایک سنگ مرمر کے ٹکڑے پر ''فیری لینڈ''

لکھا تھا۔

آگے بڑھے تو پہلے ایک بل ڈاگ اندر سے نکلا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ آخر میں ایک چھوٹا سا سفید کتا باہر آیا۔ جو پیسٹری کھا رہا تھا۔ تینوں پہلے کتوں نے مل کر بھونکنا شروع کیا۔ چوتھا کتا یقیناً زیادہ خوش اخلاق تھا۔ وہ چپ چاپ پیسٹری کے ڈبے میں مصروف رہا۔ سب کے بعد ایک لڑکی باہر آئی اور ان سب کتوں کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔ کیونکہ باہر خنکی زیادہ تھی۔ اور کتوں کو انفلوئنزا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ابھی انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ آگے جائیں یا واپس چلیں کہ موڑ پر سے کنور رانی بلبیر سنگھ کی رکشا آتی نظر آئی۔ سوالات کی زد سے بچنے کے لئے وہ جلدی سے پیچھے چلے گئے۔

''چنانچہ پیسٹری کھاتا ہے۔'' خاموشی سے چلتے ہوئے کپورتھلہ ہاؤس کی سڑک پر واپس پہنچ کر ایک دوست نے بےحد غور و فکر کے بعد کہا۔

''باقی کے تینوں بھی اگر یہی شوق کریں تو نہیں بھونکیں گے۔'' دوسرے نے کہا۔

''قطعی نہیں بھونکیں گے۔'' خورشید نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

شام کو جب خورشید راجکمار روی اور برجیش کے ساتھ مال پر ٹہلنے لگا تو دفعتہً اسے یاد آ گیا کہ بےحد ضروری خریداری کرنا ہے۔ ''تم لوگ حمید اللہ سے مل آؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔'' راجکمار روی اور برجیش کے آگے جانے کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ منزلیں مارتا کلہڑی تک پہنچ گیا۔ لیکن کیک پیسٹری کی دوکان

کہیں نظر نہیں آئی۔ آخر جب وہ بالکل نا امید ہو کر واپس لوٹ رہے تھے تو خورشید کی نظر سڑک کی ڈھلوان کے اختتام پر ایک چھوٹی سی دوکان پر پڑ گئی۔ جس پر بے حد بڑا بورڈ لگا تھا۔ ''رائل کنفکشنری'' ایک صاحب دوکان کے باہر کرسی پر بیٹھے ہمدرد صحت پڑھ رہے تھے۔

''کیوں صاحب آپ کیک پیسٹری بیچتے ہیں؟''

''جی نہیں..... کیا آپ کا خیال ہے میں نے تفریحاً دوکان کھولی ہے۔''

''ارے میرا مطلب ہے.....''

''مطلب کیا صاحب، کیا میں یہاں جھک مارنے کے لئے بیٹھا ہوں؟ یا یہ جو کھڑکی سجی ہے اسے صرف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ یا انہیں محض سونگھتا ہوں۔ آخر سمجھتے کیا ہیں آپ؟ منہ کہتے ہیں کہ.....''

''کیا چاہئے صاحب.....؟ اندر سے جلدی سے ایک لڑکا نکلا۔

شام کو وہ سب ہیک مینز کے ایک نسبتاً خاموش گوشے میں جمع چائے پی رہے تھے..... ''آہ..... فقط ایک جھلک اس کی دیکھی ہے لیکن کیا نفیس ناک ہے کہ گلابی سی اور مختصر جو غالباً سردی کی وجہ سے نم رہتی ہے۔ اور آنکھیں چمکیلی اور شوخ اور نرگسی۔ اور لمبے لمبے ریشمی بال۔ اور آہ وہ کان۔ چھوٹے چھوٹے بالکل پرستش کے قابل.....'' خورشید نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بے حد رنجیدہ لہجہ میں کہا۔

''کہاں دیکھی تھی یار جلدی بتاؤ۔'' انعام محمود نے کان کھڑے کئے۔

''آہ..... وہ دنیا کا بہترین کتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی کا کتا

ہے اور.....''

یک لخت خورشید کو وہ دوبارہ نظر آ گیا۔ وہ ذرا دور پر دیوار کے قریب ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اتنا نفیس، خلیق کتا جو اگر نہ بھونکتا تو پتہ بھی نہ چلتا کہ کتا ہے۔ بالکل سفید فر کا بڑا سا پرس معلوم ہوتا تھا۔

اور ڈون کارلو کو اپنے سامنے رکھی ہوئی طشتری میں پام کیک کے ٹکڑے کھاتے دفعتہً خیال آیا کہ گیلری کے پرے، نیلے رنگ کے یونیفارم میں ملبوس اس انسان کو وہ صبح دیکھ چکا ہے۔ اس نے کیک ختم کر کے ایک طویل انگڑائی لی۔ اور اس انسان سے گفتگو کرنے کے ارادے سے صوفے پر سے کود کر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا گیلری کی طرف چلا۔

اس کی مالکہ اسی گیلری کی دوسری جانب اپنے بھائیوں اور بہنوئی کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔ اور حالانکہ ''انڈین ٹی'' کے اشتہار سے پتہ چلتا ہے کہ اس چائے کو پینے کے بعد آپ کو دنیا میں کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت اس نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان جو تھوڑی دیر قبل 'ارجمند کراؤڈ' کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تھا یقیناً ایسا تھا کہ اگر پچھلی کرسمس میں اس کی نسبت علی ریاض اے۔ ایس۔ پی سے نہ گئی ہوتی اور یہ نووارد آدمی اگر اس میں دلچسپی لینا چاہتا تو قطعی مضائقہ نہ تھا۔

''ہلو ناہید بیگم..... تم اتنے دنوں کہاں چھپی رہیں۔ ادھر آؤ..... تمہیں خورشید سے ملوائیں جسے تم نے ڈون ژوان کا خطاب دیا تھا۔'' راجکمار روی نے اس کی میز کے قریب آ کر کہا۔

رات کو جب وہ سب ہیک مینز سے واپس آ رہے تھے۔تو ناہید نے خورشید کے اس دوست کو دیکھ کر جو رائل کنفکشنری سے واپسی سے اب تک بیحد اہتمام سے پیسٹری کا ڈبہ اٹھائے پھر رہا تھا۔اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے خورشید سے پوچھا۔''آپ لوگوں کو پیسٹری کا اتنا شوق ہے کہ اس کے ڈبے ساتھ لئے گھومتے ہیں؟''

اگلی صبح بڑی خوشگوار تھی۔رات بھر برس کر آسمان کھل گیا تھا۔راستوں کے رنگ برنگے سنگ ریزے بارش کے پانی میں دھل دھلا کر خوب چمک رہے تھے۔ فضا میں پھولوں کی مہک اور گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔زندگی بڑی تر و تازہ اور نکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ان پورنا میرا کو لے کر ٹہلتی ہوئی نچلی دیوار تک آ گئی۔ جہاں چند رکشائیں اور موٹریں کھڑی تھیں۔ لائبریری والی سڑک کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ ہوٹل کی طرف نظر آیا۔قریب پہنچ کر اس نے اپنی مخصوص دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ''آداب عرض'' کہا۔''جے کرو بی بی۔انکل کو۔جے نہیں کی تم نے۔''ان پورنا نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میرا کو ڈانٹا۔میرا نے بےحد پیارے طریقے سے اپنے ننھے منے ہاتھ جوڑ دیئے خورشید نے جھک کر اسے اٹھالیا۔پھر اسے آیا کے سپرد کر دینے کے بعد وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کی جانب آ گئے۔برجیش کے برآمدے میں پکنک کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔سب خورشید کے منتظر تھے۔

ایسا لگتا تھا۔جیسے سب میں جان پڑ گئی ہے۔ جو لوگ موسم کی غیر دلچسپی کی شکایت کرتے رہتے تھے۔اب ان کا ہر لمحہ نت نئے پروگرام بنانے میں صرف ہوتا

۔ ہر وقت پیانو اور وائلن بجتا۔ فیری لینڈ جا کر ناہید سے ڈھوک کے پوربی گیت سنے جاتے برساتیوں، ٹوکریوں اور چھتریوں سے لد پھند کر وہ سب دور دور نکل جاتے۔ ایک روز پکنک پر جاتے ہوئے، ''رائل کنفکشنری'' پر بھی دھاوا بولا گیا۔ برجیش بھی اب کلاویاسٹریٹ کی خبریں پڑھنے کی بجائے ان تفریحوں میں حصہ لینے لگا۔ دنیا یک لخت بڑی پرمسرت بڑی روشن اور بڑی خوشگوار جگہ بن گئی تھی۔

جس گھر میں خورشید اپنے ایک دور کے عزیز کے یہاں ٹھہرا تھا۔ وہ نہایت عجیب وغریب اور بے حد دلچسپ جگہ تھی۔ اوپر کی منزل میں جو سڑک کی سطح کے برابر تھی۔ گھوڑے رہتے تھے۔ جو سڑک پر سے سیدھے اپنے اصطبل میں پہنچ جاتے۔ جو ڈرائنگ روم کے عین اوپر تھا۔ درمیانی منزل میں مرغیاں کتے، بلیاں، بچے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ نچلی منزل میں جس کی سیڑھیاں کھڈ میں اترتی تھیں۔ خورشید کو ٹھیرایا گیا تھا۔ گھوڑے شاید الارم لگا کر سوتے تھے۔ صبح سویرے ہی وہ جاگ جاتے اور تیسری منزل کی کھڑکیوں سے نیچے جھانکنے میں مصروف ہو جاتے۔ خورشید کا جی چاہتا تھا کہ زور سے کچھ اس قسم کا گیت الاپے..... یہ کون اٹھا کس نے گھوڑوں کو اٹھایا..... پھر دوسری منزل پر مرغیاں کتے، بلیاں، بچے اور لڑکیاں اپنے اپنے پسندیدہ اسٹائل سے جاگنا شروع کرتیں۔ اور قیامت کا شور مچتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خورشید کے دونوں دوست غسلخانوں میں گھس کر اپنا صبح کا قومی ترانہ شروع کر دیتے..... یہ کون آج آیا سویرے سویرے..... پھر لڑکیاں گھوڑوں پر سواری کے لئے جاتیں۔ لیکن سواری کرنی کسی کو بھی نہیں آتی تھی۔ اس لئے سڑکوں پر روز شہسواری سکھانے کا بے انتہا خوش گوار فرض خورشید کے سپرد کیا گیا۔

وہ اسی دن اپنا سامان لے کر سوائے بھاگ آیا۔

اسٹینڈرڈ میں سالانہ مشاعرہ تھا۔ محفل ختم ہونے کے بعد سب باہر نکل آئے تھے بڑا بے پناہ مجمع تھا۔ بھوپال کی الٹرا فیشن ایبل لڑکیاں حیدرآباد کے جاگیردار، رام پور کے رئیس، نئی دہلی اور لکھنؤ کے صاحب لوگ، سب کے ہونٹوں پر جگر کی تازہ غزل کے اشعار تھے۔

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

زینے کی سیڑھیاں طے کر کے وہ سارے دوست بھی نیچے سڑک پر آ گئے۔ مشاعرے کے دوران میں خورشید ان پورنا کو شعروں کے مشکل الفاظ کے معنی بتاتا رہا اور ان پورنا نے طے کر لیا کہ وہ ناہید سے قطعی طور پر اردو پڑھنا شروع کر دے گی۔ اردو دنیا کی خوبصورت ترین اور شیریں ترین زبان تھی۔ اور لکھنؤ والوں کا لب و لہجہ لکھنؤ جو خورشید کا وطن تھا۔ ان پورنا کو لکھنؤ دیکھنے کا اشتیاق زیادہ ہو گیا۔ وہاں کے ہرے بھرے باغ، سایہ دار خوبصورت سڑکیں، شاندار عمارتیں، مہذب لوگ جہاں کے تانگے والے اور سبزی فروش بھی اس قدر تہذیب سے اور ایسی نفیس زبان میں گفتگو کرتے تھے کہ بس سنا کیجئے اور پھر وہاں کا موسیقی کا میرس کالج، وہاں کا کتھک ناچ خورشید نے وائلن میرس کالج میں سیکھا تھا۔ برجیش کہتا تھا جس طرح ان پورنا رانی کی جان تان پورے کے تاروں میں رہتی ہے اسی طرح خورشید کی جان اس کے وائلن کے کیس میں بند ہے۔ مسلمان لڑکے عام طور پر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ ناہید کی ساری غیر مسلم سہیلیاں اس سے اکثر

کہا کرتی تھیں۔ خورشید بھی بہت خوبصورت تھا بریگیڈیئر جیش اور کرنل جہانگیر اور راجکمار روی ان سب سے زیادہ دل کش اور شاندار۔

اور اس وقت جبکہ مشاعرے کے بعد وہ سب ٹہلتے ہوئے اسٹینڈرڈ سے واپس آ رہے تھے، مال کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دفعتہً خورشید نے مڑ کر ان پورنا سے کہا..... ''زندگی بڑی خوشگوار ہے نا ان پورنا رانی۔ ہے نا؟'' پھر وہ بے فکری سے دھیرے دھیرے سیٹی بجا کر ڈون کارلو کو بلانے لگا جو ناہید کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ اور ان پورنا آگے جاتے ہوئے مجمع سے ذرا فاصلہ پر سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔ آسمان پر ستارے جگمگا اٹھے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔

''تم زندگی سے بالکل مطمئن ہو خورشید احمد؟'' ان پورنا نے تھوڑی دیر تک خاموشی سے اس کے ساتھ چلتے رہنے کے بعد پوچھا۔

''بالکل..... مجھ سے زیادہ بے فکرا شخص کون ہوگا..... ان پورنا رانی! میں، جس کی زندگی کا واحد مصرف کھیلنا اور خوش رہنا ہے۔ جب میں اپنا طیارہ لے کر فضا کی بلندیوں پر پہنچتا ہوں۔ اس وقت مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ میں موت سے ملاقات کرنے کی غرض سے جا رہا ہوں۔ موت مجھے کسی لمحے بھی زندگی سے چھین سکتی ہے۔ لیکن زندگی اب تک میرے لئے خوب مکمل اور بھرپور رہی ہے۔ اگر میں آج مر جاؤں تو کسی کو ذرا بھی دکھ نہ ہوگا۔ میرے پیچھے اس خوبصورت دنیا میں صرف میرے دوست رہ جائیں گے۔ جو کبھی کبھی ایسی ہی خوشگوار راتوں میں مجھے یاد کر لیا کریں گے۔''

ان پورنا کاجی چاہا کہ وچلا کر کہے..... تم غلط کہتے ہو کمل اندر! اگر تم مرو گے تو تمہارے لئے ایک روح عمر بھر روئے گی کہ تم نے اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا لیکن نہ مل سکے۔

اور پھر اپنی اوبزرویشن پوسٹ پر بیٹھے بیٹھے بیگم ارجمند اور کنور رانی صاحبہ نے طے کیا کہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے کا۔ نیک سیرت، شکیل۔ برسر روزگار اور اب تک یوں ہی کنوارا گھوم رہا ہے۔ اس کی شادی کروانی چاہیے۔ بیگم ارجمند اور کنور رانی صاحبہ نہایت تندہی سے لڑکیاں کھوجنے میں مصروف ہو گئیں۔ جتنے خاندان اس سال مسوری آئے تھے ان کی لڑکیاں، اور جتنے نہیں آئے تھے، اور جتنی لڑکیاں کالجوں کی ڈگریاں لے لے کر اب شادی کے انتظار میں گھروں پر بیٹھی تھیں۔ اور جتنی لڑکیوں کو ان کے والدین ہر سال مسوری صرف اسی لئے لاتے تھے کہ کہیں چلتے پھرتے کیملس ہیگ پر گھومتے، ہیگ میز میں ناچتے اچھے کھاتے پیتے لڑکے مل جائیں، کیونکہ ظاہر ہے جو لڑکے ہیگ میز میں ناچ سکتے ہیں۔ وہ یقیناً کھاتے پیتے بلکہ کھاتے کم پیتے زیادہ ہی ہوں گے۔ ان سب پر بیگم ارجمند نے اپنے برآمدے پر سے ایک طائرانہ نظر ڈالی اور خورشید کو ازدواجی زندگی کی گوناگوں خوبیوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بیگم انور امام سے بھی وقتاً فوقتاً کہنے لگیں کہ جب آپ ناہید کی منگنی کر چکی ہیں تو اب شادی بھی کر ڈالئے۔ یا اگر اس جگہ کرنے کا اب آپ کا ارادہ نہیں رہا وہ دوسری بات ہے۔ میری نظر میں اور بھی کئی اچھے لڑکے ہیں۔ وغیرہ۔

کہتے ہیں ایک شادی کرانے سے شاید ایک حج کا ثواب ملتا ہے۔ بلکہ حدیث

شریف اور صحیح بخاری میں تو یہاں تک آیا ہے کہ مردے کے دفن اور لڑکی کے نکاح میں تاخیر نہ کرو کہ تاخیر سے جس گھر میں کنواری لڑکی دیر تک موجود رہے۔ وہاں نیکی کے فرشتوں کا گزر کم ہوتا ہے۔ اور شیطان کے آنے کا احتمال زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مومنوں کی لڑکیاں عزت و آبرو کے ساتھ اٹھائے۔ اور اپنے اپنے گھروں کی کرے آمین!

بیگم ارجمند کی نصیحتیں سن کر ناہید بھی بوکھلا گئی اور اسے لگا جیسے علی ریاض سے اب تک شادی نہ کر کے اس نے کوئی بڑا سخت نا قابل معافی جرم کیا ہے۔ اور قیامت کے روز وہ قطعی نہ بخشی جائے گی۔

تب لاؤنج میں اور نشست کے بڑے کمرے میں اور ڈائننگ ہال میں چپکے چپکے سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ یار برجیش ذرا باہر جا کر دیکھ تیری بیوی اس مسلمان چھوکرے کے لئے کتنی بے وقوف بن رہی ہے مگر بھئی وہ طلاق بھی تو نہیں لے سکتی۔ ہندو عورت کو تو اپنے یہاں کے ساتھ عمر بتانی پڑتی ہے۔ یہ کوئی مسلمان لونڈیوں کے ٹھاٹھ ہیں کہ ادھر شادی ہوئی اور ادھر کوئی دوسرا پسند آ گیا تو کھٹ سے طلاق..... اور جانے کیا کیا باتیں۔ اور برجیش دن بھر زیادہ تر برج کھیلتا یا پھر اپنے دوستوں سے گولف کی باتیں کرتا رہتا۔

دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ پھولوں کے پودے اور پائن اور سلور اوک کے درخت شام کی ہوا میں آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ ڈھلوان کی طرف بہتے ہوئے پانی میں سنگریزے جگمگا رہے تھے۔ ہوا میں مٹی اور پھولوں کی عجیب سوندھی سی خوشبو اڑ رہی تھی۔ اور کچھ دور پر ایک پرشور پہاڑی نالہ پتھروں سے ٹکراتا تیزی

سے نیچے گر رہا تھا ان پورنا سیڑھیاں طے کر کے نیچے سڑک کی ریلنگ پر جھکی وادی کو دیکھنے لگی۔ جہاں مکانوں کی سرخ چھتیں، ہرے درخت، اور دھندلے بادل نیلے کہرے میں ایک دوسرے سے گھل مل رہے تھے۔ اس کے پاس جنگلے کے سہارے کھڑی ہوئی ناہید نے جو بے فکری سے اپنا کوئی پسندیدہ گیت گنگنا رہی تھی، دفعتہً اس سے پوچھا۔

''ان پورنا خورشید بڑا پیارا لڑکا ہے نا؟''

''ہُم.....''

''میں اس سے شادی کر لوں؟'' ناہید نے اسی بے فکری سے پوچھا۔ گویا لیلا رام کے یہاں آئی ہوئی کسی نئی قسم کی ساری کی خریداری کے متعلق رائے لے رہی ہے۔ ہائے بھگوان..... کیسی مضحکہ خیز، عجیب و غریب صورت حال تھی۔

''بیگم ارجمند کے ذریعہ تو وہ کب کا کہلوا چکا ہے۔ وہ اب تک اس لئے خاموش تھا۔ کیونکہ اس نے سنا تھا کہ میری نسبت پہلے ہی ہو چکی ہے۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ خاندانی پولیٹکس کی وجہ یہ منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ تو اس نے فوراً پروپوز کر دیا۔ کتنی سویٹ بات کی ناگدو نے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میرے گھر والے راضی نہ ہوں گے کیونکہ وہ بے چارہ سید نہیں ہے اور ہمارے ہاں خاندان سے باہر اور خصوصاً غیر سیدوں سے شادی کر ہی نہیں سکتے۔''

''یہ تو بڑی ٹریجڈی ہے۔''

''اور کیا بھئی۔ بھئی اللہ ان پورنا تم تو کوئی رائے دیتی ہی نہیں۔ کتنی بور ہو۔ خدا کی قسم۔ اور پرسوں ہم لوگ نینی جا رہے ہیں۔''

''اچھا واقعی.....''

پہاڑی نالہ اسی تیزی سے نیچے گر رہا تھا۔ سڑک پر رونق بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر ان پورنا آہستہ آہستہ قدم رکھتی سیڑھیاں طے کر کے ہوٹل واپس آ گئی۔ نشست کے کمرے میں سے کسی ساز کی آواز آ رہی تھی۔ بہت مدھم سروں میں شاید وائلن کے تار چھیڑے جا رہے تھے۔ ایک بہت ہی پیارا نغمہ جو ان پورنا نے اب تک نہ سنا تھا۔ بج رہا تھا۔ وہ لاؤنج کے سامنے سے گزر کر اپنے ونگ میں آ گئی۔ برجیش اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ باہر اندھیرا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے بیڈروم کے دریچے میں کھڑے ہو کر فر کے درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہوتے ہوئے پورن ماشی کے چاند کو دیکھتے ہوئے ان پورنا کو خیال آیا..... ابھی تک برجیش گھوم کر واپس نہیں آیا کہیں اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ ہائے رام..... وائلن کی آواز خاموشی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

پھر برجیش راجکمار روی کے ساتھ ٹہلتا ہوا بہت دور تک نکل گیا۔ شارول روڈ پر سے وہ دونوں کامپٹی فالز روڈ پر مڑ گئے اور خاموشی سے ٹہلتے ٹہلتے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔

''یار تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے ہم لوگ کتنی دور نکل آئے ہیں۔ اب واپس چلو۔ ورنہ مجھے نمونیہ ہو جائے گا۔'' راجکمار نے تھک کر ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ برجیش چٹان کے کنارے پر کھڑا وادی پر جھکے ہوئے چاند کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ارے بھائی جان اب چلنا چاہئے۔ کیا یہیں ریسٹ ہاؤس میں رات

گزارنے کا ارادہ ہے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟'' راجکمار روی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

'' کچھ نہیں میں یہ سوچ رہا تھا۔ یہاں سے چاند تک کا آئرن شوٹ کتنا ہو گا .....؟'' برجیش نچلی چٹان پر اتر آیا۔ چاند کی کرنوں میں آبشار کا شور مچاتا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح جھلملا رہا تھا۔

کہرا بڑھتا جا رہا تھا۔ راجکمار روی پتھر پر سے اٹھ کر سڑک کی طرف واپس جانے لگے۔

اور اس وقت دفعتاً رات کی اتھاہ خاموشی میں پیچھے چٹان پر سے کسی بھاری چیز کی نیچے گہرے کھڈ کے پتھروں پر زور سے گرنے کی آواز آئی۔ پھر کھڈ کی گہرائی میں بہتے ہوئے آبشار کے پانی کا شور زیادہ ہو گیا۔

دور سوائے کے ایک خاموش کمرے میں وائلن کے تاروں سے بلند ہونے والا نغمہ دیر تک تاریکی میں گونجتا رہا۔

کیونکہ وہ برجیشور راؤ پر بھاکر کا آخری نغمہ تھا۔

میں نے لاکھوں کے بول سہے

خالدہ توفیق درختوں کے جھرمٹ میں سے نمودار ہو کر سیدھی میری جانب چلی آ رہی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے پڑے تھے جن میں اس نے زرد رنگ کے دو جنگلی پھول اڑس رکھے تھے۔ دور سے وہ شانتی نکیتن کی کوئی بنگالی طالب علم معلوم ہو رہی تھی۔ جو آمی کوشی موشی قسم کی باتیں کرتی ہو۔ لیکن جب وہ قریب پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ خالدہ توفیق تھی۔ اور کوشی موشی ہو لو کرنے کے بجائے بہت ہی بڑھیا قسم کی ولائتی زبان بولتی تھی۔ اور جلدی جلدی اس طرح گویا اگلے لمحے اسے ٹرین یا ہوائی جہاز پکڑنے کے لئے بھاگنا ہے۔ مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ ''میں خالدہ توفیق ہوں۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔ تمہیں بھی مجھے جاننا چاہیے۔ علاوہ اور سب باتوں کے آج کل قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ میرے پاس میری پیاری خالدہ توفیق۔'' میں نے اس سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ کہا۔ اور مجھے اپنے قدیم اردو ادب کے متعلق بتاؤ۔ اور مجھے تمہارے بالوں کے یہ زرد خورد پھول بے حد پسند آئے ہیں۔'' وہ بالوں کو پیچھے سمیٹ کر میرے قریب تالاب کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور میں نے غوطہ لگانے کے تختے پر الٹے لیٹے لیٹے پہلی نظر میں جیسا کہ لڑکیوں کا قاعدہ ہوتا ہے۔ اس کا مکمل اور مفصل جائزہ لے لیا کہ کس طرح کے کپڑے پہنے ہے۔ ساڑھی کیسی ہے۔ بال کس وضع کے بنائے ہیں۔ اس اثناء میں یقیناً اس نے بھی میرا پورا پورا

جائزہ لیا ہوگا۔لیکن اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ کہ کالج اگر اس قدر جلد نہ کھلتا تو کیا برائی تھی۔اور اگر سرے سے کھلتا ہی نہیں۔ جب تو اور بھی کوئی حرج نہ تھا۔لیکن واقعہ یہ تھا کہ نئی ٹرم شروع ہونے والی تھی۔اور مجھے جلد ہی اپنی ہرے جنگلوں اور روپہلی جھیلوں والی اس خوبصورت اور پرسکون وادی وک چھوڑ کر شہر واپس بھاگنے کی تیاری کرنی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے لیچیوں اور دیودا روں کے اس جھرمٹ کے پتے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔جس کے وسط میں وہ شفاف نیلے پانی اور رنگ برنگے سنگریزوں والا تالاب تھا۔جس کے غوطہ لگانے کے تختے پر میں الٹی لیٹی تھی اور پیر اوپر آسمان کی طرف اٹھا رکھے تھے۔

خالدہ توفیق بے حد تر کی قسم کا اور اسمارٹ سا نام تھا۔مجھ پر تھوڑا سا رعب پڑ گیا اور میں نے تختے کے سرے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔''میری پیاری خالدہ توفیق۔آؤ میرے ساتھ ایک غوطہ لگاؤ۔''لیکن اس نے میری بات کاٹ دی اور بالوں کی لٹیں ہٹا کر بولی۔''نہیں مجھے تمہارا یہ تالاب پسند نہیں آیا۔ میں اس میں تمہارے ساتھ غوطہ نہیں لگاؤں گی۔'' یہ سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔خالدہ توفیق کو یہ میرا پیارا شفاف نیلے پانی اور رنگ برنگے سنگریزوں والا تالاب پسند نہیں آیا۔ میں دل ہی دل میں ایک گہری، ٹھنڈی آہ بھر کے پھر غوطہ لگانے والے تختے پر لیٹ گئی۔اور پیر آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔

''مجھے معلوم ہے۔'' خالدہ توفیق نے تھوڑی دیر بعد پانی کی سطح کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔''کیا؟''

''مجھے وادی کے اس حصے کا راستہ معلوم ہے جہاں ان نیلی پہاڑیوں کے پرے وہ بے حد خوبصورت جھیل ہے۔ جس کے کناروں پر پوست کے سرخ پھول کھلتے ہیں اور گھاس میں ہرے رنگ کے نہایت شکیل ٹڈے کودتے رہتے ہیں۔'' اس نے آہستہ آہستہ جواب دیا۔

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''اور اس میں کنول کے پھول ہیں؟ اور سارس اور بطخیں؟ اور کنارے پر کوئی پرانا درخت بھی کھڑا ہے۔ جس کے سائے میں ہم اپنی ناؤ باندھ سکیں؟''

''ہاں۔ اس کے کنارے پر ایک پرانا درخت کھڑا ہے، جس کے سائے میں ہم اپنی ناؤ باندھ سکیں۔'' اس نے اسی انداز سے یکساں آواز میں میری بات دہرائی اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر افیمچیوں کی طرح بیٹھ گئی۔

میں بے حد خوش ہو کر تختے پر سے کود کے اس کے پاس آ گئی۔ اور اس جھیل کے تصور میں مصروف ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ میں کسی پچھلے جنم میں ایک چھوٹی سی چمکیلے رنگ کی انتہائی خوبصورت مینڈک تھی اور اپنے گاؤں کی تلیا میں رہا کرتی تھی۔ اور برکھا کی کالی راتوں میں خوب زور زور سے گایا کرتی تھی۔ اور ہمیشہ زکام بلکہ انفلوئنزا میں مبتلا رہتی تھی۔

''تم می می کو جانتی ہو؟'' خالدہ توفیق نے دفعتاً گھٹنوں میں سے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے افیمچیوں کی طرح پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''نہیں۔ میں می می کو نہیں جانتی۔''

''آؤ میں تمہیں می می سے ملواؤں۔ مجھے وہ راستہ بھی معلوم ہے جو اس کے گھر

کی طرف جاتا ہے۔علاوہ اور سب باتوں کے۔'' اس نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ہم دونوں تالاب کے کنارے پر سے چھلانگ لگا کر پگڈنڈی پر آ گئے۔ میں نے اپنے بٹے کے جھونجھا ایسے بالوں کو کئی بار خوب زور زور سے جھٹک کر پانی کے چھینٹے چاروں طرف بکھیرے اور سر پر تولئے کا حیدر آبادی صافے ایسا گنبد بنا کر جنگل کے خاموش راستے پر خالدہ توفیق کے ساتھ چل دی۔ ہمارے چاروں طرف گلہریاں تھیں۔ جنگلی طوطے تھے۔خرگوش تھے۔اور جھرمٹ کے سارے پرند لیچیوں کی ٹہنیوں پر اکٹھے ہو کر شور مچا رہے تھے۔ وادی کے نشیب میں گذر کر پہاڑی کے صنوبروں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے پرانے ،سرخ رنگ کی چھت والے گھر کے سامنے پہنچے۔ ایسا گھر جو ہمیں اکثر کرسمس کارڈوں پر سفید برف سے ڈھکا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ایسا ہی کوئی پرانا،سرخ چھت اور شیشے کے برآمدوں اور سبز لکڑی کی جالیوں والا درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا گھر اچانک نظر آ کر جانے کیوں یک لخت بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے ہمیں ساری عمر صرف اسی جگہ پہنچنے کا انتظار رہا ہے۔اور بالآخر اب کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی باتیں ہوں گی اور عمدہ عمدہ چیزیں ملیں گی۔ چوکولیٹ کیک۔ پریاں۔خوب تیز گرم کشمیری چائے،اچھے دوست۔ پرانے گیتوں کے ریکارڈ۔

ہم آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر گئے۔ وہاں پر ہر طرف شکستہ جاپانی گلدانوں میں زرد پھول سو رہے تھے۔ اور پرانے ،چینی ریشم کے بے رنگ اور گھسے ہوئے پردے تھے۔ اور ڈھیروں قدیم وضع کا آبنوس اور شیشم کا بدرنگ فرنیچر ہر کونے کھدرے میں بے تحاشا ٹھنسا ہوا تھا۔ تاریک گیلری میں سے گذر

کے خالدہ توفیق مجھے جلدی جلدی ایک لکڑی کے فرش والے کمرے میں لے گئی۔ جو پہلی نظر میں دکھائی دیا کہ بیک وقت خوابگاہ۔ اور سٹنگ روم، اور اسٹوڈیو اور کھانے کے کمرے اور اسٹڈی کا کام دیتا ہے۔ وہاں، بے ونڈو کے نزدیک ایک گلابی رنگ کے شکستہ صوفے پر جس میں سے نواڑ اور مونج اور اسپرنگ کے تار باہر نکل آئے تھے۔ می می ٹانگیں اوپر رکھے بیٹھی بے حد محویت سے ایک البم میں تصویریں چپکا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ اس نے البم ایک طرف رکھ دیا اور خالدہ توفیق کی طرف باہیں پھیلا دیں۔ اور مجھے ایک لمحے کے لئے بڑی کاہل اور پراسرار نظروں سے دیکھا۔

''اس سے ملو۔ اسے میں نے ابھی آدھ گھنٹہ قبل تالاب کے کنارے دوست بنایا ہے جہاں یہ خرگوش اور گلہریوں میں گھری، ایک مینڈکی کی طرح غوطہ لگانے کے تختے پر بیٹھی تھی اور فلسفۂ حیات پر غور کر رہی تھی۔'' خالدہ توفیق نے اس سے کہا۔

''ہو.....'' کہہ کر اس نے میری طرف سے بھی کاہلی سے باہیں پھیلا دیں۔ میں صوفے کے سرے پر بیٹھ گئی اور بالکل فرش سے جا لگی۔ میری ناک میں کہیں سے گرم چوکولیٹ کی خوشبو گھسی۔ اور میں نے چاروں طرف بے حد دلچسپی سے دیکھا۔ مجھے ایسا بھی یاد پڑتا ہے کہ میں اپنے کسی اور جنم میں مینڈکی کی جون سے پہلے۔ ایک نہایت لالچی قسم کی ایرانی یا انگورہ بلی رہی ہوں گی۔ میں نے سونگھا کہ قریب ہی کہیں کسی کمرے میں چوکولیٹ تیار کی جا رہی ہے۔

''یہ دیکھو بھئی ..... یہ سرور کی نئی تصویر ہے، جو اس نے مجھے دی ہے۔ جب

میں پچھلی بار..... تزین کے ہاں دعوت میں گئی تھی۔'' اس نے خالدہ توفیق سے کہا۔
میں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ اپنی جگہ سے اچک کر البم کو جھانک کر دیکھا۔

''بھئی یہ میرا ایک کزن ہے۔ اس کی چھوٹی بہن تزئین کو شاید تم جانتی ہو۔ جس کی شادی جسٹس عرفان کے نواسے سے ہوئی ہے۔'' اس نے ذرا بے تعلقی اور استغنے سے مجھے مطلع کیا۔ میں نے مستعدی سے سر ہلایا۔ تزئین کو میں جانتی تھی۔ اس کے اس بھائی کو بھی جانتی تھی اس کا نام سرور رہا ہوگا۔ لیکن ہم سب تو اسے پتنگ کہتے تھے۔ کیونکہ وہ بیک وقت اتنی بہت ساری لڑکیوں کی پتنگ تھا۔ اور مستقل سب کی ڈوریں آپس میں کٹتی رہتی تھیں۔ چنانچہ یہ می می بھی پتنگ کا ایک مانجھا اپنے پاس رکھتی تھی۔ میری رگ اسکینڈلیات پھڑک اٹھی اور پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ گھر جاتے ہی میں پتنگ کو فون کر کے بتاؤں گی کہ اس کی ایک ایڈمائیر کو میں نے آج دیکھا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ تو خود اس کا کزن ہے۔ صورت حال سے یقیناً خود ہی واقف ہوگا۔

می می کے اس کرسمس کارڈ ایسے گھر میں ہم دیر تک بیٹھے پتنگ کی باتیں کرتے رہے۔ اور اس نے ہمیں گرم گرم چوکولیٹ پلائی۔ پھر میں اسے اور خالدہ توفیق کو خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی۔ اور سنسان جنگل میں سے گزر کر تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ کیونکہ دفعتاً مجھے یاد آ گیا تھا۔ کہ میں تو لئے کا سبز رنگ کا ڈریسنگ گون پہنے ہوں۔ تھوڑی دور چل کر مجھے سرور ایک پگڈنڈی پر سے آتا دکھائی دیا اس نے کندھے سے کیمرے اور علم غلم بہت سی چیزوں کا بیگ لٹکا رکھا تھا۔ اور کتھئی رنگ کے لباس میں بڑا شاندار شکاری معلوم ہو رہا تھا۔ چٹان پر سے

کود کر وہ میرے قریب آ گیا۔ اور ہم لوگ چناروں والے راستے پر خاموشی سے چلتے رہے۔ بادل گھر کر بہت نیچے جھک آئے تھے اور ہوا میں جنگلی پھولوں اور سیب کے درختوں کی مہک امنڈ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ خوب زور سے سیٹی بجاؤں ٹارالارالارا۔ لیکن دفعتہً مجھے یاد آیا کہ سیٹی بجانا لیڈی لائیک نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن چونکہ میں پچھلے جنم میں تالابوں اور جھیلوں میں رہا کرتی تھی۔ اور برکھارت میں سیٹیاں بجاتی تھی۔ اس لئے میرے منہ سے بالکل اتفاقاً زور سے ٹارالارانکل گیا۔ پتنگ بے حد مصروفیت سے انتہائی غور وفکر میں ڈوبا لمبے لمبے قدم رکھتا آگے آگے چل رہا تھا۔ سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ڈپٹ کر پوچھا۔ ''کیوں بجا رہی ہو سیٹی۔''

اس لئے کہ میں ابھی می می سے مل کر آ رہی ہوں۔'' میں نے ایک ٹانگ پر گھوم کر اس کی طرف مڑتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

''می می سے؟ کون می می؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھئی می می۔ جو ترئین کی اتنی گہری دوست ہے۔ اور تمہاری کزن ہے۔ تمہاری چچا زاد بہن۔'' میں نے تقریباً چلا کر جواب دیا۔

اور اس وقت پتنگ نے انتہائی نامعقولیت کا جواب دیا۔ یعنی اس کے جذبۂ انانیت کو اس اطلاع سے بظاہر قطعی کوئی طمانیت نہ پہنچی۔ حالانکہ اس قسم کے ڈون ژواں لوگوں کے شدید جذبۂ انانیت کا قاعدہ یہ ہے کہ ایسی اطلاعات سے بے حد خوش ہوتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے تمہاری تصویر اپنے البم میں لگائی ہے۔ یا فلاں لڑکی کل شام تمہارے متعلق بار بار پوچھتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سرور پتنگ نے

پلکیں جھپکا کر انتہائی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہ جہاں تک اسے معلوم ہے کوئی می می دور دور تک اس کی کسی قسم کی کزن نہیں ہے۔

ہم لوگ پھر چپ چاپ چناروں والے راستے پر چلنے لگے۔ اس کے لمبے لمبے قدموں کی رفتار سے بالکل صاف ظاہر تھا کہ میری اس روح افزا اطلاع کا اس پر ذرا بھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ میں نے انتہائی غصے کے عالم میں پھر سیٹی بجائی۔ لیکن اس نے ڈانٹنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی اور اسی طرح غور و فکر میں مصروف آگے آگے چلتا رہا۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑ گیا۔

میں تولئے کی پگڑی میں سے بالوں کو جھٹک کر تیزی سے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔ وادی کی تہہ میں نیلی نیلی دھند ایسی جمع ہو رہی تھی اور نشیب میں رنگ برنگے پتھروں پر گرنے والے جھرنے گنگنا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر اپنی سمت بڑھتے ہوئے بادلوں کی خنکی اور نمی کو محسوس کیا۔ اور موسم کی دلفریبی اور کائنات کے حسن کے شدید احساس کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم می می کو جانتی ہو۔'' خالدہ توفیق نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

''ہاں میں می می کو جانتی ہوں۔'' میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ہم دونوں چپ چاپ تالاب کے کنارے بیٹھے رہے۔ سہ پہر بہت گرم تھی۔ ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا پاس سے گزر جاتا۔ تالاب کا پانی ٹھنڈا تھا اور چاندی کی طرح جھلملا رہا تھا۔

''خالدہ توفیق مجھے وہ نیلی پہاڑیوں کے پرے والی جھیل دکھاؤ.....'' میں نے

اس سے کہا۔

''نیلی پہاڑیوں کے پرے والی جھیل.....''اس نے انجان پنے سے پوچھا۔

میرا دل ڈوب گیا۔

''سنو''اس نے قریب آ کر رازدارانہ طریقے سے کہا۔''ہم می می کے ہاں جا رہے ہیں۔اس نے ہم سب کو مدعو کیا ہے۔''

''اسی چوکولیٹ والے گھر میں.....؟''میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''چوکولیٹ والے گھر میں؟''اس نے پلکیں جھپکا کر دہرایا۔

''ہاں۔وہاں پریاں رہی ہیں۔''میں نے یقینی طور پر اسے بتایا۔

''پریاں.....؟''وہ آنکھیں جھپکتی رہی۔میں اکتا کر چپ ہو گئی۔اب بھلا بتائیے کہ کیا کیا جائے۔یہ دنیا والے دراصل اتنے چغد ہیں۔کھلی فضاؤں میں سیٹی بجا کر ایک ٹانگ پر دوڑنا۔لیڈی لائیک تصور نہیں کیا جاتا۔اپنی چچا زاد بہن کو پہچاننا شان پتنگی کے خلاف ہے اور پھر پریوں کے وجود کا کوئی قائل نہیں۔حالانکہ میں نے خود می می کے اس اندھیرے کمرے میں پروں کی سرسراہٹ سنی تھی۔جب میں بلی کی طرح صوفے کی تہ میں بیٹھی تھی اور می می البم میں پتنگ کی تصویریں چپکا رہی تھی۔جو اس کا کزن تھا۔

شام کو ہم سب اسی کرسمس کارڈ ایسے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں جمع ہوئے۔

''می می ڈیئر کل میں نے سرور کو رنک میں دیکھا۔وہ بھی تو رخصت لے کر گرمیاں گزارنے یہاں آیا ہوا ہے۔''رفعت نے اس سے کہا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔وہ میرا چچا زاد بھائی ہے اس کی چھوٹی بہن .....''اس نے بتانا شروع کیا۔

''سب چائے کے لئے میزوں کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ہوائیں درختوں میں گاتی رہیں۔

''می می ڈارلنگ تم نے پتنگ کو کیوں نہیں بلایا۔''

وہ ہمیں انگریزی گانوں کی پیروڈی کر کے سناتا۔

''پتنگ.....؟''اس نے پلکیں جھپکا کر پراسرار طریقے سے مجھے دیکھا۔

''ہاں۔یعنی سرور۔اپنا سرور جو ہے۔تزئین کا بھائی۔''میں نے کہا۔

''تم اسے جانتی ہو.....؟''اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں آں۔وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔''میں نے بڑی بےتعلقی سے جواب دیا۔

''تمہارا خالہ زاد.....؟''اس نے حیرت سے آہستہ آہستہ دہرایا۔

''اور میرا پھوپھی زاد بھائی ہے؟''رفعت نے شگفتگی سے اسے اطلاع دی۔

''میرا ماموں زاد بھائی ہے۔''ریحانہ نے چہک کر کہا۔

''میرا..... ارے جلدی سے بتاؤ کوئی مناسب سا رشتہ۔''سلطانہ نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

''تمہاری خالہ کی دیورانی کا بھانجا ہے۔''میں نے جلدی سے اس کے کان میں کہا۔

''میری خالہ کی دیورانی کے بھانجے کا ماموں۔''سلطانہ نے ارشاد کیا۔

پھر ایک روز می می نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''سنو۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔''

''شکریہ۔'' میں نے انکسار سے جواب دیا۔

''تم میری دوست بن جاؤ۔''

''بن تو گئی۔'' میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

''نہیں..... دوست اس طرح کہ..... کہ.....'' وہ رک گئی۔ ''ارے مجھے خلوص چاہئے وہ کہیں نہیں ملتا۔'' پھر وہ چپ ہو گئی اور میرے البم کے ورق الٹتی پلٹتی رہی۔

''تمہارا خاندان ہی سارا گڈلکرز کا ہے۔'' اس نے تھوڑی دیر بعد پھر بات شروع کی۔

''ہیں ہیں ہیں..... واقعی.....؟'' میں نے بے حد کسر نفسی سے کام لیا۔

''ارے، سرور اور اس کے گھر والوں کی تصویریں تمہارے پاس کیسے؟'' اس نے دفعتہً ایک صفحے پر نظریں ٹھہرا کر پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا..... وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔'' میں نے بے تعلقی سے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

''می می'' تھوڑی دیر بعد میں نے یک لخت اسے مخاطب کیا۔ ''می می..... تم نے پریاں دیکھی ہیں۔''

''پریاں.....؟''

''ہاں۔تم نے کبھی پھولوں،گلہریوں،خرگوشوں سے دوستی کی ہے۔''

''ہیں.....؟''

''تم نے کائنات کا حسن دیکھا ہے؟''

وہ چپ رہی۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے اس سے پھر کہا۔اور اسے باہر ہری وادی میں لے آئی۔جس طرح دو بچے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پگڈنڈیوں پر سے گذر کر ہم درختوں کے جھرمٹ میں چھپے ہوئے تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔وہاں پر چاروں طرف خوبصورت پھول تھے۔اور بادلوں میں سے چھنتی ہوئی سورج کی نرم ارغوانی کرنیں تھیں۔اور ہوا میں نم۔اور تر و تازہ گھاس کی مہک تھی۔میں غوطہ لگانے کے تختے پر اکڑوں بیٹھ گئی۔''تم نے کبھی پانی سے محبت کی ہے؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''پانی سے.....؟''اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے دہرایا۔

''ہاں۔آؤ میرے ساتھ غوطہ لگاؤ۔'' میں نے اس سے کہا۔وہ کنارے پر کھڑی رہی ساکت۔اور پرسکون نیلگوں پانی کی سطح پر اس کے چہرے کا عکس لرزتا رہا۔

''تم نے دیکھا۔'' میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر کہا۔''یہ سب کتنا خوبصورت ہے سرور سے زیادہ خوبصورت ہے،تمہیں ان پھولوں ان برف پوش پہاڑوں کا حسن پسند نہیں؟''

لیکن تالاب کا کنارہ سنسان پڑا تھا وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

''چنانچہ دیکھا تم نے کہ سرور نے اس پرسکون وادی میں داخل ہوتے ہی کتنی گڑبڑ پھیلا دی۔'' خالدہ توفیق نے درختوں سے نمودار ہو کر قریب آتے ہوئے کہا۔ ''جبھی تو میں کہتی تھی۔'' وہ پتھر پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی..... کہ:

مت جا چمن میں الاں، بلبل پہ مت ستم کر!
گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہووے گا.....!!

میں نے کاہلی سے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ وہ قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی ہے۔ تختے پر لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر میں نے عرض کیا۔

''ٹھیک کہتی ہو میری پیاری خالدہ توفیق۔

مجھ کوں ہوا ہے معلوم اے مست جاں خوبی
تری انکھیاں کی دیکھی عالم خراب ہووے گا!!

خالدہ توفیق نے نہایت زور شور سے داد دی۔ میں جھک کر تسلیم بجا لائی۔ چنڈوخانے کے مشاعرے کا لطف آ گیا۔

ہم دونوں پھر اینچیوں کی طرح تالاب کے کنارے گھاس پر جا لیٹے۔

وقت گذرتا گیا۔ نقرئی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی تیزی سے جھلملاتے پانی والی پہاڑی ندی گھنے جنگل کے درختوں میں سے جھلکتی رہتی۔ گرمیوں کی دوپہر کا بھاری بھاری پن وادی کے جنگل میں دوگنا ہو جاتا۔ گہری سبز گھاس، سرخ لیچیاں، تیز نیلا آسمان، فضا کی غنودگی، پانی کی خاموش روانی، شہد کی مکھیاں جھاڑیوں میں گونجنا شروع کر دیتیں اور نیند آنے لگتی۔ درختوں کی پتلی پتلی شاخیں پراسرار انداز

سے سانپوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہوا میں جھولتی رہتیں۔ کوئی اکیلی قاز چیختی ہوئی بادلوں میں سے گزر جاتی۔ سکوت گہرا ہو جاتا۔ میں غوطہ لگانے کے تختے پر لیٹے لیٹے پانی کو دیکھتی رہتی اور مجھے اپنی پچھلے جنم کی مینڈک کی جون یاد آ جاتی اور میں ہنس پڑتی۔ اور اس ہنسی کی آواز دیر تک جنگل کی فضا میں گونجتی رہتی خالدہ توفیق کاہلی سے آنکھیں کھول کر ایمچیوں کی طرح پوچھتی۔ ''کیوں ہنسی تھیں؟ بالکل دیوانی ہو!''

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ اور ہم سب پھر شہر واپس آ گئے۔

می می بھی اس سال وہاں آئی تھی۔

''یہ کون لڑکی ہے.....'' میرے پیارے بھائی ٹوٹ نے مجھ سے چپکے سے پوچھا۔

''یہ.....؟ می می..... می می.....'' میں نے جلدی سے اسے بتایا۔

''میاؤں..... میاؤں.....؟'' اس نے معصومیت سے جھپکا کر دہرایا۔

''ارے نہیں بھئی..... اتنے چغد ہو تم.....'' میں نے اکتا کر کہا۔

لاؤنج میں سے نکل کر میں باہر آ گئی۔ اور گھاس کے ایک سنسان قطعے پر خالدہ توفیق کو بیٹھا پایا۔

''واقعہ یہ ہے۔'' خالدہ توفیق نے گھاس کا تنکا توڑ کر گویا ہوئی: ..... شادی شدہ عورتوں سے عشق کرے گا۔ اور شادی کے بعد غیر شادی شدہ لڑکیوں سے عشق کرے گا اور.....''

''اور یا قطعی شادی کرے گا ہی نہیں۔'' جمیلہ نے کہا۔

''یہ تو واقعی بے حد غور طلب مسئلہ ہے۔'' میں نے ان دونوں کے قریب روش پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی، گجب ہو گیا۔'' رفعت چنبیلی کی کیاری پھلانگ کر تیزی سے ہماری سمت آتے ہوئے چلائی۔

''کیا ہوا؟'' خالدہ توفیق نے سستی سے پوچھا۔

''کیا ہوا.....؟ ارے بھئی تم لوگ تو موقع کی نزاکت و اہمیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔ دیکھتی نہیں ہو کہ سلطانہ اس قدر صفائی سے پتنگ کاٹے لئے جا رہی ہے۔ اور ہم سب می می کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ کیا غضب ہے۔'' وہ بھی ہمارے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''واللہ.....؟ سچ کہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ اس دنیائے فانی میں اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ کس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

''تو کیا بالکل ہی کٹ گئی پتنگ؟'' میں نے رقت بھری آواز میں سوال کیا۔ قومی ہمدردی۔

میرا جی چاہا کہ اسی وقت سرور کو لاؤنج میں سے باہر کھینچ لاؤں اور ساری پنچایت کے آگے اس سے پوچھوں کہ کیوں تم اتنے گدھے اور الو ہو۔ نامعقول۔ می می کو کیوں اپنی تصویریں دی تھیں۔ جو اس نے اپنے البم میں سجائی تھیں۔ اور ہم سب کی چائے کی تھی۔ جب وہ اندر سے نکلا تو برساتی میں جا کر میں نے تقریباً چلا کر اس سے کہا۔ ''سرور تم نے ہماری می می کو کیوں.....''

''کون می می بھئی۔ اس نے سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے پلٹ کر میری

بات کاٹ دی۔ پھر اسے گویا دفعتہً یاد آ گیا۔ اور اس نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا وہ..... جو میری کزن ہے؟''

''دیکھو تو سہی۔ کیوں دی تھیں اس نے می می کو تصویریں۔ ایک نہ دو پوری آٹھ.....'' میں نے گھاس پر واپس آ کر غصے سے کہا۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے پتنگ کا یہ رویہ بہت ہی قابل گرفت ہے۔'' رفعت نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''بلکہ اس کا سیاسی اور معاشی اور نفسیاتی اور عمرانی اور بین الاقوامی پہلو بھی بہت زیادہ تابناک اور امید افزا نہیں ہے۔'' جمیلہ نے اور بھی زیادہ سنجیدگی سے سر ہلا کر ارشاد کیا۔

''لیکن واقعہ یہ ہے.....'' خالدہ توفیق نے گھاس پر سے اٹھتے ہوئے ایک جمائی لے کر کہا۔ ''زیر غور تصویریں پتنگ نے قطعی کسی کو دی دلائی نہیں تھیں۔ بلکہ ہماری می می ایک روز خود ہی تزئین کے البم میں سے نکال لائی تھی۔''

ہم سب کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

''نین تارا..... یہ تمہاری میاؤں میاؤں جو ہے.....'' میرے پیارے بھائی ٹوٹ نے کہنا شروع کیا۔ وہ جب نیکی کی جون میں ہوتا تو مجھے بڑے لاڈ سے نین تارا کہہ کر پکارتا تھا۔

''اچھا بھئی ٹوٹ چپ رہو۔'' میں نے اکتا کر کہا۔ وہ نہایت فرمانبرداری سے چپ ہو گیا۔ اور پھر آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی نئی درخواست لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ٹوٹ کا اصل نام رویندر موہن سکسینہ تھا۔ لیکن بچپن میں، جب وہ

چھوٹا سا تھا، تو ہم سب اسے ٹائینی ٹوٹ کہتے تھے بڑے ہو کر بھی ہم اسے اسی نام سے پکارتے رہے لیکن ٹائینی کے لفظ پر اس نے سخت احتجاج کیا۔ کیونکہ اس سے اس کا جذبۂ انانیت شدت سے مجروح ہوتا تھا۔ لہٰذا سب اسے صرف ٹوٹ ہی کہنے لگے۔ ہالینڈ ہال میں جب وہ تھا۔ تو اس نے سرور کے ساتھ طرح طرح کے مزیدار کورس بنائے تھے۔ جو ان دنوں رنگ لیڈرز کی یاد میں آج تک وہاں کے کومن روم میں رات کے وقت گائے جاتے ہیں۔ وہاں کے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ایک پروفیسر صاحب تھے۔ جو اردو کے شاعر تھے۔ اور اسے بہت ڈانٹا کرتے تھے ان پروفیسر صاحب کے متعلق وہ اکثر ہم سب کو بڑے دلچسپ قصے سنایا کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ انگلش لٹریچر پر اردو میں لیکچر دیتے تھے۔ اور اس طرح دیتے تھے۔ جیسے سچ مچ کا اردو ادب پڑھا رہے ہوں۔ کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ شروع کرتے ..... ''چنانچہ شیلے کی تصوری کائنات کا ابہام، استدلالی'' ..... اور لڑکے کلاس میں بیٹھے بیٹھے چپکے تصویریں بناتے یا اونگھتے۔

کلاس کی سب سے پیچھے کی کرسیوں پر بیٹھ کر لیکچرز کے دوران میں کارٹون بنانے یا اونگھنے یا کاپی پر لکھ لکھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا زمانہ زندگی کا بہترین اور سنہرا دور ہوتا ہے۔ ایسا دور جو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ اس سنہرے زمانے میں ٹوٹ نے بھی اپنی کاپیوں پر نظمیں لکھی تھیں۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ان زبردست تاریخی نظموں کا انڈین پریس یا کتابستان سے بے حد شاندار مجموعہ شائع کروائے گا۔ اور اسے معنون کرے گا۔ ان تمام بدقسمت لڑکیوں کے نام جن سے وہ اب تک عشق نہ کر سکا۔ لیکن میرے پیارے بھائی

ٹوٹ کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ اور مجموعہ شائع کرانے کے بجائے اب وہ دن رات اس فکر میں رہتا تھا۔ کہ اس مقابلے میں نکل آئے۔ اس انتخاب میں لے لیا جائے۔ اس بڑے آدمی سے تار کھنچوائے۔ ہالینڈ ہال کا قومی ترانہ بیت گئی ہے۔ اشٹمی وہ کب کا بھول چکا تھا۔ اور ہر سمے نت نئی درخواستیں لکھا کرتا تھا۔ ایک روز اس سے کسی نے پوچھا۔ ''بھائی رویندر تم کیا کرتے ہو.....؟'' تو اس نے بے حد شگفتگی سے جواب دیا۔ ''میں.....؟ پدرم ڈپٹی کلکٹر ور سسلیکشن گریڈ بوو۔ رائے بادر برجیند رموہن سکسینہ کے نام نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ جو سلیکشن گریڈ میں آئے تھے اور ڈپٹی کمشنری کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ میں ان ہی کا لائق فائق فرزند ارجمند ہوں قوم اور خاندان کو مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اب تک بائیس سندر چہتر، سوشل لکشمی، مورت، سرسوتی سمان منوہر کنیاؤں کے لئے بات آ چکی ہے۔ کشمیری پنڈت ہوتا تو فوراً فارن سروس میں بھی لے لیا جاتا۔ فی الحقیقت ایک نہایت ہی زریں مستقبل میرا انتظار کر رہا ہے۔ بس ذرا سی وائر پلنگ کی کسر ہے۔''

ٹوٹ کی وائر پلنگ اب تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھا پبلک سروس کمیشن والوں کو خط لکھ رہا تھا۔ خان بہادر ابو محمد کا انتقال ہو چکا تھا جو ہمارے برجیند رچا چا کے بہت گہرے دوست تھے۔ یہ بات میں نے اسے یاد دلائی۔ لیکن وہ نہایت مستعدی سے بیٹھا اپنی درخواست میں اپنی ساری قابلیتوں کی تفصیل لکھنے میں مصروف تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی یونین کا وہ پریذیڈنٹ رہا۔ اس نے یہ کیا اس نے وہ کیا۔ اتنے میں سرور آن پہنچا۔ وہ وائر پلنگ اور مقابلے کے

امتحانوں اور درخواستوں کے سارے بیڑے پار کر چکا تھا۔ اور اب اور آگے فارن سروس میں نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ان دنوں فارن سروس کا تذکرہ فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر تیسرا آدمی واشنگٹن، لندن، قاہرہ یا طہران جانے کے لئے تلا بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھ کر سرور نے بے حد سنجیدگی سے ایک سلیوٹ جھاڑا۔ اور بے فکری سے سیٹی بجا کر چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے اس نے ٹوٹ سے پوچھا۔ ''کیا کر رہے ہو بھائی جالینوس.....؟''

''جھک مارتا ہوں۔'' ٹوٹ نے بگڑ کر جواب دیا۔ اور پھر اپنے کاغذات پر جھک گیا۔

''کیوں بھئی کیا حال چال ہیں تمہاری می می کے.....؟'' سرور نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

''ڈوب جاؤ تم خدا کرے۔'' میں نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

''نہ گومتی اتنی گہری ہے نہ تمہارا سوئمنگ پول۔'' اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

''اتنے بے حیا ہو تم سرور.....الو.....'' میری آواز پھر رقت انگیز ہو گئی۔

''یہ تو تم لوگوں کی ہم سے بہت پرانی شکایت ہے۔ ہیں نا بھائی ٹوٹ؟ ابے یار کیا بوریت پھیلا رہے ہو۔ چلو ٹینس کھیلیں۔'' اس نے ٹوٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

ٹوٹ انتہائی بے نیازی سے کاغذوں پر جھکا رہا۔

''یار کچھ مدد کر سکتا ہوں تمہاری.....؟''سرور نے سنجیدگی سے ٹوٹ کی آرام کرسی کے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''فنانس والوں کو تو سب کو میرے ہاتھ میں سمجھو۔سرو۔نگاپام رگھواچاری سے لے کر.....''

''اماں چپ رہو یار.....''ٹوٹ نے جھنجھلا کر کہا۔سرور سیٹی بجا کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔

''اوہو ٹوٹ بھائی تم نے انگریزی بھی پڑھنی شروع کر دی؟''اس نے الماریوں میں رکھی ہوئی انگریزی ادب کی کتابوں پر نظر ڈال کر بڑی شگفتگی سے پوچھا۔

میرے پیارے بھائی ٹوٹ کو ہنسی آ گئی۔میں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ٹوٹ انگریزی کا فرسٹ کلاس فرسٹ ایم۔اے تھا۔اور ڈاکٹر دستور سے لے کر امرناتھ جھا تک کے اس کے پاس اتنے نفیس سرٹیفکیٹ موجود تھے۔

''تم تو ٹوٹ بھائی بالکل گدے ہو در اصل.....''سرور نے تھوڑی دیر بعد طے کیا۔''تم یہ کیوں نہیں کرتے کہ.....کہ.....''

''کیا.....؟''ٹوٹ نے قلم ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

''کہ بس آ جاؤ ایک دم سے مقابلے میں۔''سرور نے اسے اتنی آسان ترکیب بتادی۔

''تم بھی بس آ گئے تھے ایک دم سے۔آنکھیں بند کر کے بسم اللہ پڑھ ڈالی تھی.....؟ایں کیوں بے الو کے بھائی.....؟ٹوٹ نے بگڑ کر پوچھا۔

''جہنم میں جاؤ تم.....'' پھر سرور سے رک کر کہنا شروع کیا۔ ''بھائی میرے، ہمارے تو ابا میاں نے شہید ثالث اور خواجہ اجمیریؒ کے مزاروں پر کھوئے کے پیڑوں سے بھری ہوئی چاندی کی مٹکیوں کی منت مانی تھی۔ ممی اور نین تارا اور تزئین نے امام باڑوں میں نذریں دلوائی تھیں۔ جوگی پورے جا کر چاندی کے علم پر چڑھائے تھے۔ اور جوٹین کے چھوٹے چھوٹے خداؤں کو ایٹ ہوم دیئے گئے۔ وہ علیحدہ، تم بھی ہمارے سنٹرل اور پرووِنشل دیوتاؤں کو جل پان سے خوش کرو، پرکماں کرتے علی گنج جاؤ۔ تب جا کر کہیں بھگوان راضی ہوں گے۔ کہ ایک امپیریل سروس اور ایک چتر، سوشل، بلکہ سوشلسٹ، بالکل وجے لکشمی پنڈت سمان منوہر کنیا عنایت فرما دیں۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا.....!'' سرور نے بات ختم کر کے تحسین طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''ابے چپ رہ۔ کیا بکشا دل کشا لگا رکھی ہے۔'' ٹوٹ نے چڑ کر کہا۔

''یار خوب یاد دلایا۔ ابھی ابھی چھ بجے دلکشا کلب میں ایک بے حد ضروری کام ہے۔'' سرور برآمدے میں سے نیچے گھاس پر کود گیا۔

''وہاں میاؤں میاؤں بھی آئے گی آج.....'' ٹوٹ نے اسے پھاٹک کی طرف جاتا دیکھ کر چلا کر کہا۔

''ہیں..... کیا واقعی؟'' سرور جاتے جاتے گھبرا کر ٹھٹھک گیا۔

ٹوٹ ہنس پڑا۔ ''وہی تو میں نین تارا سے پوچھتا تھا۔ کیا یہ افواہ صحیح ہے کہ میاؤں میاؤں غم دل میں مبتلا ہو کر تارک الدنیا ہونے والی ہے۔''

''ہاں ہاں..... واللہ یہی میں نے بھی سنا ہے۔'' سرور چلایا۔ ''کہ می می ساری

دنیا تج کر دلکشا کلب کے ایک کونے میں بھگوان سے لو لگانے والی ہے بھئی واللہ کیا کیا لونڈیاں اللہ میاں نے انواع واقسام کی پیدا کی ہیں۔'' پھر وہ سیٹی بجاتا دل کشا کی طرف نکل گیا۔

''کوا بولیا بول گئے ہیں۔ زیر باد کہ ملک کے ہاتھیوں کے جنگل میں ایک برس یہ ہوں نین پڑیا۔ ہور بادل سوں ایک بوند نین ٹپکا۔ ایسا دکال پڑ گیا کہ ہاتیاں پیاس سوں لاچار ہو کر اپنے پادشاہ کے پاس قریب فریاد گئے۔ پادشاہ بول دیا کہ پانی کے خاطر چوطرف دوڑو ہور بہت ڈھونڈو۔ ہاتیاں اوس ملک کے اورس چورس میں ڈھور ڈھنڈول کر ایک گڑھا نکالے۔ کہ اس کا ناؤں چندر گڑھا تھا۔ اور بہت ڈونگا اس ائی پانی تھا۔ پادشاہ اپنا لشکر لے کر اوس میں پانی پینے گیا۔ اوس کے آس پاس تھوڑے خرگوشاں بستے تھے۔''

''کیا.....؟'' میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''ہاں..... ہور ہاتھیاں کے کدھن سوں وہ بہت ستائے جاتے تھے۔'' خالدہ توفیق نے..... جو قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی تھی۔ سامنے پڑی ہوئی ایک بے حد موٹی کتاب پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''کیا چنڈوخانے کی اڑا رہی ہو۔'' میں نے بگڑ کر کہا۔

خالدہ توفیق نے زور سے کتاب بند کر دی۔ ''کیا تم کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ اتنا صاف کہ میں اس وقت صریحاً دریائے علم کے بحر ذخار بے پایاں میں غوطہ زن ہوں۔''

میں مرعوب ہو گئی۔ اور ذرا ڈر کر اس سے کچھ دور جا بیٹھی۔

''جس وقت اے سرنجن توں.....'' خالدہ توفیق نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا میں کچھ دیر خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ پھر مجھے غصہ آ گیا۔ اور میں نے چلا کر کہا:

رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پہ روا اے ظالم
محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہووے گا!

خالدہ توفیق اپنا دریائے علم کا بحر ذخار بے پایاں سب بھول گئی۔ اور ہنستی ہوئی میرے قریب آ بیٹھی۔ ''دراصل قصہ یہ ہے۔'' اس نے کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ ''کہ آج مجھے تزئین سے پتہ چلا ہے کہ ہمارے سرور کو امور خارجہ یا اسی قسم کے کسی کارآمد محکمے کے ایک عدد سیکرٹری یا جوائنٹ سیکرٹری کی اشد ضرورت ہے۔''

''ایں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ یا کم از کم ڈپٹی سیکریٹری ہی ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''انڈر سیکرٹری سے کام چل سکے گا؟'' میں نہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس لئے پوچھ لیا کہ کہیں وہ یہ نہ خیال کر لے کہ میں بالکل ہی بیوقوف ہوں۔

''نہیں۔'' اس نے بالوں کی لٹیں ہلائیں۔

''ایک انڈر سیکرٹری تو دستیاب ہو سکتا ہے سامنے ہی رہتا ہے۔'' میں نے پھر کہا۔

''نہیں۔ کم از کم ڈپٹی سیکرٹری۔ اور جوائنٹ سیکرٹری ہو تو کیا ہی کہنے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن آخر ضرورت کیا ہے بھئی۔'' میں نے ڈرتے پوچھا۔

''ایں؟'' اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم شہر خبر و ہو ذرا سیلیفون کی

ڈائریکٹری اٹھا کر دیکھو۔کون دستیاب ہوسکتا ہے جلد از جلد۔''

''تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔خالدہ توفیق، اس کم بخت قدیم اردو ادب کی منحوس ریسرچ نے تمہیں شریفوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رکھا۔آخر ضرورت تو بتاؤ۔''میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''سنو۔''اس نے چاروں طرف بے حد پراسرار طریقے سے دیکھ کر انتہائی رازدارانہ اور سرگوشی کے لہجے میں کہا۔''دراصل پتنگ اب شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اس اب کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔''میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

''سنو تو سہی۔''اس نے بات پھر شروع کی۔

''لیکن می می؟''میں دفعتہً چلائی۔

''شوشوشو۔''وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسی پراسرار انداز سے بولی۔''چنانچہ یہ قصہ ہے دراصل۔اور اسے اس لئے کسی کارآمد سے محکمے کا ایک سیکرٹری درکار ہے یا کم از کم جوائنٹ سیکرٹری۔''

''لیکن اس کا کیا ہوگا؟''میں نے پھر انتہائی بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

''ارے.....اس کا کچھ نہیں ہوگا بھئی اس کی لڑکی سے پتنگ شادی کریگا.....''خالدہ توفیق نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''اووہو.....''میں نے اتنی دیر بعد اطمینان کا سانس لیا۔''اور می می ہماری؟''میں نے رقت بھری آواز میں پھر پوچھا۔

''شوشو.....چلو ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھالاؤ۔وزیٹر روم سے جا کر بلکہ اس ہفتے گھر جا کر سول لسٹ بھی دیکھ لینا۔''اس نے حکم لگایا۔

''لیکن میری جان سنو تو سہی۔''میں نے ہاتھ ہلا کر کہنا شروع کیا۔

''کچھ نہیں۔''اس نے میری بات کاٹ دی۔''کم از کم ایک ڈپٹی سیکرٹری۔''

''اور اگر انڈر سیکرٹری ہو۔''میں نے مظلومیت سے پوچھا۔

''قطعی نہیں۔انڈر سیکرٹری اپنے قانونی فرزند کے لئے خاطر خواہ وائر پلنگ برائے فارن سروس یا برائے مزید ترقی نہیں کر سکے گا۔''خالدہ توفیق نے جواب دیا۔

اووو.....اب تو سارا مسئلہ گویا چشم زدن میں صاف شفاف تھا۔چودہ طبق میرے سامنے بالکل روشن ہو گئے۔

خالدہ توفیق نے جلدی جلدی اپنی ساری موٹی اور دبلی کتابیں سمیٹیں۔اور ہم کومن روم میں سے نکل کر نیچے اتر آئے۔ہوسٹل کے پچھلے لان پر حسب معمول ساری قوم جمع تھی۔ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔اور چنڈو خانے کی اڑ رہی تھی۔ کچھ دور پر آم کے سائے میں می می سیمنٹ کے رولر پر بیٹھی انڈین لسنر کے ورق پلٹ رہی تھی۔ہوا میں سویٹ پی کی بھینی بھینی مہک تیر رہی تھی۔اور آسمان پر سے بشاش مرغابیوں کی قطاریں گذر رہی تھیں۔دنیا مجھے حسب معمول بے حد حسین اور فرحاں نظر آئی۔میں باغ کی نالی کی سیمنٹ کی اونچی منڈیر پر اکڑوں بیٹھ کر اس غور وفکر میں غلطاں و پیچاں ہو گئی کہ اس تازہ نقطۂ نظر سے پتنگ کے لئے کون سا سیکرٹری مناسب ترین رہے گا۔

''می می ڈیر۔''رفعت جمائی لے کر گھاس پر لوٹ لگاتے ہوئے پکاری۔''بھئی تمہارا وہ تاریخی دعوت نامہ ہمیں کب ملے گا۔ہم تو اس کے انتظار سے واللہ بور ہو

گئے۔''

''ہاں واقعی می می ڈارلنگ۔''جمیلہ نے چلغوزے کھاتے کھاتے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔''اتنی بوریت پھیلا رکھی ہے تم نے.....''

''ہم لوگ بر دکھوے کے لئے چل رہے ہیں نا؟''میں نے خوش ہو کر تزئین سے پوچھا۔

''ارے بیوقوف بر دکھوا تو لڑکوں کا ہوتا ہے۔ہم تو لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔'' تزئین نے مجھے سمجھایا۔سیکرٹریوں اور جوائنٹ سیکرٹریوں کی تلاش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی گئی تھی۔اور بڑی مشکلوں سے ایک خاطر خواہ ڈپٹی سیکرٹری دستیاب ہوئے تھے۔لیکن ان کی صاحبزادی بلند اقبال خاطر خواہ نہ تھیں۔عینک لگاتی تھیں اور شکل سے لگتا تھا کہ اس دنیائے فانی کی ٹریجڈی پر غور فکر کرتے کرتے بس اب رو پڑیں گی۔

لاحول بھیجو تزئین۔ہمارے ایسے شگفتہ،ہشاش اور کھلنڈرے سرور کے لئے ایسی فلاسفر جالینوس لڑکی۔حد کرتی ہو۔''میں نے کہا۔

''مگر سنو تو سہی۔اس کے ابا میں خاص الخاص امور خارجہ کے محکمے میں ہیں۔ اور تم جانو۔وہ جلد از جلد کسی سفارت خانے کا اٹیچی کیس یا کم از کم سیکنڈ سیکرٹری تو بن ہی جائے گا۔''خالدہ توفیق نے کہا۔

چنانچہ ہم تینوں،لڑکے کی بہنوں کی قابل رشک حیثیت سے،خوب سنگھار پٹار کر کے،ایک بڑی سی موٹر یا میں بیٹھ کر،سب پر شان جھاڑتے لڑکی والوں کے گھر پہنچے۔اور لڑکی کے ابا میاں سے ملاقات کی۔اس کی عمر چالیس سے ستر سال تک

کی رہی ہوگی۔اور بے حد رعب دار آدمی، باتیں کرتے تو لگتا کہ بگڑے ہوئے پیانو کے نیچے کے سر بج رہے ہیں۔ہم ان کے خوش اخلاق لڑکوں اور بلیوں اور خرگوشوں سے متعارف ہوئے۔

لڑکی کے ابا میں نے پوچھا۔لڑکا کے بجے سو کر اٹھتا ہے۔کلب سے کے بجے رات کے گھر لوٹتا ہے۔دن میں کتنے سگریٹ پیتا ہے۔اور کون کون سے پیتا ہے۔ فائیو فائیو۔عبداللہ۔تھری کاسلز؟''

''دراصل وہ سگریٹوں کے معاملے میں بے حد پرولتاری واقع ہوا ہے۔''میں نے گلا صاف کر کے جواب دیا۔''اونٹ۔ہاتھی۔سب پی لیتا ہے۔''

''تاش کھیلتا ہے؟اندازاً کے سو روپے ماہوار برج اور فلاش میں ہارتا ہے۔اور کون کون سے کھیل کھیلتا ہے؟''انہوں نے سوال کیا۔

''سب کھیل آویں ہیں اس کو۔ترپ چال۔تہ پتا۔کوٹ پیس..... میں نے بے حد مستعدی سے بتانا شروع کیا۔لیکن تزئین اور خالدہ توفیق نے ایسی کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا کہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

ڈپٹی سیکرٹری صاحب ایک لمبی اور غیر مطمئن 'ہوں' کے بعد دوسری طرف متوجہ ہوئے۔لڑکا کس قسم کا سید ہے۔جعفری زیدی۔نقوی۔رضوی۔بنا ہوا سید تو نہیں ہے اور اس کے علاوہ ملت جعفریہ کے کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔شش امامی۔ اثنا عشری۔آغا خانی؟

میں یہ سب سن کر سٹ پٹا گئی۔آغا خانی گھوڑے اور آغا خانہ ہیرے اور ہز ہائی نس دی بیگم آغا خان اور پرنس علی خاں۔سب میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گئے۔

اس ضروری گفتگو سے نپٹ کر ہم اندر گئے اور لڑکی کے منہ میں مصری کی ڈلی اور پان رکھا۔ امام ضامن باندھا۔ انگوٹھی پہنائی۔ اس کے بعد اس فلاسفر لڑکی کا ہم سے باضابطہ پردہ کرایا گیا۔ اور میں نے تصور پر سخت زور ڈالنے کی کوشش کی کہ یہ بقراط اور ارسطو کی نواسی اپنی سیاہ فریم کی عینک کے ساتھ جھومر ٹیکے اور فرشی پائجامے میں کیا سجے گی۔ سارے کپڑے اس پر اپنی جان کو روئیں گے۔ ممکن ہے بعد میں سرور بھی اپنی جان کو روئے۔ لیکن بہر حال اس وقت تو وہ بالکل مطمئن تھا۔ اس کے گھر والے خوش تھے۔ ہم سب خوش تھے۔ اس کا مستقبل اپنے ہونے والے قانونی ابا میاں کے دفتر کے شاہ بلوط کے میز پر بالکل محفوظ اور بے حد شاندار تھا۔

شام کو ہوسٹل کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ می می ہمارے گھر آئی۔ مارگریٹ نے اس سے کہا:

''سنا تم نے می می ڈیر۔ پتنگ بھی دوسری ڈومینین کو بھاگا جا رہا ہے۔ کل نین تارا سے ملنے ہوسٹل گیا تھا۔ اس وقت تم کہیں باہر جا چکی تھیں۔ اس وقت وہ ابھی ابھی یہاں موجود تھا۔ لیکن تم غائب تھیں۔ اب تم آئیں تو وہ کھسک گیا۔''

''ہاں۔ وہ ہمیشہ اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔'' می می نے زبردستی کی شگفتگی سے جواب دیا۔ ''میں مسوری میں تھی۔ وہ فرض کر کے شملے چلا گیا۔ اور جب میں مسوری ..... سے لوٹی تو ایسا اتفاق ہوا کہ وہ وہاں پہنچا۔''

''یہ می می جو ہے۔ یہ اس سال مسوری صرف ایک ہفتے کے لئے گئی تھی۔ اور پرنس ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ لیکن ''سوائے'' میں رہنے والی ایک دوست کے پاس جا

کراس نے ''سوائے'' کے رائٹنگ پیڈ پر ان پانچ چھ دنوں میں اپنے سب دوستوں اور جاننے والوں کو خط لکھے تھے۔ اس کا ایک خط میرے پاس بھی آیا تھا۔'' جمیلہ نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

''ارے ہائے ..... می می ..... می می ..... ''میں نے آہستہ سے کہا۔

''میاؤں میاؤں ..... ''ٹوٹ نے کاغذوں پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔

''می می ..... می می ..... آہ مجھے محض ان ہی کمزوریوں اور حماقتوں کی وجہ سے انسانیت سے اتنی محبت ہے۔'' میں نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔

''کیا .....؟ یہ کس کا مقولہ ہے .....؟'' ٹوٹ نے اپنے مراقبے سے چونک کر پوچھا۔

''میرا .....!'' میں نے نہایت شگفتگی سے اسے بتایا۔ وہ چپ ہو گیا۔

''وہ وقت عنقریب آنے والا ہے۔ اے میرے پیارے بھائی ٹوٹ کہ جب میرے سارے زریں اقوال کو جمع کر کے ایک صحیفہ نادر مرتب کیا جاوے گا۔ اور اس خاکسار کے سارے کلاسیکل کوٹیشنز کی ایک ڈکشنری تیار ہو گی۔ اور بعد میرے مرنے کے تم سب احمقوں کو میری قدر آئے گی۔ اور تم کو پتہ چلے گا کہ یہ فدوی کن خوبیوں کا انسان تھا۔'' میں نے سنجیدگی سے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے اس سے کہا۔

''اللہ رے مغالطے۔'' اس نے بے انتہا ترس کھا کے جواب دیا۔

''ارے اب تو بالکل ہی گجب ہو گیا۔'' رفعت نے اندر کودتے ہوئے چلا کر کہا۔

''کیا .....؟'' میں نے مری ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ بقراط اور ارسطو کی نواسی کے ابا میاں کا عہدہ کیا ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں حکومت کے غیر معمولی گزٹ کا تازہ ترین پرچہ تھا۔ جو اسی شام ریلیز ہوا تھا۔

''کیوں؟'' ہم سب نے دھڑکتے اور ڈوبتے ہوئے دلوں کے ساتھ پوچھا۔

''اس کے ابا میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں نا؟ سلطانہ کے ابا میاں سیکرٹری ہو گئے۔'' رفعت نے گزٹ کا پرچہ ہمارے سامنے پھینک کر کہا۔ اور دریچے میں جا بیٹھی اور ڈھولک اٹھا کر ''بریلی کے بجار میں'' الاپنے لگی۔

سرور کی سقراط اور بقراط کی نواسی سے منگنی ٹوٹ گئی۔

اگلی صبح کے اخباروں میں بھی سلطانہ کے ابا میں کے متعلق یہ اطلاع شائع ہوگئی پھر روز بروز ان کے متعلق نئی نئی خبریں چھپنے لگیں۔ ملک کے سیاسی حالات کی تبدیلیوں اور بٹوارے کے نت نئے انتظامات کے ساتھ سلطانہ کے ابا میاں کے عہدے میں ترقی ہوتی جا رہی تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ صبح کے وقت ڈائننگ ہال کی سب سے آخری میز پر چائے کے بعد تازہ اخبار سامنے رکھ کر چنڈو خانے کا باقاعدہ سنڈیکیٹ بیٹھتا اور سیاسی پیشین گوئیاں کی جاتیں اور ان واقعات اور امکانات پر تبصرہ ہوتا۔ جس کا اثر سرور کی شادی اور فارن سروس کے انتخاب کے مسئلے پر پڑ سکتا تھا۔

''ارے ہائے۔'' ایک روز اخبار پر نظر ڈالتے ہوئے خالدہ توفیق چلائی۔

''اب کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو معاملہ بالکل ہاتھ سے نکلا سمجھو۔ یہ دیکھو سلطانہ کے ابا میں کو سفارت

خانے کے بےحد اہم عہدے کے لئے ٹپ کیا جا رہا ہے۔'' اس نے رقت انگیز آواز میں کہا۔

''ہائیں ہائیں؟'' میں نے آنکھیں پھیلا کر ٹوسٹ بڑی مشکل سے نگلا۔

''لو پانی پیو۔'' جمیلہ نے انتہائی مایوسی اور قناعت کے عالم میں گلاس میری طرف سرکا دیا۔

''لیکن می می ڈارلنگ۔'' ریحانہ کی آواز اس کے حلق میں رہ گئی۔

''کچھ اور فکر کی جائے گی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔'' رفعت نے ارشاد کیا۔

''لیکن واقعی اب کے سے ایسی زور کی آندھی آئی ہے کہ پتنگ بالکل ہی اڑ گئی۔'' جمیلہ نے تاسف کے ساتھ کہا۔

میں خاموشی سے ان سب کو دیکھتی رہی۔ پھر میں نے نہایت خوش الحانی اور رقت کے ساتھ عرض کی:

ارے آندھی چلی اڑ جاویں گے رنگ چوں چوں چوں
پانی پڑا بہہ جاویں گے رنگ چوں چوں چوں
ارے آگ لگی جل جاویں گے رنگ چوں چوں چوں

داد تحسین کے شور سے ڈائننگ ہال گونج اٹھا۔ دوسری میزوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگیں۔

''پھر تم لوگوں نے می می کی ٹانگ کھینچنی شروع کی۔ بجائے اس کے کہ ہمدردی سے کوئی ترکیب سوچو۔ ڈوب جاؤ تم سب۔'' مارگریٹ نے ڈانٹا۔

''سنو بھئی۔'' میں نے کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر سب کو مخاطب کیا۔

''ہاں ہاں۔ اب اوریکل آف ڈیلفی بول رہی ہے۔ اس کی سنو پہلے۔''
انہوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

اس خطاب کے لئے جو انگلش کے ایم۔ اے کی لڑکیوں نے بہت پہلے سے اورمرل اور بیرون کی نئی رنگین فلم۔ ''جنت میں ایک رات'' دیکھنے کے بعد سے دوسری لڑکیوں نے مجھے دے رکھا تھا۔ میں جھک کر تسلیم بجالائی۔ اور پھر گلا صاف کرکے شروع کیا۔ ''اے محترم و بےوقوف خواتینو..... اس نہایت نازک موقع پر کیا بلیک میلنگ سے کچھ مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یعنی شکاگو اسٹائل کا ایک رقیب روسیاہ اگر کہیں سے نمودار ہو جائے اور سرور کے مقابلہ پر آ کر ترنت سے سلطانہ سے شادی کرلے۔''

''کیوں کرلے، تمہارا کیا کوئی اجارہ ہے؟'' ظاہر تھا کہ ریحانہ کو یہ تجویز بالکل نہیں جچی۔

''ایں.....؟ اب میں اوریکل آف ڈیلفی ہوں کہ نہیں.....!'' میں نے بگڑ کر دریافت کیا۔

''بالکل ہو..... ٹھیک تو ہے۔ ارے ہاں اب یہی کہ سلطانہ کسی اور کے ساتھ محبت میں گر جائے۔ اور می می ہماری کے لئے مطلع صاف.....'' جمیلہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

''مگر کس کے ساتھ بھئی.....؟'' نرملا نے پوچھا۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ کیونکہ مصیبت یہ تھی کہ سرور کے مقابلے پر اور کوئی پتنگ ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ بس ایک دو دن بہار جانفزا دکھلا کر غائب۔ افق پر ہر طرف بھائی سرور ہی سرور نظر آتے تھے۔

''تم شہر خبر و ہو۔ ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے ایک رقیب روسیاہ۔'' جمیلہ نے مجھ سے کہا۔

''اس ہفتہ اپنے گھر جاتے ہی سول لسٹ دیکھو۔'' خالدہ توفیق نے پھر حکم لگایا۔

خوش قسمتی سے اگلے روز ہی رفعت یہ خیر لائی کہ ایک سچ مچ کا بے گلنام رقیت روسیاہ جو دھاری دار پتلون اور ٹیل کوٹ پہنتا ہے اور مونوکل لگاتا ہے۔ کل شام کلب میں سیکرٹری صاحب کے ساتھ نظر آیا تھا۔ اور فارن سروس میں اس کے لئے جانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ سلطانہ کے ابا میاں کی توجہ اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ کیونکہ انہیں کھلاڑی اور شہسوار اور اسپورٹس مین قسم کے انسان بہت مرغوب ہیں۔ اور رقیب بالکل جولوئی کا بھتیجا اور ڈون بریڈ مین کا نواسا اور غوث محمد کا چھوٹا بھائی ہے اور معتبر حلقوں میں یہ افواہ گرم ہے کہ آنے والے ٹینس ٹورنامنٹ میں سرور اور رقیب میں سے جو جیتے گا وہی سکتر صاحب کا منظور نظر قرار پائے گا۔

یہ ساری تفصیلات معلوم کر کے ہم لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

اگلے ہفتہ سالانہ ٹینس ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ ٹوٹ میرے پاس بھاگا بھاگا آیا۔ ''سرور کی مورل سپورٹ کے لئے ہم سب کا ٹورنامنٹ میں شرکت کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ سنا ہے۔ رقیب روسیاہ بے حد قابل کھلاڑی ہے۔''

''ٹوٹ میں شامل تو ضروری ہوتی۔ لیکن مجھے اپنی عاقبت نظر آ رہی ہے۔ اتنے بڑے مجمع میں ریکٹ اٹھاتے ہی میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے

گی۔''میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''عاقبت واقبت کچھ نہیں۔''ٹوٹ نے ڈپٹ کر کہا۔''کھینچ تان کر کسی طرح سیمی فائینلز تک تو پہنچ ہی جاؤ گی۔ آگے کا خدا حافظ ہے۔ ذرا غور فرماؤ کہ اس نازک وقت میں سرور کی مورل سپورٹ۔''

مجھے بھی جوش آ گیا۔اور یہ قطعی یاد نہ رہا کہ ہماری پالیسی یہ تھی کہ سرور ہار جائے۔''ضرور شامل ہوں گی۔لکھو میرا نام۔''میں نے چلا کر کہا۔اس نے فارم نکال کر میرے سامنے رکھا۔''لکھو مخدوم زادی سیدہ آنسہ''میں نے کہنا شروع کیا۔

''کیا خرافات ہے۔ٹھیک سے سیدھا سادا اپنا نام لکھنے دو۔ٹوٹ نے قلم روک کر کہا۔

مجھے جلال آ گیا۔اوکافر بچے۔اوموذی۔اودشمن ایمان ودیں۔ہند میں اسی لئے ساری نمازیں تیری نذر ہو گئیں۔''میں نے چلا کر کہا۔ارے کیا تو نہیں جانتا۔میرے نگڑ نانا نعمت خاں عالی جو شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر اعظم تھے۔ کس قدر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔اور میں خود ہندو بچے! اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں سالک ہوں۔ بہت جلد ابدال بن جاؤں گی۔پھر قطب۔کہ قطب اس دنیائے فانی میں صرف چار ہیں جن کے دم سے یہ دنیا قائم ہے۔ورنہ کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ایک قطب تو میں خود بننے والی ہوں۔ باقی کے تین کا پتہ نہیں۔ اور جناتوں کو میں تابع کرتی ہوں۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود جنات ہوں۔ میں سانس لینے کے لئے اک ذرا کی ذرا رکی۔''کسی کو میری

روحانیت پر شبہ کرنے کی کیا گنجائش ہے۔ کیا تو نے نہیں سنا او بیوقوف کائسیتھ بچے کہ.....''

ٹوٹ نے چپکے سے میرا نام لکھ لیا اور سر پٹ جم خانہ کی طرف واپس بھاگا۔ شام کو سنا گیا کہ وہ بے حد فکرمندی سے جمیلہ سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ اس خالدہ توفیق کے ساتھ رہتے رہتے ہماری بچاری نین تارا کے دماغ کی چول بھی ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔''

فائنلز کا دن بھی آ پہنچا۔ جم خانہ میں بڑی خلقت جمع ہوئی۔ بہت سے تماشائی دوربین لے کر درختوں پر چڑھ گئے۔ ہر طرف کیمرے، لڑکیاں اور پریس والے نظر آ رہے تھے۔ سنگلز شروع ہونے سے پہلے دونوں کھلاڑیوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ گلے مل کر خوب روئے اور پھر کھیل شروع ہوا۔

مجھے لائنز وومن بنایا گیا تھا۔ بے حد پیارا موسم تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی گاتی گنگناتی غنودگی ایسی پھیل رہی تھی۔ کھیل دیکھنے کے بجائے میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے پورے وقت سوتی رہی۔ جم خانہ آنے سے پہلے ہوسٹل میں جو چنڈوخانہ کلب کی اہم میٹنگ ہوئی تھی۔ اس میں پہلے ہی یہ طے کرلیا گیا تھا کہ اگر سرور ہار گیا تو برگد والے شہید مرد کے مزار پر پانچ پیسے کی کھٹیاں چڑھائی جائیں۔ اس لئے اس طرف سے اطمینان تھا۔

مجمع کی مستقل مدھم بھنبھناہٹ، تالیوں کی آوازیں، ہمت افزائی کے نعرے، لڑکیوں کی باریک باریک تعریف یا افسوس کا اظہار کرنے والی چیخیں۔ چاروں طرف میرے اردگرد تیرتی رہیں۔ پھر یکایک خواب میں کچھ ایسا نظر آیا گویا کہیں

فرقہ وارانہ فساد ہو رہا ہے۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور چپکے سے جمائی لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ مجمع کی ساری آوازیں ایک ساتھ مل کر زرو شور سے 'ان آؤٹ' کی تکرار کر رہی تھیں۔ پھر دفعتہً بہت سارے لوگ میری طرف دوڑے۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''آؤٹ.....آؤٹ.....؟''

''ان.....ان.....؟؟''

''ایں.....؟؟؟''میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''رقیب لیڈ کر رہا ہے۔ صرف ایک پوائنٹ اور اسکور کرنا ہے۔ اب پتہ نہیں گیند ان تھی یا آؤٹ۔'' خالدہ توفیق نے تیزی سے میرے قریب آ کر جلدی جلدی بتایا۔

''ان.....ان.....'' رقیب کے طرفدار چلائے۔ رپورٹر اور تماشائی اور لڑکیاں کیمرے سنبھال کر رقیب کی طرف دوڑے۔

''ہاؤ سویٹ۔ ہاؤ ڈیشنگ۔ مہربانی سے اپنا پروفائیل دیجئے گا۔ تھری کوارٹرز.....شکریہ.....اک ذرہ مسکرائیے گا.....ہاؤ کلنگ.....''لڑکیوں نے سرگوشی کی۔ اس پر دستخط کر دیجئے۔ میں ہمیشہ مک لین استعمال کرتا ہوں۔ اصفہانی میری پسندیدہ چائے ہے۔ رقیب کے چاروں طرف مجمع زیادہ ہوتا گیا۔

''ہا..... اہو.....!! جالی چھلانگ کر سرور سب کے سامنے آ گیا۔

''ہوہ.....!!''وہ چلایا۔

''سرور بھائی اتنے ان اسپورٹنگ نہ ہو۔ جاؤ رقیب سے جا کر ہاتھ ملاؤ۔

کیمرے والے منتظر کھڑے ہیں۔ وہی ٹائرن پاور والی مسکراہٹ لاؤ ہونٹوں پر شاباش۔'' خالدہ توفیق خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوئے اس سے بولی۔ سب لڑکیوں نے می می کو گھیر لیا۔

''ہوہ.....! ان اسپورٹنگ مائی فٹ.....! یہ سراسر بے ایمانی ہے۔ گیند صفا آؤٹ تھی۔'' سرور غرا کے بولا۔

''آؤٹ.....آؤٹ.....'' سرور کے طرفدار چلائے۔

''ریفری کہاں ہے، بلاؤ ریفری کو۔'' مجمع نے ایک ساتھ آواز بلند کی۔

ٹوٹ غریب ایک اونچی سی کرسی پر ہوا میں معلق تھا۔

''ارے یہ تو وریندر سکسینہ ہے۔ سرور کا دوست۔''

''ہونہہ..... چور کے گواہ گرہ کٹ۔'' مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ وہ سب پھر میری طرف دوڑے۔

''میں قطعی گرہ کٹ نہیں ہوں۔'' میں نے سٹ پٹا کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ دھوپ تیزی سے میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کر کے سامنے کے اس دیوانے منظر کو غور سے دیکھنا چاہا۔ ایسا باؤلا چنڈوخانے کا کھیل بھلا کبھی کا ہے کو ہوگا۔ یہ سب ہماری دعاؤں کی برکت تھی۔ شور میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ ایسی اچھی نیند سے کم بختوں نے جگا دیا۔ جہنم میں جائے می می اور سرور اور سب گدھے۔ میری طرف سے سرور سلطانہ سے پچاس دفعہ شادی کر لے۔ مار ایک قیامت کی مچا رکھی ہے۔

''لائنز وومن کو بلاؤ۔ لائنز وومن سے پوچھو۔ کہاں ہیں مس.....'' سب کے سب میری کرسی کے گرد جمع ہو گئے۔ ''سنئے مس.....''

''ارے اتنا چلا کیوں رہے ہیں آپ لوگ۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''مجھے نہیں پتہ گیند لائن سے باہر گری تھی یا جہنم میں چلی گئی تھی۔''

''آپ کو پتہ نہیں تو آپ لائنز وومن کیوں بنی تھیں۔ واہ صاحب یہ اچھی ادا ہے۔'' لوگوں نے ایک دوسرے سے غصے سے کہا۔

میں نے جمائی لے کر پھر اپنا خواب وہیں سے جوڑ لینا چاہا، جہاں سے ان بدتمیزوں کے شور سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ دراصل اس وقت مجھے اپنا تالاب شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اور میں اتنے اچھے اچھے خواب دیکھ رہی تھی کہ بہت سے، اونچے اونچے قلعوں کے برابر چوکولیٹ کیک ہیں جو میں خوب کھا رہی ہوں۔ اور کوکو کا ایک پورا حوض بھرا ہوا ہے۔ اور گرم گرم سموسے اور نیلی پہاڑیوں کے پردے والی جھیل اور شیفون کی ساریاں۔ ڈھیروں شیفون کی نئی نئی ساریاں، میں پھر سو گئی۔

اس کے بعد ٹھیک سے پتہ نہیں کیا ہوا۔ سنا گیا کہ پریس اور مووی ٹون نیوز والوں نے سٹ ڈاؤن اسٹرائیک کر دی کہ اتنا معرکہ کا تاریخی کھیل ہو رہا تھا۔ اور یہ کیا قیامت ہے کہ یہی طے نہیں ہو پایا کہ کون جیتا۔ آخر کار جم خانہ والوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اور طے پایا کہ دوبارہ کھیلا جائے۔

دوسری بار میں سرور جیت گیا۔

ہم سب انتہائی شکستہ دلوں کے ساتھ ہوسٹل واپس آئے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' خالدہ توفیق نے انتہائی ٹریجک انداز سے پوچھا۔

''لاؤ پانچ پیسے تو نکالو۔''جمیلہ نے بہت دیر بعد سرد آہ بھر کے مجھ سے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔''سرور تو جیت گیا۔'' مجھے اپنی روحانیت اور جنات پن پر سے یقین اٹھتا جا رہا تھا۔

''ارے لاؤ پانچ پیسے کی کھٹیاں چڑھائے دیتے ہیں، اللہ میاں کے ہاں ریزرو رہیں تو وقت بے وقت کام آئیں گی۔کیا پتہ اب بھی کوئی ایسی وجہ نکل آئے کہ سلطانہ کی سرور سے شادی نہ ہو سکے۔اللہ بڑا کارساز ہے۔''جمیلہ نے بالکل قلندرانہ شان سے کہا۔مجھ پر بھی رقت طاری ہوگئی۔

واقعی اللہ بڑا کارساز ہے۔اس ویک اینڈ پر جب میں گھر سے ہوسٹل واپس آ رہی تھی۔تو میرے پیارے بھائی ٹوٹ کا فون آیا۔''ارے نین تارا''وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔''سنا کیا قیامت گذر گئی۔''

''کیا ہوا.....؟ رقیب روسیاہ نے خودکشی کر لی؟''میں نے پوچھا۔

''اے نہیں تمہاری سلطانہ جو ہے۔''

''سلطانہ۔کیا ہوا؟''

''ارے زباں پہ بارخدایا یہ کس کا نام آیا۔نین تارا مجھے واللہ اب تک معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سلطانہ کس قدر۔بس کیا بتاؤں۔فتنہ ہے فتنۂ قیامت ہے۔اسے کیا کہئے۔''

''ایں.....؟''

''ہاں سنو تو۔اس سے سیاسی پیچیدگیاں تو یقیناً پیدا ہوں گی۔لیکن قسمت میں یوں ہی تھا کہ آج صبح جبکہ ہندوستان کی گھڑیوں کے مطابق نو بجے تھے۔میں

سلطانہ کے ساتھ انتہائی شدید عشق میں گرجاؤں۔ چنانچہ میں گر گیا۔ اور اب اٹھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ موت کا ایک دن معین ہے تو وہ رات کے وقت کیوں آئے گی۔ اس سے تم پیاری نین تارا یہ مطلب نہ نکالنا کہ خدانخواستہ میرے دماغ کی بھی کوئی چول ڈھیلی ہوگئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سلطانہ..... زباں پہ بار خدایا۔''

میں نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ اور فوراً خالدہ توفیق کو رنگ کیا۔ سنا تم نے خالدہ توفیق۔'' میں نے جلدی جلدی بات شروع کی۔ لیکن خالدہ کوئی خبر سنانے کے لئے مجھ سے زیادہ بیتاب معلوم ہوتی تھی۔

''آج کا اخبار دیکھا تم نے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟'' یقیناً واقعات نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔

''سلطانہ کے ابا میں ٹمبکٹو کے سفارت خانے کے شارواافیر زہو گئے۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور میں بے ہوش ہوگئی۔

اتوار کے روز ہم لوگ دن بھر یہ پروگرام بناتے رہے کہ سلطانہ، سرور ویڈنگ میں کیا پہن کر جائیں گے۔

ایک روز میں اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھی، آئی۔ اے رچرڈز کی نفسیاتی تنقید پر ایک انتہائی ضخیم اور منحوس کتاب سے دماغ لڑانے کی کوشش میں مشغول تھی۔ کہ می می آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ہلو می می ڈارلنگ.....'' میں نے کتاب پر سے سر اٹھائے بغیر اس سے کہا۔

''ہلو.....'' وہ چپ رہی۔تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔پھر میں نے سوچا۔اس سے باتیں کرنی چاہئیں۔کتاب بند کرنے کے بعد بازو پھیلا کر ایک زوردار اور تھکی ہوئی انگڑائی لے کر، کیونکہ پچھلے ہفتے اتنے ہنگامہ خیز گذرے تھے میں نے گفتگو کا کوئی موضوع سوچنا چاہا۔

''نین تارا.....'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''فرماؤ.....'' میں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

''اس وقت تم سو بر ہو.....؟'' اس نے رک کر، مجھے اپنی کاہل پراسرار اور رنجیدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سو بر.....؟'' میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''تو کیا تمہارے نزدیک میں ہمیشہ ہی دیوان پنے کی باتیں کرتی ہوں؟ میں تو بہت سنجیدہ فلسفی بقراط جالینوس آدمی ہوں بھائی.....!!''

وہ خاموش رہی۔پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔''کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں بہت دکھی ہوں.....؟ معلوم ہے تمہیں.....؟ نہیں تم یہ نہیں جان سکتیں۔تم جو ہر وقت پکچرز اور ٹینس، اور سوئمینگ کی حماقت خیز اور فضول باتیں کرتی رہتی ہو۔تم نہیں سمجھ سکتیں شاید اسی تم نین تارا ہو۔''

وہ آج پہلی بار مجھے نین تارا کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''سنا تم نے نین تارا'' وہ کہتی رہی۔مجھے تمہارا نام بہت پسند ہے۔مجھے اتنی بہت سی چیزیں پسند ہیں۔خوبصورت نام۔خوبصورت باتیں۔خوبصورت کائنات۔تم ٹھیک کہتی تھیں۔کائنات بے حد حسین ہے۔لیکن اس حسین کائنات

میں دکھی انسانوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس سے اس کے حسن پر حرف آتا ہے۔''

''سنو می می.....'' میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ کیا تم سچ مچ اپنے آپ کو اتنا دکھی سمجھتی ہو.....؟''

وہ خاموش رہی اور نظریں گھما کر دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں درختوں کے پتے بارش کے پانی میں جھکے جا رہے تھے۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے کاہلی سے کشنوں پر بازو پھیلا دیئے۔ اور فرش پر اوندھے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ می می، می می بہت دکھی تھی۔ یا اللہ..... میں اسی طرح لیٹی رہی۔ اور سکون اور آرام کے ساتھ آنکھیں بند کئے مجھے اس وقت دفعتہً وہ لڑکی یاد آئی۔ جو کچھ عرصہ ہوا میں نے ریڈیو اسٹیشن پر دیکھی تھی اس روز جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ اسٹوڈیو میں ایک طرف کو چپ چاپ اور اکیلی بیٹھی بے دھیانی سے کچھ گنگنا رہی تھی۔ جب میں نے ہیڈفون اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے دیکھا۔ مجھے ان لوگوں سے چڑ تھی۔ اس کی آنکھیں گلابی تھیں۔ لپ اسٹک کا رنگ بے حد شوخ تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی روپہلے ستاروں والی ساری پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں بڑا سا ریشمی رومال تھا۔ جس سے وہ اپنے چہرے کی نمی خشک کرتی تھی تو اس کی چوڑیاں بار بار کھنکھنا جاتی تھیں۔ مجھے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر سخت الجھن ہوئی۔ اس وقت تک پروفیشنل گانے والیوں کو ریڈیو پر گانے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ریڈیو اسٹیشن پر آتی تھیں۔ اور ہمارے اسٹوڈیوز سے باہر نکلنے کے بعد اندر جاتی

تھیں۔ یا پہلو کے کسی برآمدے میں یا پچھلے لان کے خیمے میں تخت پر بیٹھ کر اپنے سازندوں کے ساتھ گانے کی دھیرے دھیرے مشق کرتی رہتی تھیں۔ یا اسٹوڈیوز کی اسٹینڈ بائی قسم کی مخلوق کو پان کھلاتی تھیں۔ وہ میرے پاس اسی طرح کھڑی رہی پھر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی رنجیدہ آواز میں کہا۔ ''آج شام کو آپ اناؤنس کیجئے گا۔''

''جی نہیں۔'' میں نے بادل نخواستہ مختصر سا جواب دیا۔ اور پھر گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور مائیک پر جا کر کنٹرول والوں سے کہا۔ ''مجھے پانچ منٹ بعد یہ اسٹوڈیو چاہئے۔''

وہاں سے جواب آیا۔ ''بہت اچھا۔''

وہ پھر وہیں کھڑی رہی۔ میں نے دوبارہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر بے تعلقی سے کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ تاکہ کسی طرح یہ عورت سمجھ جائے کہ اس کی موجودگی مجھے ناگوار گذر رہی ہے۔ ایک چپراسی اندر آیا۔ میں جان کر بے حد جھنجھلا کر چلائی۔ شاہ صاحب کہاں ہیں۔ بھیجو انہیں فوراً۔ میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔'' چپراسی باہر چلا گیا۔ میں پھر مائیک پر جا کر چلائی۔ ''مجھے نمبر ون ابھی چاہیے۔ یہاں کسی اور پروگرام کی ریہرسل نہیں ہوگی۔'' وہ پھر بھی میز کے قریب لیمپ کے نیچے کھڑی رنجیدہ نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ آخر تنگ آ کر میں کھڑی ہو گئی۔ ''میں یہاں سے چلی جاؤں؟'' اس نے رسان سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ بیٹھی رہئے۔'' میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''آپ کا پروگرام کس وقت ہے؟'' میں نے عاجز آ کر اس سے پوچھا۔ ''میں

..... میں آٹھ بجے عشرت رحمانی کے سنگیت روپک میں گاؤں گی۔'' اس نے گھٹنے ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ یہاں کیا کرتی ہیں؟'' کچھ وقفے کے بعد اس نے پوچھا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ اور میں خاموشی سے اسکرپٹ کے کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ پھر یک لخت اس نے دھیرے دھیرے گنگنانا شروع کر دیا۔

ستم گر تیرے لئے ..... میں نے لاکھوں کے بول سہے

میں نے ..... لاکھوں کے بول سہے .....

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ دیر تک اسی طرح گنگناتی اور اپنی بڑی بڑی گلابی آنکھیں سستی سے ادھر ادھر گھما کر دیکھتی رہی۔ آخر میں تنگ آ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ چند روز بعد وہ پھر مجھے اسی اسٹوڈیو میں نظر آئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بے حد دلآویز طریقے سے مجھے سلام کیا گویا میری بہت پرانی دوست ہے اور اسی پراسرار انداز سے پھر میری میز کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ''آج آپ کون سے ریکارڈ بجا رہی ہیں؟ سہگل کا کوئی گانا گائیے۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس روز بھی وہ یقیناً پئے ہوئے تھی۔ اور اس کی سرخ زرتار ساری اصغر علی محمد علی کے ہاں کی کسی تیز خوشبو سے مہک رہی تھی۔ باہر آ کر میں نے ایک پی۔ اے سے کہا۔ تم ان لوگوں کو بلاضرورت کیوں اندر آ جانے دیتے ہو۔'' ارے وہ تو بچاری بڑی شریف لڑکی ہے۔ بہت دکھی ہے اس نے جواب دیا۔ اور ڈھیلے ڈھیلے قدم رکھتا آگے چلا گیا۔ میں جھنجھلا اٹھی۔ کیا مصیبت ہے۔ می می دکھی ہے۔ ٹوٹ دکھی ہے۔ یہ کمبخت دکھی ہے۔ اسے کیا دکھ ہے۔ پھر جب میں ریکارڈ لگا لگا کر ٹسٹ کر رہی تھی۔ اس نے ایک ریکارڈ کے ساتھ آہستہ

آہستہ گانا شروع کر دیا۔ یہ قطعی نا قابل برداشت تھا۔ میں نے ترشی سے کہا۔ ''مہربانی سے کام میں مخل نہ ہوئیے۔''

''بہت اچھا۔'' اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ اور چپ ہوگئی۔ پھر یک لخت اس نے رونا شروع کر دیا۔ ''اللہ۔ کیا مصیبت ہے۔ بھئی خدا کے لئے کسی طرح اسے یہاں سے نکالو۔'' میں نے ایک چپراسی سے کہا۔

اس کی گلابی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے رہے۔ پھر دفعتہً وہ خود ہی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔ وہ مجھے کبھی یاد نہ آئی۔ ان گنت انسان روز ہماری نظروں کے سامنے سے گذرتے رہتے ہیں۔ ایسے ایسے غیر ضروری، بدمعاش، شرابی لوگوں کو کون یاد رکھے گا۔ مدتیں گذر گئیں۔ ایک روز میرے پیارے بھائی ٹوٹ نے نئے لسنر کی ایک تصویر دیکھتے ہوئے تاسف کے ساتھ کہا۔ ''دیکھا تم نے نین تارا۔ یہ بچاری مرگئی۔ اچھی شکل تھی۔ اور اچھا گاتی تھی۔ باجو بند کھل کھل جائے۔ اور میں نے لاکھوں کے بول سہے، کس غضب کا الاپتی تھی غریب۔ مرگئی بے چاری'' کون؟ کیوں مرگئی۔'' میں نے بے خیالی سے پوچھا۔ ''پتہ نہیں۔'' ٹوٹ نے جواب دیا۔ ''کہتے ہیں بہت دکھی تھی۔ کسی سے اسے انتہا کی محبت تھی۔ سچی محبت۔ لیکن اس شخص نے اس کا یقین نہیں کیا۔ اور اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اور وہ مرگئی۔'' ''اس میں کون خاص بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ ازل سے لے کر آج تک کی کوئی کہانی اٹھا کر دیکھ لو۔ یہی لپٹی ہوئی داستان ہر جگہ موجود ہے۔ اس قدر ربوریت ہے۔ اس نے کون سا بڑا اوریجنل کام کیا۔'' ٹوٹ چپ ہوگیا۔ وہ مجھ سے بحث کرنے سے ہمیشہ بچتا ہے۔

پھر۔ وہیں ہوسٹل کے کمرے کے فرش پر کاہلی بلی کی طرح آنکھیں بند کئے لیٹے لیٹے، جب کہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ مجھے ان سب کا خیال آیا۔ کلب میں شراب پینے والی خواتین، ریڈیو اسٹیشن پر آنسو بہانے والی وہ مغنیہ۔ اور وہ عجیب و غریب لڑکی جو کچھ عرصے تک ہوسٹل میں سب کی سرگوشیوں کا موضوع بنی رہی تھی۔ اور جسے آخر کار ہوسٹل چھوڑ دینا پڑا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھ سے تو تم کبھی باتیں کرتی ہی نہیں ہو۔'' میں نہایت خوش خلقی کے ساتھ اس کے کمرے میں گئی۔ اور ہم دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی میز پر بہت سا الم غلم پڑا تھا۔ خوبصورت پھول۔ امریکن اداکاروں کی رنگین تصویریں۔ چھوٹے خوشنما ٹرنکٹ۔ اور اسی قسم کی دوسری غیر ضروری خوبصورت چیزیں جو ہر نارمل لڑکی کو بے حد عزیز ہوتی ہیں۔ اس نے دفعتہً مجھ سے کہا۔ ''یہ سب تم لے لو، لے لو بھئی۔''

''کیوں.....؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''میری میزوں اور الماریوں کی درازوں میں تو اس سے بھی زیادہ کباڑ خانہ بڑا جمع ہے۔ میں یہ لے کر کیا کروں گی؟''

''نہیں، تم یہ سب بھی لے جاؤ۔ تم بہت اچھی ہو۔ تم نین تارا ہو۔'' اس نے کہا۔ میں نے کسر نفسی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اسے یقین دلایا کہ مجھے ان ٹرنکٹس کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی پراسرار نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔ جہاں ہوسٹل کا دھوبی گھاس کے وسیع سبز قطعے پر رنگ برنگی ساریاں پھیلا رہا تھا۔ اور ہوا میں سوئیٹ پی اور ہار سنگار کی مہک تیر رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے

رنجیدہ آواز میں کہا۔ ''تمہیں میری چیزیں پسند نہیں آئیں حالانکہ تم نین تارا ہو۔''
چند روز بعد وہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے کانونٹ سے اس کے متعلق ایک بہت بڑی رپورٹ آئی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے کالج کے سارے ہوسٹلوں کی وارڈنز کی ایک میٹنگ بھی ہوئی تھی۔ کچھ عرصے تک ڈائننگ ہال کی میزوں اور چیپل کی سیڑھیوں پر اس کا تذکرہ رہا۔ لیکن جلد ہی ہوسٹل اور کالج کی بھرپور زندگی کے دوسرے نئے نئے موضوعات نے اس کی جگہ لے لی۔ اس کی زندگی کا پس منظر کیا تھا۔ وہ اب کہاں ہو گی۔ کیا کر رہی ہو گی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ہماری زندگی میں اس طرح ان گنت انسان داخل ہوتے ہیں اور ایک لمحے کے لئے ہمارے سامنے ٹھٹھک کر آگے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ان سب کا خیال آیا۔ طرح طرح کے انسان موٹی عورتیں۔ دبلی عورتیں اسٹریم لائنڈ بدمعاشی کرنے والی سوسائٹی کی خواتین، شریف پاکباز، لتجاوتی، ستودنتی عورتیں، خفقان زدہ عورتیں، سپر انٹلکچوئیل بننے والی لڑکیاں کیا زندگی ہے، کیا دنیا ہے۔ ''خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ ٹوٹ نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد مظلومیت کے ساتھ کہا تھا۔ ''بنومت ٹوٹ۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں واقعی بے حد سادہ دل ہوں نین تارا۔'' وہ بولا۔

''ہو گے۔ پھر اس کا دوسروں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ تمہاری ہی حماقت ظاہر ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

باہر بارش ہوتی رہی۔ شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اکتا کر میں نے لیمپ روشن کیا اور آئی۔ اے رچرڈز کی نفسیاتی تنقید اٹھالی۔

وقت گذر گیا۔

ایک روز، ویک اینڈ کے لئے گھر گئی۔ ٹوٹ اور جمیلہ مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھے اور بے حد اہمیت کے ساتھ رازدارانہ لہجے میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر چپ ہو گئے۔

''نین تارا کو نہیں بتائیں گے۔'' جمیلہ نے چپکے سے ٹوٹ سے کہا۔

''ہاں نین تارا کو نہیں بتائیں گے۔ اسے بڑی جلدی شوک پہنچ جاتا ہے۔'' ٹوٹ نے اسی سرگوشی کے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''مجھے کیا نہیں بتاؤ گے بھئی؟ کیا چوروں کی طرح کانا پھوسی لگا رکھی ہے۔'' میں نے ان کے قریب پہنچ کر بے حد دلچسپی کے ساتھ کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' ٹوٹ نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''دراصل۔ می می کو ہم نے کل شام کلب میں دیکھا کہ۔'' جمیلہ نے کہنا شروع کیا۔

''کہ قلابازیاں کھا رہی تھی؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ارے نہیں بھئی۔ اس کے ہاتھ میں۔ اس کے ہاتھ میں۔'' جمیلہ رک گئی۔

''شیری کا گلاس تھا۔'' ٹوٹ نے شکستہ دلی کے ساتھ بات پوری کر دی۔

ہم تینوں چپ ہو گئے۔

''ممکن ہے ٹماٹر کا عرق رہا ہو۔'' کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں ٹماٹر کا عرق نہیں تھا۔'' جمیلہ نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

اسی وقت رفعت آن پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں حکومت کے غیر معمولی گزٹ کا تازہ پرچہ تھا۔ ''یہ دیکھو۔'' اس نے کہا۔

''اب کیا ہوا؟'' جمیلہ نے اکتا کر پوچھا۔

''ہوتا کیا۔ سرور کے تبادلے کا حکم آ گیا ہے۔ وہ فوراً جا رہا ہے۔ اور اس لئے سلطانہ سے اس کی شادی ملتوی ہوگئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

یہ طے شدہ بات تھی۔ کہ رفعت چنڈو خانہ کلب کی سب سے مستعد رپورٹر تھی۔ لیکن ہم لوگ اس قصے سے اب اتنے اکتا گئے تھے۔ کہ کسی نے بھی اس خبر پر کوئی تبصرہ نہ کیا ہم سب اینچیوں کی طرح گھاس پر بیٹھے رہے۔

''ہلو!!'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رفعت کے پیچھے خالدہ توفیق اپنی برق رفتاری کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

''ہلو۔ خدا حافظ۔'' وہ ایک لحظہ کے لئے ہمارے سامنے ٹھٹھک کر چلائی۔

''کیا قصہ ہے خالدہ توفیق۔ اب تم کہاں بھاگی جاتی ہو۔'' میں۔ میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

فلک رقاص بازی آنچناں کرد
زہر کس از خلل نقل مکاں کرد

جلدی جلدی یہ کہہ کر وہ اپنی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے ہم سب میر حسن کی کسی مثنوی کے کردار ہیں۔ میرا جی چاہا کہ گرج کر خالدہ توفیق ہی کی زبان میں اسے جواب دوں۔ تاکہ بالکل رہس کا مزہ آ جائے لیکن اس قسم کا کوئی شعر اس وقت میرے دماغ میں نہ آیا۔ میں پھر اینچیوں

کی طرح چپکی بیٹھ گئی۔

کالج کی ٹرم ختم ہونے والی تھی۔ دوسرے روز میں اپنی ہری وادی کی طرف واپس جا رہی تھی۔ شام کو میں نے می می کو کلب میں دیکھا۔

''می می۔ می می۔ چلو میرے ساتھ۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں اپنے پھولوں کے جنگلوں کو واپس جا رہی ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''نہیں میں یہیں رہوں گی۔'' اس نے بچوں کی سی ضد کے ساتھ کہا۔

''تم یہیں رہو گی؟'' میں نے اس کی بات دہرائی۔ اور اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کلب کی عمارت جگمگا رہی تھی۔ بینڈ پر کوئی افسردہ سا نغمہ بجا رہا تھا۔ پام گروو میں کوک ٹیل کے گلاس کھنکھنا رہے تھے۔

''اچھا خدا حافظ بھئی می می۔'' میں نے اس سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں وادی میں واپس آ گئی۔ وہاں پر شفاف نیلگوں پانی والا تالاب، سفید خود رو پھول۔ گلہریاں، خرگوش، صنوبروں کے جھنڈ، سب اسی طرح موجود تھے۔ پرسکون اور مطمئن۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان سب چیزوں کے حسن کو محسوس کیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر میں اپنے سبز رنگ کے تولیہ کے ڈریسنگ گاؤن اور سوئمنگ کاسٹیوم کا بیگ کندھوں سے لٹکا کر، ٹارا لارا، گاتی وادی کی پگڈنڈی پر آگے بڑھی اور چناروں والے راستے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے نیلی پہاڑیوں کا سلسلہ سورج کی ارغوانی کرنوں کے ساتھ ساتھ دھند میں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔

میں چلتی رہی۔ پگڈنڈی پر میرے ساتھ جنگل کے سارے پرند، اور گلہریاں اور خرگوش ادھر ادھر کودتے جا رہے تھے۔

اور چلتے چلتے دفعتہً ٹھنڈے، روپہلے پانی کی لہریں مارتی جھیل میری تھکی ہوئی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میں نیلی پہاڑیوں سے پرے نکل آئی تھی۔ میں نے تھک کر اپنا بیگ ایک پتھر پر رکھ دیا۔ اور ستانے کے لئے جھیل کے کنارے ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ جس نے پانی کی سطح پر سایہ کر رکھا تھا۔ شاید یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تک پہنچنے کا مجھے عمر بھر انتظار رہا ہے۔ میں نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا۔ میں نے بہت سے ستارۂ سحری کے پھول جمع کئے۔ اور کچی چیریاں اور آڑو، سیب کی کلیاں۔ اور میں نے سوچا کیا پروا ہے۔ اگر میری کہانیاں پڑھنے والوں کو پسند نہیں آتیں۔ میری بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر رائل اکیڈمی والے ہائی برو نقاد ناک بھوں چڑھا کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ یہ لڑکی پکاسو کی ٹانگ کا ہے کو توڑتی ہے۔

سورج کی نرم کرنیں میرے چاروں اور بکھر رہی تھیں۔ اور پانی کی سطح پر سفید کنول اور روپہلے پروں والے راج ہنس تیرتے پھر رہے تھے۔ اور کنارے پر جنگلی گلہریاں اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

ہاں واقعی مجھے کیا پروا ہے۔ میں نے سوچا۔

کیونکہ میں نے اپنا وژن دیکھ لیا تھا۔

برف باری سے پہلے

''آج رات تو یقیناً برف پڑے گی۔'' صاحب خانہ نے کہا۔ سب آتشدان کے اور قریب ہو کے بیٹھ گئے۔ آتشدان پر رکھی ہوئی گھڑی اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ ٹک ٹک کرتی رہی۔ بلیاں کشنوں میں منہ دیئے اونگھ رہی تھیں، اور کبھی کبھی کسی آواز پر کان کھڑے کر کے کھانے کے کمرے کے دروازے کی طرف ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر دیکھ لیتی تھیں۔ صاحب خانہ کی دونوں کی لڑکیاں نٹنگ میں مشغول تھیں۔ گھر کے سارے بچے کمرے کے ایک کونے میں پرانے اخباروں اور رسالوں کے ڈھیر پر چڑھے کیرم میں مصروف تھے۔

بوبی ممتاز کھڑکی کے قریب خاموش بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

''ہاں آج رات تو قطعی برف پڑے گی۔'' صاحب خانہ کے بڑے بیٹے نے کہا۔

''بڑا مزا آئے گا۔ صبح کو ہم اسنو مین بنائیں گے۔'' ایک بچہ چلایا۔

''ممتاز بھائی جان ہمیں اپنا پائپ دے دو گے؟ ہم اسے اسنو مین کے منہ میں ٹھونسیں گے۔'' دوسرے بچے نے کہا۔

بلیاں رات کے کھانے کے سہانے وقت کے انتظار میں بڑی قناعت سے کشنوں پر آنکھیں موندے بیٹھی تھیں۔

''کل صبح شمال میں ہلکے ہلکے چھینٹے پڑیں گے۔ اور شمال مغرب میں آندھی

کے ساتھ بارش ہوگی۔ جنوبی بلوچستان اور سندھ کا موسم خشک رہے گا۔'' صاحب خانہ نے ناک پر عینک رکھ کے اخبار اٹھایا اور موسم کی پیشین گوئی آواز بلند پڑھنی شروع کی۔

''خوب برف پڑتی ہے بھائی۔ لیکن ایک بات ہے۔ اس طرف پھل بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ ایبٹ آباد میں جب میں تھا۔'' صاحب خانہ کے منجھلے بیٹے نے خود ہی اپنی بات جاری رکھی۔

بوبی ممتاز چپکا بیٹھا ہنستا رہا، ساری دنیا موسم میں اتنی شدید دلچسپی کیوں لیتی ہے۔ کیا ان لوگوں کو اس وقت گفتگو کا کوئی اس سے زیادہ بیکار موضوع نہیں سوجھ رہا۔ کوئینی لکھنؤ ریڈیو پر روزانہ آٹھ بجے پر انگریزی میں موسم کی رپورٹ سناتی تھی۔ کل چھم میں تیز ہوا کے ساتھ پانی آئے گا۔ پورب میں صرف تھوڑے سے چھینٹے پڑیں گے اتر میں سردی بڑھ جائے گی۔..... کوئینی..... کوئینی بی بی..... وجو..... فریڈ کہاں ہو تم سب..... اس وقت تم سب جانے کیا کر رہے ہوگے۔ اس نے بہت تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

''ممتاز صاحب آج تو آپ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیے۔'' صاحب خانہ کی بیگم نے کہا اور شال لپیٹتی ہوئی کھانے کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ان کی آواز پر آنکھیں کھول کر وہ انہیں پینٹری کے دروازے میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ صاحب خانہ کی دو لڑکیاں تھیں۔ یہی ساری بات تھی۔ اسی وجہ سے اس کی اتنی خاطریں کی جا رہی تھیں جب سے وہ پاکستان 'منتخب' کرنے کے بعد کوئٹے آیا تھا۔ یہ خاندان اسے روزانہ اپنے ہاں چائے یا کھانے پر مدعو کرتا۔ اگر وہ نہ آتا

چاہتا تو وہ جا کر اسے کلب سے پکڑ لاتے۔ اس کے لئے روز طرح طرح کے حلوے تیار کئے جاتے۔ اس کی موجودگی میں ان کی بڑی لڑکی، انتہائی پھیکے شلجم کے ایسے چہرے والی سعیدہ انتہائی معصومیت اور نیازمندی کے ساتھ ایک طرف کو بیٹھی نٹنگ کرتی رہتی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی رہتا۔ جیسے کسی کل والی چینی کی گڑیا کی انگلیوں میں تیلیاں تھما دی گئی ہوں کبھی کبھی وہ دوسروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی اور پھر خود بخود شرما کر دوبارہ نٹنگ پر جھک جاتی۔ یہ لڑکیاں کتنی نٹنگ کرتی ہیں۔ بس سال بھر ان کے ہاتھوں میں اون اور سلائیاں دیکھ لو۔ گویا یہ ان کے بنے ہوئے پل اوور اور موزے قیامت کے روز انہیں بخشوائیں گے۔ پھر صاحب خانہ کی بیگم باورچی خانہ سے واپس آ کر خانساماں کی نامعقولیت پر اظہار خیال کرنے کے بعد اپنی سگھڑ بیٹی کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتیں۔ بس اس کو تو یہی شوق ہے دن بھر اسی طرح کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہے۔ اپنے ابا کا یہ سویٹر کوٹ بھی اسی نے بنا ہے۔ اس وقت وہ یقیناً متوقع ہوتیں کہ وہ کہے..... ''میں اون منگوا دوں گا میرے لئے بھی ایک پل اوور بنا دیجئے۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہتا۔ لڑکی اپنی ڈائریکٹر آف پروپگنڈہ اینڈ پبلسٹی کی طرف سے یہ تعریف ہوتی سن کر اور زیادہ شرما جاتی اور اس کی سلائیاں زیادہ تیزی سے متحرک ہو جاتیں۔

خداوند..... بوبی ممتاز نے بہت زیادہ اکتا کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اندھیرے میں چنار کے درخت آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے اس گرم اور روشن کمرے کے باہر دور دور تک مکمل سکوت طاری تھا۔ رات کا گہرا اور منجمد سکوت۔ وہ

رات بالکل ایسی تھی اندھیری اور خاموش۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی وہ رات جو اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مسوری کے وائلڈ روز میں آخری بار گزاری تھی۔ کوئینی اور وجاہت کا وائلڈ روز۔ جب وہ سب وائلڈ روز کے خوبصورت لاؤنج میں آگ کے پاس بیٹھے تھے۔ اور کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ آخری مرتبہ وہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ رات بھی پلک جھپکتے میں گزر گئی تھی۔ وقت اسی طرح گزرتا چلا جاتا ہے۔

صاحب خانہ نے دفعتہً بڑے زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں اخبار تھامے ویکلی کے کسی کارٹون پر ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ بچے اپنے تصویروں والے رسالے اور کیرم چھوڑ کر اس کے قریب آ گئے اور اس سے کہنے لگے کہ اگر رات کو اس کی موٹر برف میں پھنس گئی تو کتنا مزہ آئے گا۔ ایک بچی نے ناؤ بنانے کے لئے اون لکر کا سرورق پھاڑ ڈالا اور ایک تصویر دوسری تراشی ہوئی تصویروں اور کترنوں کے ساتھ رسالے میں سے سرک کر فرش پر آن گری۔

بوبی ممتار کی نظر اس تصویر پر پڑ گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ سگرڈ کی تصویر تھی۔ سگرڈ اپنے پیارے سے دو ماہ کے بچے کو میز پر ہاتھوں سے تھامے اس کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ وہی مخصوص، پاگل کر دینے والا تبسم اس کے ہونٹوں پر تھا۔ اس کے بال اسی اسٹائل سے بنے تھے۔ اس کی آنکھیں اسی طرح پرسکون اور پراسرار..... اس تصویر کے لئے بچوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ اس کے جسم میں سردی کی ایک تیز ناقابل برداشت کاٹتی ہوئی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر

دیکھا۔ کھڑکی بند تھی اور آتشدان میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ کمرہ حسب معمول گرم تھا۔ بچے اسی طرح شور مچا رہے تھے۔ لڑکیاں ٹنگ کر رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ سگرڈ کی تصویر تھی۔ جو ایک بچی نے بے خیالی سے نئے اون لکر میں سے کاٹ لی تھی۔ سگرڈ..... سگرڈ۔ وہ دفعتہً کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا.....!

''کہاں چلے.....؟ کھانا آنے والا ہے۔'' صاحب خانہ ہاتھ پھیلا کر چلائے۔

''بس پانچ منٹ اور ٹھہر جاؤ بھیا..... تو اچڑھا ہی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''کھانا کھا کے جایئے گا۔'' سعیدہ نے اپنی پتلی سی آواز آہستہ سے بلند کر کے چپکے سے کہا اور پھر جلدی سے سلائیوں پر جھک گئی۔

''ہاں ہاں بھائی جان۔ کھانا کھا کے۔ اور پھر اپنا پائپ۔'' بچوں نے شور مچایا۔ اور پھر تصویر کے لئے چھینا جھپٹی ہونے لگی۔

''ارے مجھے دے۔ میں اس کی مونچھیں بناؤں گا۔'' ایک بچہ اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھوں سے تصویر چھیننے لگا۔

''نہیں۔ پہلے میں۔ میں ڈاڑھی بھی بناؤں گی اس کی جیسی چچا میاں کی ہے۔'' بچی نے زور لگایا۔

''میں اس مسز سگرڈ عثمان کے ہونٹوں میں پائپ لگا دوں گا۔'' دوسرا بچہ چلایا۔

''واہ لڑکیاں پائپ کہاں پیتی ہیں۔'' پہلے بچے نے اعتراض کیا۔

''ممتاز بھائی جان تو پیتے ہیں۔'' اس نے اپنی منطق استعمال کی۔

''ممتاز بھائی جان کوئی لڑکی تھوڑا ہی ہیں۔'' سب نے پھر قہقہے لگانے شروع

کر دیئے۔

بو بی ممتاز انتہائی بد اخلاقی کا ثبوت دیتا کمرے سے نکل کر جلدی سے باہر آیا۔ اور اپنی اوپل تک پہنچ کر سب کو شب بخیر کہنے کے بعد تیزی سے سڑک پر آ گیا۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ اور فروری کا آسمان تاریک تھا۔ اس کے میزبانوں کا گھر دور ہوتا گیا۔ بچوں کے شور کی آواز پیچھے رہ گئی۔ بالکل خالی الذہن ہو کر اس نے کار بے حد تیز رفتاری سے سیدھی سڑک پر چھوڑ دی۔ گھر چلا جائے۔ اس نے سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔ اس نے کار کا رخ کلب کی طرف کر دیا۔

ایک بیرے کو کھانے کے متعلق کہتے ہوئے وہ ایک لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ جو اکثر سنسان پڑی رہتی تھی۔ اس نے صوفے پر لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ سوچنے، سمجھنے، محسوس کرنے، یاد کرنے کی ساری عادتیں بھول چکا ہے۔ اب کچھ باقی نہیں، کچھ باقی نہیں، اس نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو خوب ملا۔ اور پھر غور سے ہتھیلیوں کو دیکھنے لگا۔ اس لئے محسوس کیا کہ اس وقت اس کی آنکھیں بہت سونی سونی لگ رہی ہوں گی وہ آنکھیں جن کے لئے کملا کہا کرتی تھی کہ انتہائی شراب انڈیلنے والی آنکھیں ہیں اس کی آنکھوں کی یہ تعریف سب کو یاد ہو گئی تھی۔ بو بی ممتاز کی شراب انڈیلنے والی آنکھیں۔ اور وہ اس وقت وہاں، اس اجنبی شہر کے غیر دلچسپ کلب کے نیم تاریک خاموش لاؤنج میں صوفے پر بچوں کی طرح پڑا اپنی ہتھیلیوں سے ان آنکھوں کو مل رہا تھا۔ گویا بہت دیر کا سویا ہوا اب جگا ہے۔ برابر کے کمرے میں

خوب زور زور سے ریڈیو بجایا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ باتوں میں مشغول تھے۔ وہاں بھی موسم کے متعلق بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ''آج رات تو یقیناً برف پڑے گی۔'' کوئی بے حد وثوق اور اہمیت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

''یہاں بڑے کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے یارو۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ پھر سیاسیات پر گفتگو شروع ہو گئی۔ جہاں چار آدمی اکٹھے ہوتے یہ لازمی بات تھی کہ سیاست پر رائے زنی شروع ہو جائے۔ جواہر لال نے یہ کہا۔ قائداعظم نے یہ کہا۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ کہا۔ یہ اچھا ہوا۔ یہ برا ہوا۔ تم کیسے آئے؟ میں ایسے آیا۔ میں یوں لٹا۔ میں نے راستے میں یوں تکلیفیں اٹھائیں۔ فلاں ملازم ہو گیا۔ فلاں نے استعفےٰ دے دیا۔ فلاں کراچی میں ہے۔ فلاں پنڈی پہنچ چکا ہے۔ بوبی ممتاز لاؤنج کے صوفے پر چپ چاپ پڑا یہ سب سنتا رہا۔ گیلری کی دوسری جانب ایک کمرے میں چند انگریز ممبر اور ان کی خواتین قریب قریب بیٹھے ایک دوسرے کا غم غلط کر رہے تھے۔ کلب کا وہ حصہ نسبتاً سنسان پڑا تھا۔ ۱۵ اگست کے بعد شہر اور چھاؤنی میں جو کا دکا انگریز رہ گئے تھے۔ وہ سرِ شام ہی سے وہاں آن بیٹھتے اور 'ہوم' خط لکھتے رہتے یا طامس کک اور بی، او، اے، سی والوں سے پیچ کے متعلق خط و کتابت کرتے۔ ان کی بیویاں اور لڑکیاں اکتاہٹ کے ساتھ بیٹھی ریکارڈ بجاتی رہتیں۔ ان کے گڈ اولڈ ڈیز کے پرانے ساتھی اور عزیز ہوم جا چکے تھے اور جانے کہاں کہاں سے نئے نئے دیسی ممبر کلب میں آن بھرے تھے۔ ڈیڈی نے دو سال کے لئے کنٹریکٹ کیا ہے۔ چارلس نے سال بھر کے لئے والنٹیر کیا ہے۔ کوئٹہ تو مارگریٹ ڈارلنگ بے حد دلچسپ اسٹیشن تھا۔ پر اب۔ اب تو اتنا مرنے کو جی چاہتا

ہے۔وہ بے بسی کے عالم میں کلب کے دیسی ممبروں کی خواتین کو دیکھتیں۔

''اوگوش'' گیلری میں سے گزرتے ہوئے کرنل روجرز کی سرخ بالوں والی لڑکی نے چپکے سے اپنی ایک سہیلی سے اکتا کر کہا۔''آج وہ بھی نہیں آیا۔''

''وہ کون؟''اس کی سہیلی نے پوچھا۔

''وہی۔انتظامی سروس والا۔جو لکھنؤ سے آیا ہے۔''

''اچھا وہ۔''

''ہاں،سخت بور ہے۔کل رات میرا خیال تھا کہ مجھ سے رقص کے لئے کہے گا۔ لیکن چپ چاپ الو کی طرح آنکھیں جھپکاتا رہا۔''

''لیکن کیرل ڈارلنگ کتنی بالکل شراب انڈیلنے والی آنکھیں۔''

''ہوں گی۔جین ڈارلنگ یہ ہندوستانی بالکل گیلٹ نہیں ہوتے۔''

وہ دونوں باتیں کرتی کارڈروم کی طرف چلی گئیں۔

باہر درخت ہوا میں سرسراتے رہے۔اس کے ایک دوست نے گیلری میں سے لاؤنج میں آ کر روشنی جلا دی۔وہ چونک کر صوفے پر سے اٹھ بیٹھا۔

''ابے یار کیا افیمچیوں کی طرح مراقبے میں بیٹھے ہو۔تمہیں سارے میں تلاش کر ڈالا چلو کارڈ روم میں چلیں۔وہاں روجرز کی لونڈیا بھی موجود ہے۔تم نے تو ابھی سارا کلب بھی گھوم کر نہیں دیکھا۔ذرا جاڑے نکلنے دو تفریح رہے گی۔سچ پوچھو تو یہ شہر اتنا برا نہیں۔شروع شروع میں تو سبھی 'ہوم سک' محسوس کرتے ہیں۔لیکن بہت جلد ہم ان فضاؤں سے مانوس ہو جائیں گے۔''اس کے دوست نے کہا۔

''ہاں،بالکل ٹھیک کہتے ہو بھائی۔''اس نے پائپ جلاتے ہوئے بے خیالی

سے جواب دیا۔

''چلو ذرا پون ٹون ہی کھیلیں۔''

''تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''جلد آنا۔ سب تمہارے منتظر ہیں۔'' دوست نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

برابر کے کمرے کا شور دھیما پڑ گیا۔ شاید وہ سب بھی کارڈ روم کی طرف چلے گئے تھے۔ کسی بیرے نے یہ سمجھ کر کہ لاؤنج میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے میں سے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی روشنی بجھا دی اور آگے چلا گیا۔

لاؤنج میں پھر وہی نیم تاریکی پھیل گئی۔ رات کا سحر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''بوبی..... بوبی.....'' وہ پھر چونک پڑا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس نام سے اس اجنبی جگہ میں اس کو کس نے پکارا۔ اس نام سے پکارنے والے اس کے پیارے ساتھی تو بہت پیچھے، بہت دور رہ گئے تھے۔

بوبی..... بوبی..... نہیں..... وہاں پر کوئی نہ تھا۔ اس جگہ پر تو محض ممتاز صغیر احمد تھا۔ وہ ہستی، وہ شور مچانے والا، خوبصورت آنکھوں کا مالک، سب کا چہیتا بوبی تو کہیں اور، بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں پر صرف ممتاز صغیر احمد موجود تھا۔ اس نے اپنا نام آہستہ سے پکارا۔ ممتاز صغیر احمد..... کتنا عجیب نام ہے۔ وہ کون ہے۔ اس کی ہستی کیا ہے کیوں اور کس طرح اپنے آپ کو وہ وہاں پر موجود پا رہا ہے۔ یہ انسان..... یہ انسان..... سب کچھ محسوس کر کے، سب کچھ بتا کے اب تک زندہ ہے، سانس لے رہا ہے۔ رات کے کھانے کا انتظار کر رہا ہے۔ ابھی وہ کارڈ روم میں جا کر پون ٹون کھیلے گا۔ کرنل فریزر کی لڑکی کے ساتھ ناچے گا۔ اتوار کو پھر اس

شلجم کی ایسی شکل والی لڑکی سعیدہ کے گھر مدعو کیا جائے گا۔

بوبی..... بوبی..... کوئینی بی بی..... اس نے چپکے سے جواب دیا۔ کوئینی بی بی ..... وجو بھیا..... یہ تم ہو؟..... اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر کچھ محسوس کرنا چاہا اس نے صوفے کے مخملیں کشن کو چھوا۔ مخمل اتنی گرم تھی، اور راحت پہنچانے والی۔ دریچے کے باہر فروری کی ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

بوبی..... ہاں کوئینی بی بی۔ تم کہاں ہو۔ میں نے تمہاری آواز سنی ہے۔ ابھی تم اور لوکھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ لیکن وہاں لو بھی نہیں تھی۔ وجاہت بھی نہیں تھا۔ فریڈ بھی نہیں تھا۔

کوئینی بی بی..... اس نے چپکے سے دہرایا۔ آٹھ پچپن۔ اس کی نظر گھڑی پر پڑ گئی وہ اس وقت، سینکڑوں ہزاروں میل دور، نشر گاہ کے اسٹوڈیو میں بیٹھی اپنے سامنے رکھے ہوئے بلیٹن کے ٹھیٹ سنسکرت الفاظ نگلنے کی کوشش میں مصروف ہو گی۔ اور موسم کی رپورٹ سنا رہی ہو گی۔ گھڑی اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ ٹک ٹک کرتی رہی۔ وجاہت بھائی..... تم اس وقت کیا کر رہے ہو..... اور فریڈ ..... اور..... اور..... انیس۔

برابر کے کمرے میں لاہور سے موسم کی رپورٹ سنائی جا رہی تھی۔ اور خالی کمرے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ آج شمال میں برف باری ہو گی۔ شمال مغرب میں بارش کے چھینٹے پڑیں گے۔ جنوب میں تیز ہوائیں چلیں گی۔..... گھڑی اسی طرح ٹک ٹک کرتی رہی۔ ٹک ٹک ٹک۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، ..... چھ..... چھ سال..... یہ چھ سال..... خداوندا.....،

اس تپش، اس تڑپ، اس بے چینی کے بعد آخر کار موت آتی ہے۔ آخر کار خدائے قدوس کا سپید تخت نظر آتا ہے۔ آخر کار وہ خوبصورت وژن دکھلائی پڑتا ہے۔ کوئینی نے آہستہ آہستہ کہا۔ پس منظر کی موسیقی دفعتہً بہت تیز ہوگئی۔

ہاں۔ آخر کار وہ خوبصورت وژن دکھلائی پڑتا ہے۔ ارے تم کدھر نکل آئے۔ زندگی کی طرف واپس جاؤ۔ انقلاب اور موت کی تندرو آندھیوں کے سامنے زرد، کمزور پتوں کی طرح بھاگتے ہوئے انسان۔ ہماری طرف واپس لوٹو..... اس وژن کی طرف..... اس وژن کی طرف..... لوٹھہر گئی..... ٹھیک ہے؟ اس نے اپنے حصے کی آخری سطریں ختم کر کے اسکرپٹ فرش پر گرا دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ تھینک یو.....'' کوئینی ہیڈفون ایک طرف کو ڈال کر باہر آ گئی۔ ''لیکن ڈارلنگ تن نے ٹمپو پھر تیز کر دیا۔ خدا کے لئے دھیرے دھیرے بولا کرو۔''

''اوگوش۔ یہ ٹمپو تو کسی چیز کا کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ کوئینی ڈارلنگ'' لو نے اکتا کر جواب دیا۔

''بوبی..... بوبی.....'' گیلری میں سے وجاہت کی آواز سنائی دی۔

''ارے کیا وجو آیا ہے؟'' کوئینی نے اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

اس کا بھائی وجاہت انتظار کے کمرے میں کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ ''بٹیا گھر چل رہی ہو؟.....'' اس نے کوئینی سے پوچھا۔

''تم اس وقت کیسے آ گئے؟'' کوئینی نے دریافت کیا۔

''میں ابھی ابھی بوبی ممتاز کو برلنگٹن سے لینے آیا تھا۔ میں نے سوچا اگر تمہارا

کام ختم ہو گیا ہو تو تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔'' وجاہت نے کہا۔

''بوبی ممتاز کون؟'' کوئینی نے بے خیالی سے پوچھا۔

''ہے ایک۔'' وجاہت نے اسی بے خیالی سے جواب دیا۔ بوبی ممتاز زینے پر سے اتر کر ان کی طرف آیا۔ ''کہاں بھاگ گئے تھے؟'' وجاہت نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''ار..... آداب.....'' بوبی ممتاز نے کوئینی کی طرف مڑ کر کہا۔ ''تم ہی کوئینی بٹیا ہو نا؟''

''ہاں۔ تسلیم!'' کوئینی ناخن کترتے ہوئے غور سے اس کے مطالعے میں مصروف تھی۔ کتنا سوئیٹ لڑکا ہے۔ اس نے دل میں کہا۔

''تو پھر چلو ہمارے ساتھ ہی گھر۔'' بوبی ممتاز نے کہا۔

''نہیں بھیا۔ ابھی مجھے وہ کم بخت موسم کی خبریں سنانی ہیں۔ آٹھ پچپن ہو گئے۔'' وہ انہیں گیلری میں کھڑا چھوڑ کر اسٹوڈیو میں تیزی سے گھس گئی۔ وہ دونوں باہر آ گئے۔

یہ خلوص، یہ سادگی، یہ اپنائیت ایسے پیارے دوست اسے آج تک کہیں نہ ملے تھے۔ بہت جلد وہ وجاہت کے سٹ میں گھل مل گیا۔ وہ سب کے سب اتنے دلچسپ تھے۔ لیونورا ور شرجو ''لو'' کہلاتی تھی، جس کی ماں امریکن اور باپ پہاڑی تھا اس کی ترچھی ترچھی نیپالی آنکھوں کی وجہ سے سب اسے چنک چائی لو کہتے تھے اور فریڈ جس کا تبسم اتنا معصوم، اتنا پاکیزہ، اتنا شریف تھا۔ وہ اسے چھیڑنے کے لئے ہندوستان عیسائی فرقے کی مخصوص حماقتوں کا مذاق اڑاتے۔ لڑکیاں

عیسائیوں کے بے ہوئے انگریزی لہجے کی نقل کر کے اس سے پوچھتیں۔ ''فریڈ ڈیر کیا آج تم کسی اپنا گرل فرینڈ کو باہر نہیں لے جانے مانگتا؟''

''کیوں تم سب میری اتنی ٹانگ کھینچتے ہو۔'' وہ ہنس کر کہتا۔ وہ بہت اونچے عیسائی خاندان سے تھا۔ لیکن اسے اس طرح چھیڑنے میں سب کو بہت لطف آتا۔ وہ سب لوسے کہتے۔ ''لو ڈیر اگر فریڈ اس سنڈے کو پروپوز کرے تو فوراً مان جاؤ۔ ہم سب تمہاری برائیڈز میڈز اور پیج بوائیز بنیں گے۔'' پھر وہ چلا چلا کر گاتیں۔

''سم سنڈے مارننگ''

وہ ۱۹۴۲ء تھا، جب بوبی ممتاز پہلی بار ان سب سے ملا۔ ہر سال کی طرح، جب گرمیاں آئیں اور وہ لوگ مسوری جانے لگے تو وہ بھی ان کے ہمراہ مسوری گیا۔ کوئینی اور وجاہت کے ''وائلڈ روز'' میں سب اکٹھے ہوئے۔ اور وہ وہاں پر بھی بہت جلد بے حد ہر دلعزیز ہو گیا۔

بڑی غیر دلچسپ سی شام تھی۔ وہ سب ہیک مینز کے ایک کونے میں بیٹھے سامنے سے گزرنے والوں کو اکتاہٹ سے دیکھ رہے تھے۔ اور چند ملنے والوں کے منتظر تھے۔ جنہیں وجاہت نے مدعو کیا تھا۔ اتنے میں گیلری میں سے چچی ارنا گزرتی نظر آئیں انہوں نے بالوں میں دو تین پھول ٹھونس رکھے تھے۔ اور خانہ بدوشوں کا سا لباس پہنے تھیں۔

''کوئی نیا جناور گرا ہے۔'' یاسمین نے چپکے سے کوئینی سے کہا۔

''اماں چپ رہو یار۔'' کوئینی نے اسے ڈپٹ کر جواب دیا۔

''کیا ہوا؟'' بوبی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' کوئینی نے جواب دیا۔ اتنے میں ان کے مہمان آ گئے۔ اور وہ سب بظاہر بڑی سنجیدہ شکلیں بنا کر ان کے پاس جا بیٹھیں۔

''یہ چچی ارنا کون ہیں۔ تمہاری چچی ہیں؟'' بوبی نے پوچھا۔ تازہ وارد مہمان سب ان ہی کی باتیں کر رہے تھے۔

''ارے نہیں بھئی۔'' کوئینی نے شگفتگی سے جواب دیا۔ ''یہ سگرڈ کی ممی ہیں۔''

''سگرڈ کون؟'' بوبی نے پوچھا۔

''ہے ..... ایک لڑکی .....'' کوئینی نے بے خیالی سے گویا مزید تشریح کر دی۔ اور پھر دوسری باتوں میں منہمک ہو گئی۔

اگلے روز وہ سب ٹہلنے کے لئے نکلے تو وجاہت نے تجویز کیا کہ وہ ڈاسٹاک کا چکر لگا آئیں۔ سگرڈ سے بھی ملتے آئیں گے۔ وہ ٹولیاں بنا کر پتھر اور چٹانیں پھلانگتے وڈاسٹاک کے ہوسٹل کی طرف مڑ گئے۔

..... ایک بڑے سے سلور اوک کے نیچے بوبی ممتاز نے سگرڈ کو دیکھا۔ وہ عمارت کی ڈھلوان پر درختوں کے جھنڈ میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی نٹنگ میں مشغول تھی۔ ان سب کو اپنی سمت آتا دیکھ کر وہ بچوں کی طرح دوڑتی ہوئی کوئینی کے قریب آ گئی۔ کوئینی نے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ ہمارے بوبی بھائی ہیں۔ اتنی بڑھیا اسکیٹنگ کرتے ہیں کہ تم دیکھ کر بالکل انتقال کر جاؤ گی۔''

وہ بچوں کی طرح مسکرائی۔ وہ اس کا معصوم، پاکیزہ تبسم، اسکیٹنگ ان دونوں کا مشترکہ موضوع گفتگو بن گیا۔ وہ سب شام کی چائے کے لئے اکٹھے ''وائلڈ روز'' واپس آئے۔

وہ زمانہ جو اس سال بوبی ممتاز نے مسوری میں گزارا، اس کی زندگی کا بہترین وقت تھا۔ مال پر سے ونسنٹ ہل کی طرف واپس آتے ہوئے ایک روز اس نے فریڈ سے کہا۔ ''ٹھاکر پال فریڈرک رنبیر سنگھ!..... کیا تم جانتے ہو کہ اس وقت دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان کون ہے؟''

فریڈ نے سنجیدگی سے نفی میں سر ہلایا۔

''سنو۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ جس طرح اکثر اخباروں کے میگزین سیکشن میں ایک کالم چھپتا ہے کہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے دنیا کا سب سے بڑا پل سڈنی میں ہے۔ دنیا کا امیر ترین شخص نظام حیدرآباد ہے۔ اسی طرح اس مرتبہ چھپے گا کہ دنیا کا سب سے خوش قسمت شخص ممتاز صغیر احمد ہے۔ سمجھے ٹھاکر صاحب..... ممتاز صغیر..... کیا سمجھے؟''

فریڈ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بہت ہی گرانبار، سنجیدہ، سلجھا ہوا آدمی تھا۔ اس کی عمر اکتیس بتیس سال کی رہی ہوگی۔ بہت ہی کنفرمڈ قسم کا بیچلر تھا۔ اور سارے بیچلرز کا مانا ہوا گرو۔ اپنے ایک نہایت ہی سعادت مند چیلے سے یہ بچوں کی سی بات سن کر وہ صرف ہنستا رہا۔ اور اس نے بوبی کو کوئی جواب نہ دیا۔ بوبی بے فکری سے سیٹی بجاتا آگے چلا گیا۔

سڑک کی ڈھلوان پر سے مڑتے ہوئے اس کی نظر ایک بڑی سی دو منزلہ کوٹھی پر پڑی جسے اس نے آج تک نوٹس نہ کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس وقت اس کے احاطے میں خوب گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ دروازوں پر روغن کیا جا رہا تھا۔ چھت پر بھی نیا سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کے ڈاڑھی دراز بزرگوار

برآمدے میں کھڑے قلیوں اور نوکروں کو ہدایات دے رہے تھے۔ بڑا کروفر۔ بڑی شان وشوکت نظر آ رہی تھی۔

''یہ کس کا مکان ہے بھئی؟'' بوبی نے ایک قلی سے پوچھا۔

''یہ.....؟ یہ قاضی جلیل الرحمٰن کا اسٹیٹ ہال ہے۔'' قلی نے بڑے رعب سے اسے مطلع کیا۔ اور آگے چلا گیا۔

سیاہ بادل بہت تیزی سے بڑھتے آ رہے تھے۔ یکلخت بارش کا ایک زوردار ریلا آ گیا بوبی نے اپنی برساتی سنبھال کر جلدی سے ''وائلڈ روز'' کے راستے کی چڑھائی طے کرنی شروع کر دی۔

وہ جولائی کا دوسرا ہفتہ تھا۔ موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ چند روز بعد وہ سب مسوری سے واپس آ گئے۔

لیکن قاضی جلیل الرحمٰن اور ان کے بھانجے انیس کو موسمی تعطیلات کے ختم ہو جانے کی پروا نہ تھی۔ وہ مراد آباد کے نواح کے زمیندار تھے۔ انکے پاس وقت اور روپے کی فراوانی تھی۔ اور ان دونوں چیزوں کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے دونوں ماموں بھانجے مسوری آئے تھے اور پانی کی طرح روپیہ بہانے میں مصروف تھے اور اکتوبر سے پہلے ان کا مراد آباد جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

انیس کے والد کا سال بھر قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کے ماموں قاضی صاحب نے خود کو اس کا غیر قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ ان کا اثر اس پر بہت زیادہ تھا۔ قاضی صاحب بے حد دل چلے اور شوقین آدمی تھے۔ بہنوئی کے انتقال کے

بعد انہوں نے اندازہ لگایا کہ لڑکا بہت سیدھا اور خاصا کم عمر ہے اور ساری ریاست اب ان کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اب تو راوی چین لکھتا ہے۔ چنانچہ انیس کے والد کی برسی کے بعد پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ پہاڑ پر چل کے رہنے کے فوائد اسے ذہن نشین کرانے شروع کئے اس کے حوالیوں موالیوں نے بھی اٹھتے بیٹھتے اس نے کہا کہ سرکار اک ذری تھوڑی دور کسی فرحت بخش مقام پر ہو آویں تو غم غلط ہووے گا۔ وہ فوراً مان گیا۔ اور اپنا لاؤلشکر لے کر قاضی صاحب کی قیادت میں مسوری آن پہنچا طے کیا گیا کہ ہوٹل میں ٹھہرنا جھول ہے اور اٹھائی گیروں کا کام ہے جن کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ہری چگ کی طرح آئے اور ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ لہٰذا ایک عمدہ سی کوٹھی خریدنا چاہئے۔ انیس نے کہا کہ یہاں کی سب سے بڑھیا کوٹھی کون سی ہے وہی خرید لی جائے۔ لوگوں نے بتایا کہ کپورتھلہ ہاؤس یہاں کی بہترین کوٹھی سمجھی جاتی ہے۔ کوٹھی کیا اچھا خاصا محل ہے۔ انیس نے فوراً اپنی چیک بک نکالی۔ ''لاؤ پھر اسے ہی خریدے لیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اماں یار باؤلے ہوئے ہو گیا۔ کپورتھلہ ہاؤس تم خرید لو گے بھلا؟'' ایک دوست نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''حضور دوسرا بہترین مکان بھوپال ہاؤس ہے۔ لیکن اتفاق سے وہ بھی بک نہیں سکتا تیسری بہترین کوٹھی اسپرنگ ڈیل ہے۔ اور چوتھی کوٹھی حضور کے لائق ریشلے ہال ہے۔'' ایک مصاحب نے اطلاع دی۔

ریشلے ہال خرید لی گئی۔ اسے بہترین ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا۔ دہرہ دون سے گوانیز ملازم اور ایک اینگلو انڈین ہاؤس کیپر منگوائی گئی اور ریشلے ہال

مسوری کی چوتھی بہترین کوٹھی کہلانے لگی۔

انیس جب پہلے پہل مسوری گیا ہے اس کی تعلیم بقول شخصے صرف سرسی سے سنبھل تلک کی تھی۔ نویں کلاس سے اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اس سے آگے پڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ البتہ شیر کے شکار اور شہسواری اور برج اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں سارے روہیلکھنڈ بھر میں دور دور تک کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی کنبے کی ایک لڑکی سے کر دی گئی تھی جو ایک اور زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اپنی جاگیر پر بیٹھا چین کی بنسی بجاتا تھا۔ ایشلے ہال خرید کر مسوری میں جب اس نے رہنا شروع کیا تو وہاں کی پہلی جھلک سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اور اس نے سوچا کہ یار یہ جواب تک ہم مراد آباد، سنبھل اور امروہے میں پڑے جھک مارتے تھے یہ اتنی عمر تو گویا برباد ہی گئی۔ یہاں تو ایک عجیب وغریب دنیا آباد تھی۔ انسانوں کی بستی تھی۔ یا اندر کا اکھاڑہ۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ لیکن بڑی مصیبت یہ آن پڑی کہ ایشلے ہال کا مالک اور مسوری کا سب سے زیادہ روپیہ خرچنے والا میزبان، لیکن بالکل تازہ تازہ دیہاتی جاگیردار۔ ادھر ادھر تو کام چل جاتا تھا۔ لیکن خواتین کی سوسائٹی میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ایک اینگلو انڈین لیڈی کمپنین کی خدمات حاصل کیں۔ جو اسے صحیح انگریزی بولنا اور بال روم ناچ سکھائے۔ چند ہی مہینوں میں وہ ایک انتہائی پولشڈ اور فر فر انگریزی بولنے والا بے حد ویل ڈریسڈ انیس تھا جو مسوری کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز شخص سمجھا جاتا تھا۔ بالکل ہی کایا پلٹ ہو گئی۔

اگلے سال ۴۳ء کی گرمیوں میں جب کوئینی، وجاہت اور ان کا گروپ مسوری پہنچا تو انہیں ایک تازہ وارد اجنبی بال رومز کی سطح پر بہتا نظر آیا۔ جس نے ہر طرف بڑی دھوم مچا رکھی تھی۔ وجاہت اسے پہلے سے جانتا تھا۔ لیکن اس اچانک کایا پلٹ پر وہ بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اس سال وہاں سارے مشہور ٹینس اسٹارز جمع تھے۔ مس اعزاز، مس کاجی۔ غیاث محمد۔ علی نگر کی عبید اللہ بہنیں۔ ان کی بھاوج شاہندہ احسان عبید اللہ۔ بمبئی سے جیوتی بھی حسب معمول آیا ہوا تھا۔ سیزن اپنے عروج پر تھا لکھنؤ کی کھوچڑ بہنیں بھی ہمیشہ کی طرح موجود تھیں۔ نرملا، پرکاش، وائلٹ۔ روبی، اوبز روز، کی پیش گوئی تھی کہ روبی کھوچڑ اس دفعہ سالانہ مقابلہ حسن میں سگرڈ ربانی سے سبقت لے جائے گی۔ ایشلے ہال کی پارٹیوں میں یہ سب اکثر نظر آتیں۔

ایک روز ہیک مینز میں انیس رقص کا پہلا دور ختم کر کے کوئینی کی طرف آیا اور اسے سلام کر کے وجاہت کے قریب جا بیٹھا۔

''ابے او بلغ چونچ..... یہ سوٹ ووٹ کیسے ڈانٹ لیا۔ یہ کیا سوانگ بھرا ہے ایں؟'' وجاہت نے اسے ڈانٹ کر پوچھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر لڑکیوں کی موجودگی میں ذرا جھینپتے ہوئے چپکے سے وجاہت سے پوچھا۔ ''کیوں یار اب ٹھیک لگتا ہوں نا.....؟''

ذرا اس گدھے کو دیکھنا یا ٹیمین ڈارلنگ۔ خود تو شام کا لباس پہن کر ناچتا پھر رہا ہے اور بیوی کو وہیں قصبے میں چھوڑ رکھا ہے۔ ایسے آدمیوں کو تو بس.....'' کوئینی سے غصے کے ساتھ چپکے سے کہا۔

اس کے اگلے دن، کوئینی اپنے مکان کے اوپر کے برآمدے میں آرام کرسی پر کاہل بلی کی طرح لیٹی لیٹی پڑھنے میں مشغول تھی۔ کہ دفعتہً اسے برآمدے کے شیشوں میں سے نظر آیا کہ نشیب میں خان بہادر اعجاز احمد کے کاٹج کے سامنے رکشائیں کھڑی ہیں۔ بہت سے لوگ آ جا رہے ہیں اور خوب چہل پہل ہے۔ یہاں تک کہ ان کے باورچی خانہ میں سے دھواں تک اٹھ رہا ہے۔ یہ بے حد عجیب اور نئی بات تھی۔ کیونکہ خان بہادر صاحب کا خاندان عموماً یا تو دوسروں کے ہاں مدعو رہتا تھا یا ہوٹلوں میں کھانا کھاتا تھا وہ بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ اسی وقت بارش شروع ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد وجاہت اور بوبی برساتیوں سے لدے پھندے بھیگتے بھاگتے نچلی منزل کی گیلری میں داخل ہوئے، وہ ابھی زینے ہی پر تھے۔ کہ کوئینی چلائی۔ ''ارے دجو، بوبی بھیا جلدی سے اوپر آؤ۔''

اور جس وقت وجاہت اور بوبی برآمدے کے دریچے میں آ کر کھڑے ہوئے انہیں انیس اپنا بہترین سوٹ پہنے۔ گارکا دھواں اڑاتا خان بہادر صاحب کے کاٹج میں سے نکلتا نظر آیا۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' وجاہت نے بہت آہستہ سے کہا۔ اسے اور بوبی کو اتنا رنجیدہ دیکھ کر کوئینی کا سارا اکسائیٹ منٹ رفو چکر ہو گیا۔ اور وہ بھی بڑی فکرمندی کے ساتھ دونوں کی کرسیوں کے نزدیک فرش پر بلی کی طرح آ بیٹھی اور چہرہ اوپر اٹھا کر دونوں لڑکوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔

چچ چچ چچ۔ بچارہ سوئیٹ بوبی ممتاز۔ کوئینی نے بے حد ہمدردی سے دل میں

سوچا۔لیکن زیادہ دیر تک اس سے اس سنجیدگی سے نہ بیٹھا گیا۔وہ چپکے سے اٹھ کر بھاگی بھاگی گیلری میں پہونچی اور یاسمین کو فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کوئینی ڈیر کہ اس سال تو کوئی اور بھی جناور گرا ہے اس پچھلے سال والے کسی جناور سے بھی بڑا۔'' دوسرے سرے پر یاسمین بڑی شگفتگی سے کہہ رہی تھی۔''اور سنو تو۔کل میں نے سگرڈ کو نیا لیپرڈ اسکن کوٹ پہنے دیکھا، ایسا بڑھیا کہ تم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔اور چچی ارنا کا نیا ایوننگ گاؤن۔اصلی ٹیفیٹا ہے۔اس جنگ کے زمانے میں اصلی ٹیفیٹا۔کوئینی ڈارلنگ۔ اور ٹوٹو کہہ رہی تھی کہ اس نے مسز راجپاس سے سنا جنہیں بیگم فاروقی نے بتایا کہ مسز نارنگ نے ان سے کہا کہ آج کل خان بہادر صاحب کے ہاں کی خریداری کے سارے بل لیلا رام اور فینسی ہاؤس والے سیدھے ریشلے ہال بھیج دیتے ہیں .....اوگوش۔''

''اوگوش .....'' کوئینی نے اپنی آنکھیں بالکل پھیلا کر پھولے ہوئے سانس سے دہرایا۔

بارش ہوتی رہی۔ریسیور رکھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر آ گئی اور در یچے میں کہنیاں ٹیک کر بے دلی سے باہر کا منظر دیکھتی رہی جہاں پانی کی پھواروں کے ساتھ بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے۔وادی کے نشیب میں خان بہادر صاحب کی کاٹج میں پیانو بج رہا تھا۔اور چچی ارنا اپنے برآمدے میں کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔

چچی ارنا سوئیڈش تھیں جب وہ پہلی بار اپنے شوہر کے ہمراہ ہندوستان آئی

تھیں۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ سر آغا خان کے اس سنہرے دیس میں وہ بھی ایک مرمریں محل سرا میں کسی الف لیلوی سلطانہ کی طرح رہا کریں گی۔ لیکن جب وہ یہاں پہونچیں تو انہیں پتہ چلا کہ مرمریں ستونوں اور ایرانی قالینوں والی محل سرا کے بجائے ان کے شوہر اصغر ربانی لکھنؤ کے ایک نہایت گندے محلے وکٹوریہ گنج میں رہتے ہیں۔ جہاں ایک بوڑھی ماں ہے جو ہر وقت امام کی مجلسوں میں چلا چلا کر رونے میں مصروف رہتی ہے چار پانچ جاہل اور کالی اور سخت بے ہنگم بہنیں اور بھاوجیں ہیں۔ اور ان سب عورتوں کی ساری سوسائٹی جھوائی ٹولہ، اور مولوی گنج اور نخاس کی گلیوں تک محدود ہے۔ جہاں وہ سب ڈولیوں پر کتے کی طرح ہانپتے ہوئے انسانوں کے کاندھوں پر لد کے، پردے دار تانگوں میں سوار ہو کے کبھی کبھار اسی طرح کے دوسرے گندے مکانوں اور ان ہی کی قسم کی دوسری بے ہنگم عورتوں سے ملنے جایا کرتی ہیں۔ ارنا کرسٹینا پر یہ سب دیکھ کر بیہوشی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ان کے پیارے شوہر نے انہیں دلاسا دیا کہ جب ان کا کاروبار چمک جائے گا تو وہ شہر سے باہر گومتی کے کنارے سول لائنز میں یا چھاؤنی میں کوٹھی لے کر رہا کریں گے۔ لیکن وہ برسوں تک اس ٹاٹ کے پردوں والے مکان سے نہ نکل سکیں۔ ان کے بالکل سونے کی رنگت کے دمکتے ہوئے بال تھے۔ نیلی آنکھیں تھیں اور گلاب کے شبنم آلود شگوفوں کی ایسی رنگت تھی۔ لیکن وائٹ ویز کے ہاں کے ملبوسات پہن کر چھتر منزل کلب میں جگمگانے کے بجائے ان کی وسمت میں تو یہی نرک بھوگنا لکھا تھا کہ وکٹوریہ گنج کے اس مکان کی ایک سیلن میں بیٹھی بیٹھی ٹھیٹ ہندوستانی ماؤں کی طرح محض سگرڈ کو پالتی رہیں اور اپنے میاں کو

کوسا کریں۔ اصغر ربانی اٹھتے بیٹھتے انہیں اطمینان دلاتے۔ ''بس ڈارلنگ چند رو زکی بات اور ہے پھر ہم چل کر الگ رہیں گے۔ تمہیں کون سی جگہ زیادہ پسند ہے، ٹرانس گومتی سول لائنز یا دل کشا؟''

''جہنم میں جائے تمہاری ٹرانس گومتی۔'' اورارنا کرسٹینا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں واقعی یہ ان کے لئے بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھی اچھی ہندوستان لڑکیوں کے جنہیں باہر کی ذرا سی بھی ہوا لگ چکی ہوتی۔ اس ماحول میں چھکے چھوٹ جاتے۔ وہ پھر خالص ولائتی تھیں۔

کئی سال اسی طرح لشتم پشتم میں گزر گئے۔ آخر ایک سال، اصغر ربانی کسی طرح روپیہ فراہم کر کے انہیں گرمیاں گزارنے کے لئے مسوری لے گئے۔ وہاں چچی ارنا کی ملاقات اصغر ربانی کے ایک دوست خان بہادر اعجاز احمد سے ہوئی جو ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے اور بڑے ٹھاٹ سے وہاں زندگی گزارتے تھے۔ چچی ارنا نے ان سے شادی کر لی۔ اور سگرڈ کو وڈاسٹاک اسکول میں داخل کر دیا۔ اور اسی طرح کی زندگی گزارنے لگیں۔ جن کی انہیں اتنی شدید تمنا تھی۔ اس دن سے لے کر آج تک کسی کو اصغر ربانی کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ان کے لئے طرح طرح کی روائتیں مشہور ہیں۔ کسی نے انہیں جمنا کے کنارے ڈاڑھی اور جٹائیں بڑھائے، سادھوؤں کے ساتھ گھومتے دیکھا، کسی نے بے حد وثوق سے خبر دی کہ اصغر ربانی کو ردولی شریف میں حضرت قُلفل شاہ کے تکیہ پر گانجہ پینے کے نہایت معزز اور دلچسپ شغل میں مصروف پایا گیا ہے۔ آخری اطلاع ان کے متعلق یہ تھی کہ کاروبار میں سخت نقصان اٹھانے کے بعد اپنا

باقی ماندہ روپیہ لے کر وہ جنوبی افریقہ چلے گئے۔ سگرڈ جب بڑی ہوئی اس وقت تک وہ وکٹوریہ گنج کے مکان اور اپنے باپ کو بالکل بھول چکی تھی۔ وہ اب مسوری کی ''بال آف فائر'' کہلاتی تھی۔ اس کا رنگ بالکل سفید نہیں تھا۔ اس میں ہلکے ہلکے ہندوستان سانولے پن کی جھلک تھی۔ اس کی آنکھیں بچوں کی طرح بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ چچی ارنا کیتھولک تھیں۔ کیتھولک مذہب میں جو گہرائی، جو گمبھیرتا، جو عظمت ہے اس کا پورا پورا اثر سگرڈ کی طبیعت نے قبول کیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کی فرشتوں کی سی معصومیت برستی تھی۔ وہ اس سے کوسوں دور تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے دنیا سے الگ تھلگ، سینٹ میری کی مقدس راہبات کی کسی خانقاہ میں سے نکل کر چلی آ رہی ہے۔

''خداوند..... کیا سگڈ ایسی بھی ہو سکتی ہے۔'' کوئینی نے برآمدے کے دریچے میں کھڑے کھڑے ایک اور جمائی لے کر بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ اسے پھر بوبی ممتاز کا خیال آیا جو سمجھتا تھا کہ سگرڈ ہی وہ لڑکی ہے جس کا وہ جنم جنم سے انتظار کرتا آیا تھا۔ جو روبی کھوچڑ اور انوری خاں اور نشاط اسٹیلے اور ان کی طرح کی دوسری لڑکیوں سے بہت بلند ہے۔ بہت بلند اور بہت مختلف..... خداوند..... وہ بے دلی سے وادی کے نیلے اور سفید پھولوں پر بارش کی پھواروں کو برستا دیکھتی رہی۔ چچی ارنا کے کاٹج میں سے پیانو کی آواز بدستور بلند ہو رہی تھی۔ کوئی بڑے اچھے سروں میں ''سوانی..... ہاؤ آئی لو یو..... ہاؤ آئی لو یو'' کا پرانا نغمہ بجا رہا تھا۔

اسی شام ''وائلڈ روز'' سے واپس پر بوبی ممتاز کو راستے میں نشاط اسٹیلے مل گئی۔ نشاط اسٹیلے بمبئی ریڈیو سے انگریزی میں اناؤنسمنٹ کرتی تھی۔ اور کمرشل آرٹ کی

تعلیم حاصل کر رہی تھی جو انتہائی بدشکل تھی۔ لیکن نہ جانے کس طرح انتہائی دلکش معلوم ہوتی تھی۔

''اور ہلو بوبی ممتاز۔ تمہیں آج اتنے چاندوں کے بعد دیکھا ہے۔ کہاں تھے؟'' اس نے چلا کر کہا۔

''کہیں نہیں۔ یہیں تھا۔'' بوبی نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اور اپنی 'شراب انڈیلنے والی' آنکھیں دوسری طرف گھما دیں۔ وہ ایک ہرنی کی طرح جست بھر کے پگڈنڈی پر سے پھر ان آنکھوں کی زد میں آ کھڑی ہوئی۔

''اوجیزس.....! صدیوں کے بعد نظر آئے ہو۔ کیا سگرڈ ربانی کے چھن جانے کا سوگ منا رہے ہو؟ بیوقوف ہو۔ سوگ کرنے کے بجائے آؤ اس حادثے کو سیلی بریٹ کریں۔'' اس نے بشاشت سے کہا۔ اور اسے کھینچتی ہوئی اسٹینڈرڈ کی طرف لے گئی۔ اور وہاں ایک لاؤنج میں پہنچ کر دھم سے ایک کرسی پر گرتے ہوئے وہ بیرے کو احکامات دینے میں مصروف ہو گئی۔

بوبی بے دلی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اس لڑکی سے اتنی نفرت تھی۔ پھر بھی اس لڑکی میں ایک عجیب نا قابل بیان، تکلیف دہ کشش تھی۔ اتنی بدشکل..... بدشکل ..... اس نے کوئی تشبیہہ سوچنی چاہی۔ لیکن نشاط اسٹیلے کی شخصیت سے موازنہ کرنے کے لئے کوئی مناسب چیز اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ یہ لڑکی جو فخریہ کہتی تھی کہ مجھ سے بڑا فلرٹ اس روئے زمین پر آپ کو دستیاب نہ ہو گا۔ وہ الہ آباد کے ایک بہت اعلیٰ عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور بڑی ہمدرد، بڑی فیاض بے حد نیک دل لڑکی تھی۔ اکثر وہ جذباتی بن کر اپنے دوستوں سے کہتی۔ لوگ مجھے اتنا برا سمجھتے

ہیں، کاش کوئی مجھے پہچان سکتا کاش لوگ اتنے بیوقوف، گدھے، نہ ہوتے۔

پھر اس نے بیرے کی طرف سے مڑ کر بوبی سے کہا۔ ''بوبی ڈیر، کیوں ایسی رونی شکل بنائے بیٹھے ہو۔ بیوقوف ذرا دریچے سے باہر نظر ڈالو۔ کائنات اتنی بشاش ہے، ارغوانی بادل جھکے ہوئے ہیں، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، وادیوں میں نیلے پھول کھل رہے ہیں۔ کیا ایسے میں تم رنجیدہ رہ سکتے ہو؟ الوہو بالکل۔''

بوبی ہنس پڑا۔ اور پھر وہ دونوں بچوں کی سی مستعدی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور قہقہے لگانے میں مشغول ہو گئے۔ باہر پہاڑوں کی برف پر جگمگاتی ہوئی چاندنی زیادہ خوشگوار ہو گئی۔ ''سوانی ہاؤ آئی لو یو..... ہاؤ آئی لو یو.....'' کا پامال نغمہ جو ڈانس بینڈ والے ہال کے سرے پر بجا رہے تھے۔ یک لخت بالکل نیا، بہت انوکھا اور بے حد اچھا معلوم ہونے لگا۔

دفعتہً بوبی کو خیال آیا۔ میں اس وقت یہاں نشاط اسٹیلے کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ اگر کوئینی نے مجھے اس لڑکی کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو اسے کتنا شوک پہونچے گا۔ پھر اس نے ضدی بچوں کی طرح سر جھٹک کر سوچا۔ اگر اس وقت کوئینی اور اس کی طرح باعزت اور اونچی لڑکیوں کی ایک پوری بریگیڈ یہاں آ کر کھڑی ہو جائے اور مجھے اس کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر بے ہوش ہو جائے تب بھی میں ذرا پروانہ کروں گا۔ قطعی پروانہ کروں گا۔ یہ لڑکی کتنی پیاری تھی۔ کتنی ہمدرد تھی۔ بالکل کسی پیاری سی بہن کی طرح ہمدرد۔ اسے یاد آیا کل کسی نے اس کے متعلق کیسی کیسی عجیب اور خوفناک باتیں اسے بتائی تھیں۔ ارے نہیں نشاط۔ اس نے چلا کر کہنا چاہا۔ تم ایسی نہیں ہو۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کرسی پر چڑھ کر سارے

اسٹینڈرڈ، ساری مسوری، ساری دنیا کو بتائے۔ یہ لڑکی نشاط اسٹیلے بری نہیں ہے۔ تم سب خود برے ہو۔ تم میں اخلاقی قوت نہیں ہے۔ اس لئے اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر تم اسے برا کہتے ہو۔ تم لوگ۔

''ہلو بوبی بھیا۔ تم یہاں ہو۔ ہم تمہیں سارے میں ڈھونڈ آئے۔'' اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے سامنے کوئینی کھڑی تھی، جو اسی وقت لو، فریڈ اور کملا کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ ذرا گھبرا کر تعظیماً کھڑا ہو گیا اور اس کے لئے کرسی خالی کر دی۔ نشاط اسی طرح بے فکری سے میز پر ٹانگیں رکھے کرسی پر نیم دراز ایک گیت گنگناتی رہی۔

''ہلو کوئینی۔'' اس نے بے پروائی سے بازو پھیلا کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''ہلو نشاط۔'' کوئینی نے بڑے ہی پر اخلاق لہجے میں جس میں یہ ملحوظ رکھا گیا تھا کہ اس کا روکھا پن اور مربیانہ، بے تعلق انداز سب کو محسوس ہو جائے۔ اسے جواب دیا۔

''ہمیں ابھی زینے پر روبی کھوچڑ ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس سال مقابلہ حسن میں اس کا اول آنا یقینی ہے۔ کیونکہ اس کی حریف سگرڈ ربانی اس مرتبہ مقابلے میں شامل نہیں ہو رہی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کی اجازت نہیں کہ وہ اس قسم کی خرافات میں شرکت کرتی پھرے۔'' لو نے جھک کر بوبی کو بتایا۔

''انیس کی اجازت نہیں؟'' نشاط نے دفعتہً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''اسے اس قدر اختیارات سگرڈ پر کب سے حاصل ہو گئے۔ کیا وہ اس سے شادی کر رہا ہے؟''

''ارے نہیں بھئی ..... شادی کون مسخرہ کر رہا ہے۔'' لو نے بے فکری سے جواب دیا۔ ''ہاں۔ بو بی بھیا ہم تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ کل جیوتی بھائی نے ہم سب کو ہیک مینز مدعو کیا ہے۔ سگرڈ کی دعوت ہے دراصل۔ جیوتی بھائی کہہ رہے تھے کہ اس سیزن میں یہ ان کی پہلی پارٹی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو شامل ہونا پڑے گا۔ ضرور آنا بو بی۔ اور تم بھی نشاط۔'' وہ سب اپنی چھتریاں سنبھال کر لاؤنج سے باہر چلے گئے۔

''چلو بو بی ڈریسنا چیں۔'' نشاط نے جمائی لیتے ہوئے بو بی سے کہا۔

اگلی صبح، بہت تکھا ماندہ، اور رنجیدہ شکل بنائے جیوتی لال ''وائلڈ روز'' پہونچا۔

''لو بھئی وجو۔ جیوتی بھائی چلے آتے ہیں۔'' کوئینی نے نٹنگ کرتے کرتے اوپر کے برآمدے کے دریچے میں سے جھانک کر وجاہت سے کہا۔ اور اس قدر فلسفیوں کی طرح چل رہے ہیں کہ حد ہے۔ کیا مصیبت ہے آج کل۔ جسے دیکھو ایسا لگتا ہے کہ بس اب رو دے گا۔''

جیوتی لال زینے کے دروازے میں سے برآمدے میں داخل ہو گیا۔

''دیکھی تم نے اس قاضی انیس الرحمٰن کی حرکت۔ سگرڈ کو اب کسی سے ملنے نہیں دیتا۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے تم نہیں جانتے چچی ارنا کی سیاست جیوتی بھائی۔'' کوئینی نے اس سے کہا۔

''جہنم میں جائیں چچی ارنا۔'' وہ اکتا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگا، جہاں سرمئی بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ بہر حال، تم لوگ آج میری پارٹی میں تو ضرور

آؤ گے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''قطعی۔'' وجاہت نے شیو کرتے کرتے جواب دیا اور آئینے میں ناک کو بڑے غور سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

''میں جلد ہی بمبئی جا رہا ہوں۔'' جیوتی لال نے دفعتہً سر اٹھا کر کہا۔

''کیوں.....؟ کیا وحشت؟ کم از کم ٹینس کے میمی فائنلز تک تو رک جاؤ۔ کل عالم کاجی تمہیں پوچھ رہی تھی۔'' کوئینی نے کہا۔

''جہنم میں جائے عالم کاجی بھی؟'' وجاہت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جیوتی لال ہنسنے لگا۔ وہ عموماً اتنا لون سیریس رہتا تھا کہ اسے اتنا سنجیدہ اور غمگین دیکھ کر کوئینی کو بے حد ہنسی آئی۔

تیسرے پہر کو، جبکہ سب لوگ جیوتی لال کی پارٹی میں جانے کی تیاری میں مصروف تھے، کسی دل چلے نے ایشلے ہال جا کر انیس کو یہ خبر دی کہ جیوتی لال نے آج سگرڈ کو مدعو کیا ہے۔

''کب؟ کہاں۔ کس وقت؟'' انیس یہ سن کر تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چنانچہ اس کی موجودگی میں کسی اور کی یہ ہمت کہ سگرڈ کو باہر لے جائے۔ اگر جیوتی لال یہ سمجھتے ہیں کہ وہی ایک اکیلے شہزادہ گلفام ہیں تو انہیں بہت جلد اس مغالطے سے نکلنا چاہیے۔ اس نے غصے سے کہا۔

جیوتی لال کی پارٹی کا وقت چھ بجے تھا۔ اس وقت سوا پانچ تھے۔ دفعتہً انیس کو کوئی خیال آیا، وہ تیز تیز قدم رکھتا ایشلے ہال کی سیڑھیاں اتر کر مال پر آیا اور ہیک میزز کی طرف روانہ ہو گیا۔ مسز ہیک مین کے پاس پہنچ کر اس نے کہا کہ وہ

ریسٹوران کا ایک حصہ فوراً اپنے لئے مخصوص کروانا چاہتا ہے۔ مسز ہیک مین نے جواب دیا کہ افسوس ہے کہ وہ حصہ ایک ہفتہ پہلے ہی آج شام کی ایک پارٹی کے لئے مخصوص کروالیا گیا ہے۔

''کیا آپ کسی طرح اس ریزرویشن کو کینسل نہیں کرسکتیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے مسٹر انیس۔ اس کا پیشگی کرایہ دے دیا گیا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج شام یہاں کوئی نہ آئے۔'' انیس نے بچوں کی طرح ضد کرکے کہا۔

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں مسٹر انیس'' مسز ہیک مین نے جواب دیا۔ ''کسی ریسٹوران یا رقص گاہ یا کسی اور پبلک جگہ پر آپ لوگوں کو آنے سے کس طرح روک سکتے ہیں؟''

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج یہاں کوئی نہ آئے۔'' انیس نے پھر اپنی بات دہرائی۔

''یہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب آپ پورا ہیک مینز اپنے لئے مخصوص کروا لیں۔'' مسز ہیک مین نے ہنس کر جواب دیا۔

''میں اس کے لئے تیار ہوں۔'' انیس نے تقریباً چلا کر کہا۔

''آپ اس کے لئے تیار ہیں؟ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ پورے ہیک مینز کا ایک شام کا کرایہ سات ہزار روپے ہوگا؟'' مسز ہیک مین نے کہا۔

''صرف.....؟ یہ لیجئے.....'' انیس نے اپنی وہ لافانی چیک بک نکالی اور سات

ہزار کا ایک چیک کاٹ کر حیرت زدہ مسز ہیک مین کے حوالے کیا۔

جیوتی لال کا ریزرویشن اس طرح خود بخود کینسل ہو گیا۔ بیروں نے جو چند لوگ ادھر ادھر آئے بیٹھے تھے ان سے مودبانہ عرض کی کہ آج سارا ہیک مینز مخصوص کروالیا گیا ہے اس لئے آپ حضرات تشریف لے جائیے۔ ساری رقص گاہ خالی ہو گئی۔ چھ بجا ہی چاہتے تھے۔ قاضی انیس الرحمٰن نپولین کی سی فاتحانہ شان سے سنسان ہال کی ایک نشست پر جا براجمان ہوئے اور آنے والے معرکے کے انتظار میں مصروف ہو گئے۔

ٹھیک چھ بجے جیوتی لال اور سگرڈ اپنے مہمانوں کی ساری پلٹن سمیت ہیک مینز کے دروازے پر پہونچے۔ وہ سب اندر داخل ہونے والے ہی تھے کہ ایک بیرے نے گیلری میں سے سر نکال کر بڑے ادب سے عرض کی کہ سرکار اندر تشریف نہیں لا سکتے۔

''کیا؟'' جیوتی لال نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے عرض کیا نا (بیرہ لکھنؤ کی طرف کا تھا) کہ حضور اندر آنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیے۔''

''کیا بک رہے ہو۔'' جیوتی لال کو اس بدتمیز پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے میں ریزرویشن کروا چکا ہوں۔''

اب سارے مہمان قطار میں سے بے حد دلچسپی سے گردنیں نکال کر جیوتی لال اور بیرے کا مکالمہ سننے میں مصروف ہو گئے۔ وہ سب سڑک پر ششدر کھڑے تھے اور اندر جانے سے قاصر تھے۔ جیوتی لال کی ایسی توہین آج تک کسی نے نہ کی

تھی۔وہ غصے سے سرخ ہوکر چلایا۔

''مسز ہیک مین کو بلاؤ۔یہ کیا مذاق ہے؟''

مسز ہیک مین مسکراتی ہوئی برآمد ہوئیں۔

''یہ کیا قصہ ہے مسز ہیک مین۔میں صریحاً ریزرویشن کروا چکا ہوں اور اب آپ کا یہ سخت نامعقول بیرہ ہمیں اندر جانے سے روکتا ہے۔مسوری کی تاریخ میں کبھی آج تک ایسا خوفناک واقعہ ہوا تھا؟''

''لیکن مسٹر جیوتی لال قانون میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اگر سارے ہوٹل کا مجھے پیشگی کرایہ دے دیا جائے تو میں اسے منظور نہ کروں۔''

''کس گدھے کی دم نے سارے ہوٹل کا کرایہ دیا ہے؟''جیوتی لال گرجا۔

''حضور اشلے ہال کے قاضی انیس الرحمٰن نے۔''بیرے نے سر نکال کر چپکے سے جواب دیا۔

دوسرے لمحے انیس نے گیلری میں سے سر نکال کر جھانکا۔

''ہلو سگرڈ۔!تم باہر کھڑے کھڑے تھک گئی ہو گی۔آؤ ایک پیالی قہوہ پی لو۔باہر تو کافی سردی ہے۔''اس نے کہا۔

سگرڈ نے مہمانوں کے ہجوم میں سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھایا۔پھر کچھ ٹھٹکی۔اور پھر آخر پلٹ کر جیوتی لال کو شب بخیر کہنے اور اس کی دعوت کا شکریہ ادا کرنے کے بعد آناً فاناً گیلری میں داخل ہوگئی۔

جیوتی لال اور اس کے مہمان یہ دیکھ کر باہر ایسے منجمد رہ گئے جیسے سب پر پالے کا اثر ہوگیا ہو۔

اب ہیک مینز کے اندر یہ روح افزا منظر تھا کہ سنسان بال روم کی سطح پر صرف ایک جوڑا رقص کر رہا ہے۔ انیس اور سگرڈ اور بینڈ والے بے حد مستعدی سے صرف اس ایک جوڑے کے لئے سوانی کا نغمہ بجائے جا رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد انیس اکتا گیا۔ اپنے حریف کو ایسی مضحکہ خیز شکست وہ بہر حال دے چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب ایک شام کے لئے سات ہزار روپے پھینکے ہیں تو اسے سوارت ہی کیا جائے۔ چنانچہ وہ پھر باہر آیا اور مال پر پہنچ کر اسے جو شناسا نظر آیا اسے دعوت دی کہ چلو ہمارے ساتھ ہیک مینز، اور جو جو جاننے والے اسے ملے ان سے کہا کہ اور جو دوست تمہیں راستے میں ملیں ان سب کو لے کر ہیک مینز آ جاؤ۔

ابھی جیوتی لال کی پارٹی والے مہمان سڑک ہی پر تھے کہ انہیں انیس کے دوڑائے ہوئے اسکاؤٹ مل گئے جو ادھر ادھر سے پکڑ کر زبردستی مہمانوں کو جمع کرتے پھر رہے تھے۔ جیوتی لال کے مہمان آپس میں یہ طے کر ہی رہے تھے کہ اب کہاں چلا جائے۔ کہ اتنے میں انیس کے اسکاؤٹ ان کی طرف آئے اور انتہائی ڈھٹائی سے انہیں انیس کی پارٹی کے لئے مدعو کیا۔ مہمانوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آخر نرجس نے کہا۔ ''شام تو برباد ہی گئی چلو انیس ہی کی پارٹی میں چلے چلتے ہیں۔'' ان میں سے بہت سے جیوتی لال سے معذرت چاہ کر دوبارہ ہیک مینز چلے گئے۔ صرف وجاہت کا گروپ انتہائی وفاداری اور مستقل مزاجی سے جیوتی لال کے ساتھ رہ گیا۔ اور اسٹینڈرڈ میں جا کر آئس کریم کھانے کے بعد وہ سب دنیا کی بے ثباتی اور انسانوں کی بے وفائی پر مرثیے پڑھتے

''وائلڈ روز'' واپس آ گئے۔ جو ایسے معرکوں کے بعد دوستوں کی آخری جائے پناہ تھی۔

دوسری صبح جیوتی لال پہلے گیٹ سے واپس نیچے چلا گیا۔

وقت تیزی سے آگے نکلتا گیا۔ ہر سال مسوری میں اسی طرح کے نت نئے واقعے ہوتے رہتے۔ سگرڈ انیس کے ساتھ برابر نظر آتی رہی۔ لیکن اب اس قصے کی نوولٹی بھی کم ہو چلی تھی۔ لوگ کسی زیادہ سنسنی خیز واقعے کے منتظر تھے جو زیادہ سے زیادہ عرصے تک چائے کی میزوں پر موضوع گفتگو بنا رہے۔

لیکن بوبی ممتاز اب تک مایوس نہ ہوا تھا۔ اسے سگرڈ پر یقین تھا۔ انسانیت کی حقیقی اچھائی پر اور اپنی زندگی کے ان لمحات پر یقین تھا۔ جو اس نے اتنے برسوں پہلے ۴۲ء میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتے ہوئے گزارے تھے۔ جب وہ اور سگرڈ گھنٹوں اسکیٹنگ اور ٹینس کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور زندگی اچھی تھی۔ کائنات اتنی بشاش ہے۔ یہ معصوم سپید پھول، بلوریں جھرنے، کنوارے، مقدس، برفیلے پہاڑ، اس بری لڑکی نشاط نے اس سے کہا تھا، دیکھو۔ یہ کھلا، نیلا آسمان، اونچے درخت، قرمزی بادل، ہمارے چاروں طرف ہر چیز اتنی عظیم ہے، اتنی بلند ہے، اتنی فراخ دل ہے۔ ایسے میں کیا تم زندگی سے مایوس ہو سکتے ہو۔ خدا اور اس کے انسانوں سے مایوس ہو سکتے ہو۔

۴۷ء آیا۔ یہ مسوری میں اس کا آخری سال تھا۔ وہاں پر تقسیم شدہ پنجاب سے آئے ہوئے دولت مند شرنارتھیوں کا ایک بے پناہ سیلاب تھا۔ جو ہر طرف امنڈ رہا تھا۔ پندرہ اگست آ کر گزر چکی تھی۔ ۱۵ اگست جب ''پہاڑوں کی ملکہ'' دلہن کی

طرح سجائی گئی تھی۔ اس کا ہر ناچ گھر، ہر عمارت، ہر مکان سہ رنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ رات رات بھر جشن ہوتے رہے تھے۔ پہاڑوں کی ملکہ نے ایسی رونق ایسی چہل پہل خود کبھی آج تک نہ دیکھی تھی۔ یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ڈوبتے ہوئے جہاز کے مسافر لائف بیلٹس لگا کر سمندر میں کودنے کے بجائے سب کے سب ہڑبڑا کر جہاز کی رقص گاہ میں ایک آخری ناچ کے لئے گھسے جا رہے ہوں۔ 'اولڈ ٹائمرز' وہاں اب خال خال نظر آتے تھے۔ بشلے ہال سونا پڑا تھا۔ انیس پر اس کی بیوی نے نان و نفقے کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ اور وہ بڑی پریشانی کے عالم میں مقدمے کے سلسلے میں مراد آباد کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ سگرڈ ایک آدھ دفعہ سوائے میں کسی کپتان کے ساتھ نظر آئی تھی۔

پھر وہ رات آئی۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ''وائلڈ روز'' کی آخری رات۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ آخری بار وہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔ آتشدان میں چیڑھ کے درخت کے خشک پھولوں اور پائن کی چھٹپیوں کی آگ دہک رہی تھی۔ باہر ہوا بہت تیز تھی۔ اور وائلڈ روز کے پہلو میں چند گز کے فاصلے پر جو اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔ اس کی چوٹی پر سے پانی کے نالے خوب زور سے شور مچاتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ اور ان کی چھینٹیں چاروں طرف اڑ اڑ کر باورچی خانے کی ٹین کی سرخ چھت پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔ نشست کے گرم اور خاموش کمرے میں وہ سب خاموش بیٹھے آگ کو دیکھ رہے تھے۔.....!

''پھر کوئی پتھر گرا۔'' کوئینی نے دفعتہً چونک کر کہا۔ سب گھبرا کر دریچے کی طرف دیکھنے لگے جو پہلو کے پہاڑ کی طرف کھلتا تھا۔ اس پہاڑ پر سے بڑے بڑے

پتھر اکثر آپ سے آپ لڑھک کر نیچے آ گرتے تھے۔ اور نشیب میں نالے کی تہہ میں جمع ہوتے جاتے تھے۔ اس پہاڑ کے نیچے سے گذرنے والی پگڈنڈی پر سے جاتے ہوئے اکا دکا پہاڑی قلی اکثر ان گرتے پتھروں کے نیچے آ کر دب جاتے تھے۔ قلیوں کے علاوہ اس پگڈنڈی پر سے کوئی نہ گزرتا تھا۔ رکشاؤں اور چہل قدمی کرنے والوں کے لئے دوسری پگڈنڈی تھی جو ''وائلڈ روز'' کے پھاٹک کے سامنے گھوم کر جاتی تھی۔

''کہیں کوئی دب نہ گیا ہو۔'' جیوتی لال نے فکرمندی سے کہا۔

''ہشت..... کوئی نہیں دبا ہوگا۔'' فریڈ نے یہ خیال جھٹک دیا۔ ایسے خوشگوار وقت میں، جبکہ وہ سب آرام سے آگ کے پاس بیٹھے تھے اور باہر بارش ہو رہی تھی، موت کا خیال نہایت مضحکہ خیز اور غیر ضروری تھا۔ موت..... اور دکھ..... سات آٹھ سال قبل اسی پہاڑ کے نیچے سے گزرتے ہوئے روبی کھوچڑ کا اکلوتا بھائی گھوڑے پر سے گر کر مر گیا تھا۔

ہوائیں شور کرتی رہیں۔

اور اس وقت ان سب کے دل میں ایک ساتھ ایک عجیب خیال آیا۔ دنیا جو کچھ ہم چاہتے ہیں ہمیں کبھی نہیں دیتی۔ ہم احمقوں کی طرح منہ کھولے سامنے مستقبل کے اندھیرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار ایک روز اس اندھیرے میں سے موت نکل کر آتی ہے اور ہمیں ہڑپ کر لیتی ہے۔ اور اس سارے نظام کائنات پر ہماری غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روبی کھوچڑ کا بھائی انہی لوگوں کے ساتھ، اسی کمرے میں اکثر اس آگ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا

اور اب وہ مدتوں سے وہاں پر نہیں تھا۔ لیکن گویا یہ کوئی بات ہی نہیں تھی۔

''ایک پتھر اور گرا۔'' کملا نے باہر کی آوازوں کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔

''ہولی میری۔'' لو نے خوفزدہ ہو کر چپکے سے اپنے آپ کو کراس کر لیا۔

بوبی دفعتہً آتشدان کے پاس سے اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ بہت وسیع اندھیرا وادیوں اور پہاڑوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اور اس اندھیرے کو بارش کے پانی کی دھاریں اور ہوا کے تھپیڑے کاٹ رہے تھے۔ اور بجلی کی چمک ان کے لئے راستے بناتی جا رہی تھی۔ بوبی نے محسوس کیا۔ میں بھی۔ یعنی یہ انسان۔ ممتاز صغیر احمد، جو اس وقت 'وائلڈ روز' کے دریچے میں کھڑا ہے۔ ان چنگھاڑتے ہوئے عناصر کا ایک اس قدر بے بس اور کمزور حصہ ہے روح کا کرب، زندگی کی تڑپ، دل کی بے چینی عناصر کی اس قیامت خیز گھن گرج میں گھل مل کر ایسی ایک بے آواز سی دھڑکن بن گئی ہے۔ یہ پہاڑ، یہ طوفانی نالے، یہ اونچے بے پروا درخت۔ ان سب پر میرے وجود کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کبھی خدا آئے گا اور زندگی کی دھڑکن کے خاتمے کے بعد، اپنی اس بیکراں کائنات کے ویرانے میں بہتی ہوئی ان پرشور طوفانی ندیوں کو دیکھ کر سوچے گا۔ میں نے یہ دنیا کیوں بنائی تھی.....!

فریڈ آتشدان کے پاس بیٹھے بیٹھے کوئی پرانا گیت گنگنا رہا تھا۔

''نہیں جیوتی بھائی..... ان پتھروں کے نیچے کوئی نہ دبا ہوگا..... خداوند خدا تو اتنا رحمدل ہے۔'' فریڈ نے شعلوں کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ ''مجھے اس وقت ایسا لگ رہا ہے جیسے چیڑھ اور پائین کے درخت خدا نے اسی لئے

اگائے تھے کہ میں ان کی لکڑیوں سے آگ تاپوں، کوئینی اور وجو اور لو اور تم سب اسی لئے تخلیق کئے گئے تھے کہ میں تمہارے ساتھ اطمینان اور سکون کے چند لمحات گزار سکوں۔ کوئینی اور وجو کے ابا نے آج سے پچیس سال پہلے یہ وائلڈ روز اسی لئے خریدی تھی کہ ایک روز میں اس کے آرام دہ کمرے میں آگ کے سامنے بیٹھ سکوں۔ وجو تم خوش نہیں ہو؟ یو بی ممتاز تم خوش نہیں ہو؟ تمہیں اپنے وجود کے لئے خداوند خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' وہ چپ ہو کر پھر آگ کو دیکھنے لگا۔

سب خاموش تھے۔ پھر وجاہت نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''میں بہت خوش ہوں ٹھاکر پال فریڈرک رنبیر سنگھ۔ لیکن اگر یہ پہاڑ، جو صدیوں سے ہزاروں لاکھوں برس سے اسی طرح کھڑا ہے، جس کے سائے میں یہ ہمارا گھر پچیس سال سے اسی طرح موجود ہے، یہ پہاڑ اگر ایسی ہی کسی طوفانی رات میں یک لخت ہماری چھت پر آن گرے تو کیا ہو۔ کیا ہم سب صرف یہی چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں، اپنی تمنائیں پوری کر سکیں، شہرت اور عزت حاصل کریں، اپنے چاہنے والوں کے کام آئیں اور پھر ختم ہو جائیں۔ سب کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ لو کو یقین ہے کہ جب وہ ایک اچھی، ایماندار کیتھولک کی طرح مرے گی اور آسمان پر جائے گی تو اسے فوراً فرشتوں کے کوائیر میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس کے شانوں پر دو چھوٹے چھوٹے نقرئی پر اگ آئیں گے۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے خداوند خدا کی تقدیس کی حمدیں گایا کرے گی۔ جس نے اسے اپنی جنت میں داخل کیا۔ ایک بلی جب اپنے ناشتے کے بعد آگ کے سامنے کشن پر مکمل اطمینان اور فراغت کے احساس کے ساتھ آنکھیں موند کر لیٹی ہے اس وقت وہ یقیناً یہی سوچتی

ہو گی کہ خدا ایک بڑا سا، سفید، ایرانی بلا ہے۔ جس کی مونچھوں میں سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔'' وجاہت بھی خاموش ہو گیا۔

دریچے کے باہر، وادی کے نشیب میں خان بہادر صاحب کی کاٹج میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ اور بارش کا شور تیز ہوتا جا رہا تھا۔

''آج کی رات..... آج کی رات کچھ ہو گا..... کچھ ہو گا۔'' لو نے دفعتہً بیحد خوفزدہ ہو کر کہا۔

''کچھ نہیں ہو گا۔ بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔'' فریڈ نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ تھک کر کشنوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر شعلوں کو دیکھنے لگی۔

کوئینی اور وجاہت کی چھوٹی سی بھانجی جواب تک بڑوں سے الگ ایک کونے میں مکی ہاؤس کی کتاب دیکھ رہی تھی۔ یک لخت اپنی جگہ پر سے اٹھ کر آتشدان کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ''میں بتاؤں انکل فریڈ؟'' اس نے فریڈ کی طرف اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میرا جی چاہ رہا ہے۔ کہ ہم سب اپنی اپنی سوئمنگ کوسٹیومز پہن کر باہر کے پہاڑی نالے میں جا کے غوطے لگائیں۔''

اس کی اس عجیب و غریب خواہش کے اظہار پر سب کو ہنسی آ گئی۔

''بیوقوف مت بنو طاعت ڈارلنگ۔'' فریڈ نے اسے فرش پر سے اٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ایسی سردی میں اگر ہم لوگ نالے میں غوطے لگائیں گے تو سب کو نمونیہ ہو جائے گا۔ اور سب کو ہو جائے..... لیکن اگر میں مر گیا تو پھر تمہاری لو آنٹی سے شادی کون کرے گا؟ اور تمہیں چاکولیٹ کون کھلایا کرے گا؟'' سب

ہنسنے لگے۔

اس کے بعد پھر وہی خاموشی طاری ہوگئی۔ جس میں صرف گھڑی کی یکساں ٹک ٹک اور باہر کی بارش کی آواز مخل ہو رہی تھی۔

''یہ زور کا دھماکہ کیسا ہوا؟ آج رات کی بارش بڑے بڑے پتھروں کو بہا کر نیچے لے جائے گی۔'' یاسمین نے کہا۔

''کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موت کے وقت کی تکلیف ہم سب میں سے کس کی سب سے زیادہ ہوگی۔'' وجاہت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے عزیزوں اور پیارے دوستوں کو مرتے دیکھا ہے۔ میدان جنگ میں زخمیوں کے دم توڑنے کا نظارہ کیا ہے۔ ان فسادوں کے زمانے میں مجھے انسان ایک دوسرے کو چھرے بھونکتے نظر آئے ہیں۔ پتہ نہیں ہماری قسمتوں میں کس طرح کی موت لکھی ہے۔ کس طرح کی زندگی..... کیا پتہ اگلے لمحے ہی یہ پہاڑ جو لاکھوں برس سے اس جگہ کھڑا ہے، دفعتہً اپنا ارادہ تبدیل کر دے اور ہمارے ''وائلڈ روز'' پر آن گرے۔ تمہیں یاد ہے کوئینی ایک مرتبہ، سخت موسلا دھار بارشوں کے زمانے میں نینی تال میں ایک پہاڑ اپنے اوپر بسے ہوئے ناچ گھروں اور جگمگاتی تفریح گاہوں اور مکانوں کو روندتا ہوا دفعتہً جھیل میں جا گرا تھا۔ اس رات گورنر کے بال روم میں ایک خاص جشن تھا۔ اور سب ناچ رہے تھے اور دنیا بڑی جوان اور پرمسرت تھی ..... دوسرے لمحے وہ سب لاکھوں کروروں من وزنی پتھروں سے کچلے ہوئے، پانی کی تہ میں پڑے تھے۔

''چپ رہو جو۔'' لو نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

''ہاں چپ رہو وجو۔'' کوئینی نے ڈپٹ کر اس سے کہا۔ ''ہم سب کیوں مورد ہو گئے ہیں آؤ کوئی بے وقوفی کا کورس گائیں۔''

یاسمین نے ایک پرانا گیت شروع کر دیا۔ لیکن دفعتہً وہ سب پھر خاموش ہو گئے۔ بارش کی آواز مدھم پڑ گئی تھی اور نیچے خان بہادر صاحب کی کاٹج سے لگتا تھا کہ شور قیامت بلند ہو رہا ہے۔

''کیا ہوا۔ کیا آگ لگ گئی۔'' لو نے دریچے کی طرف بھاگتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔

''بکومت۔ ایسی بارش میں آگ کیسے لگ سکتی ہے۔'' فیڈ نے کہا۔ ایک نوکر گھبرایا ہوا اندر آیا۔

''کیا بات ہے منے خاں؟'' وجاہت نے پریشانی سے پوچھا۔

''سرکار نیچے میم صاحب کے گھر پر اشلے ہال والے انیس صاحب آئے پہنچے ہیں اور ہلا کر رہے ہیں اور کپتان صاحب کو جان سے مارے ڈالتے ہیں۔''

''کون کپتان صاحب رے؟'' کملا نے حیرت سے پوچھا۔

''حضور وہی جن کے ساتھ سگر ڈبٹیا کل نیچے جا رہی ہیں۔''

''کیا؟'' سب نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

منے خاں پر اس استعجاب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی یکساں آواز میں کہتا رہا۔

''سرکار میں تو بورچیخانہ میں چلم پی رہا تھا۔ جو میم صاحب کے کھدمدگار نے آ کر بتایا کہ وہاں سر پھٹول ہو رہی ہے۔''

''ٹھہرو میں چلتا ہوں۔'' وجاہت نے کہا۔

کوئینی نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''مت جاؤ وجو۔'' وہ چلائی۔

''کیوں نہ جاؤں؟ چلو بھئی فریڈ، جیوتی بھائی، سب لوگ، تم لڑکیاں یہیں رہو۔ تماشہ دیکھنے کے شوق میں بارش میں نہ نکل آنا۔''

یہ شور وغل سن کر بیگم صفدر اوپر سے اتر آئیں۔ ''اس اندھیرے اور پانی میں کہاں جا رہے ہو وجو، باؤلے ہوئے ہو کیا۔'' انہوں نے ڈانٹا۔

''ممی، چچی ارنا کے ہاں فوجداری ہو رہی ہے۔ آخر تو وہ لوگ ہمارے ہمسائے ہیں۔'' وجاہت نے برساتی اوڑھتے ہوئے کہا۔

''مت جاؤ وجو.....'' کوئینی پھر چلائی۔ ''انیس ممکن ہے ڈرنک بھی ہو۔ تم لوگوں سے بھی الجھ پڑے گا۔ تم کیوں پرائے پھڈے میں پیر اڑاتے ہو۔''

وجاہت کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ یہ ایک طے شدہ امر تھا۔ اور سب جانتے تھے کہ کوئینی اور وجاہت بے حد سمجھدار اور پریکٹیکل لوگ ہیں۔

وجاہت نشست کے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کی ممی نے کھانے کے کمرے میں جا کر رشوت کے طور پر ان سب کے لئے قہوہ بھجوا دیا۔ تاکہ ان کا دھیان کسی اور طرف لگے۔ اپنی اپنی پیالیاں اٹھا کر وہ سب بوبی ممتاز کی طرف مڑے۔

لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔

بوبی ممتاز ''وائلڈ روز'' کے مختصر سے احاطے کی ڈھلوان کا فاصلہ طے کر کے بالکل خواب کی سی حالت میں چلتا ہوا خان بہادر صاحب کی کاٹج تک پہونچ گیا۔ چچی ارنا کے نوکر اور کپتان صاحب کے اردلی انیس کو زبردستی پکڑ کر رکشا میں بٹھا

رہے تھے۔اور اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

بوبی ممتاز آہستہ آہستہ، سگرڈ کے گھر میں پہلی بار داخل ہوا۔دروازے میں وہ مشہور و معروف کپتان دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے۔دیوزاد فوجیوں کی طرح ٹانگیں پھیلائے راستہ روکے کھڑا تھا۔

''اب آپ تشریف لائے !! آپ کون بزرگوار ہیں؟؟''اس نے ڈپٹ کر بوبی سے پوچھا۔

بوبی بے پروائی سے اسے سامنے سے ہٹاتا ہوا اندر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سگرڈ صوفے پر اوندھی لیٹی زور زور سے سسکیاں بھر رہی تھی۔روتے روتے اس کی آنکھیں گلابی ہو چکی تھیں۔

''سگرڈ''بوبی نے بالکل قرون وسطیٰ کے رومانی سورماؤں کی طرح صوفے کے قریب فرش پر دوزانو جھک کر آہستہ سے کہا۔

وہ اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی۔

''سگرڈ۔''اس نے دوبارہ اسے پکارا۔

''یہ تم ہو بوبی۔''بالآخر سگرڈ نے آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔تم ہو.....لیکن تم تو بہت دیر کر کے آئے ہو بوبی ممتاز۔اب تم واپس چلے جاؤ۔''

''میں واپس قطعی نہیں جاؤں گا۔''بوبی نے بچوں کی طرح ضد سے کہا۔''تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔سمجھیں تم۔میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔اگلے ہفتے میں پاکستان جا رہا ہوں وہاں ہم.....''

''نہیں بوبی۔'' وہ اپنے چھوٹے چھوٹے سفید ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے تاسف سے بولی۔ ''تم بہت سوئیٹ ہو۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ میں کل صبح اس کپتان کے ساتھ نیچے جا رہی ہوں۔ وہاں میں اس سے شادی کرلوں گی۔''

''تم..... تم اس آدمی سے شادی کرلوگی۔ اس آدمی سے؟'' بوبی نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے تقریباً چلا کر کہا۔

''ہاں.....'' سگرڈ کی گہری، صاف آواز نیم تاریک کمرے میں آہستہ سے گونجی۔ ''اس شخص کو مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔''

''تو کیا..... کیا وہ سب باتیں صحیح ہیں؟'' بوبی نے بے حد دکھ کے ساتھ رکتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے۔ وہ سب افواہیں.....'' کوئی چیز اس کے حلق میں آ اٹکی۔

''ہاں۔ بالکل صحیح.....'' سگرڈ نے سکون کے ساتھ جواب دیا۔ ''اچھا خدا حافظ بوبی ممتاز اب تم واپس جاؤ۔ بارش پھر آنے والی ہے۔ تم بہت سوئیٹ تھے۔ خدا تمہارے ساتھ رہے۔'' وہ صوفے پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ باہر آ گیا۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ اور بجلی زور زور سے کڑک رہی تھی۔

اس رات، ۹ ستمبر کی اس طوفانی رات، کوئینی اور وجاہت اپنے دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد سونے کے لئے اوپر جا چکے تھے۔ تو بارہ بجے کے قریب ٹوٹو بنرجی کا فون آیا۔ ''یہاں بھی یک لخت فساد شروع ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی مال پر کئی آدمیوں کو چھرے بھونکے گئے ہیں۔ تم سب صبح ہوتے ہی جس قدر جلد ہو سکے

دہرہ چلے جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو ہم سب پھر جلد ہی اچھے دنوں میں دوبارہ ملیں گے۔ بھگوان تمہارے ساتھ رہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

انہوں نے راتوں رات جس قدر ممکن ہو سکا سامان پیک کیا اور صبح پو پھٹتے سمے مسوری کو الوداع کہہ کر نیچے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ بارش رات بھر برس کر تھم چکی تھی۔ بہت سہانی اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہر چیز دھلی دھلائی اور تر و تازہ تھی۔ بارش سے دھلی ہوئی چٹانوں اور پگڈنڈیوں پر انسانی خون کے چھینٹے چاروں طرف زیادہ تیزی اور سرخی سے چمک رہے تھے۔ جس وقت کوئینی ''وائلڈ روز'' کے دروازے بند کروانے میں مصروف تھی چچی ارنا کا فون آیا۔ وہ پھولے ہوئے سانس سے کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ سگرڈ کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

''لیکن چچی سگرڈ اور آپ سب تو کپتان صاحب کے ساتھ زیادہ حفاظت سے جا سکتی ہیں فوجی کونوائے کے ساتھ۔'' کوئینی نے ان سے کہا۔

''وہ؟..... وہ کمبخت تو صبح ہوتے ہی جان بچا کر پہلے کونوائے کے ساتھ بھاگ گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ اسی طرح سگرڈ کو چھوڑ کر وہ دہرہ سے اور آگے نہ نکل جائے۔'' چچی ارنا نے کہا۔

''اچھا چچی میں ابھی بوبی ممتاز کو فون کئے دیتی ہوں۔ وہ آپ لوگوں کے لئے ٹرک کا انتظام کر دے گا۔ اسے حکومت نے (EVACUATION) کے انتظام کے لئے ہی روک لیا ہے۔'' کوئینی نے کہا اور جلدی سے فون پر بوبی کو چچی ارنا کا پیغام پہونچا دیا.....!

جس وقت کوئینی کا فون پہونچا۔ بوبی منتظم آفیسر کے دفتر میں بیٹھا کونوائیز کی

فہرست پر نظر ڈالنے میں مصروف تھا۔ لحظہ بہ لحظہ فساد کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئینی کی اطلاع پر اس نے فوراً چند سپاہی خان بہادر صاحب کے گھر کی طرف روانہ کئے۔ اور دفتر سے باہر آیا۔ خداوند..... کیسی عجیب و غریب صورت حال تھی وہ خود اسے اپنے سے دور بھیجنے کا انتظام کر رہا تھا۔ وہ دیر تک سر کھجاتا رہا۔ اردلی کے ہاتھ کیا وہ اسے ایک پرچہ بھی بھیج دے لیکن یہ ایک انتہائی جذباتی بات ہو گی۔ پھر اس نے سوچا، واہ۔ اس میں جذباتیت کا کیا سوال ہے۔ ارے بھئی وہ اسے انتظامی سروس کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے یہ سرکاری اطلاع دے رہا ہے کہ فلاں فلاں وقت پر اسے ملٹری کونوائے کے ساتھ نیچے بھیجا جائے گا، اور بس۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے لکھا۔ ڈیر مس ربانی..... پھر اسے کاٹ کر ڈیر سگرڈ کر دیا۔ ڈیر سگرڈ۔ آج چار بجے سہ پہر کو تم لوگوں کے لئے فوجی حفاظت کی گاڑی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے خیریت سے نیچے پہونچ جاؤ فقط بوبی۔ لیکن پھر انتہائی بے ساختگی سے اس کے قلم سے نکل گیا..... سگرڈ..... سگرڈ..... سوچو تو..... تمہارے نام، یعنی مس سگرڈ ربانی کے نام یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے۔ کیونکہ ممکن ہے آج ہی شام سے یا کل سے تم مسز عثمان بن جاؤ گی۔ خداوندا..... یہ نہایت ہی بے تکی بات تھی جو اس نے لکھی۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ آخر میں یہ بھی لکھ دے کہ میری بہترین خواہشیں اور دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ چنانچہ اس نے یہ جملہ بھی بڑھا دیا۔ اور لفافہ بند کرنے لگا۔ یک لخت اسے خیال آیا کہ یہ انتہائی غلط بالکل جھوٹ بات اس نے لکھی کہ اس کی بہترین خواہشیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گی۔ وہ ان آئیڈیل قسم کے ہیروز میں سے قطعی نہیں تھا۔ جو اپنی محبوبی کی

شادی کے وقت نہایت عالی حوصلگی سے کہتے ہیں کہ تم جہاں رہو خوش رہو اور تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو لیا کروں گا۔ لاحول ولاقوۃ۔ اسے ہنسی آ گئی۔ ابھی وہ کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ یہی خط بھیج دے یا دوسرا پرچہ لکھے کہ سامنے سے رکشا میں نشاط اسٹیلے آتی نظر آئی۔

''او..... ہلو بوبی۔'' وہ چلائی۔..... وہ ذرا پریشان ہو کر اس کے قریب پہنچا۔

''ارے گھبراؤ مت، تمہارا نام بالکل عیسائیوں والا نام ہے۔ اس لئے تمہیں کوئی چھرا نہ بھونکے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''مصیبت تو میری ہے کہ غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی میرا مسلمانوں والا نام ہے۔ اب میں کرپان سے محفوظ رہنے کے لئے اپنا بپتسمہ والا نام اختیار کرنے والی ہوں۔ آؤ چل کر کہیں قہوہ پئیں۔ یہ دن اب کہاں میسر ہوں گے۔ تم سب بھاگے جا رہے ہو۔'' اس کی نقرئی آواز میں تاسف تھا۔

وہ غیر یقینی طور پر وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا۔

''بیوقوف مت بنو..... چلو میرے ساتھ۔'' اس نے بڑی بہنوں کی طرح ڈانٹا۔ اور اسے کھینچ کر رکشا میں بٹھا لیا۔

وہ اسٹینڈرڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔

''سنو تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' اس نے پرس کھول کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''کل ڈیڈی کا الہ آباد سے تار آیا ہے۔ میں امریکہ جانے کا ارادہ کر رہی تھی نا۔ اس کے لئے مجھے جہاز میں جگہ مل گئی ہے۔ تم بھی چلتے ہو امریکہ؟ چلے چلو بوبی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم بہت جلد سب کو بھول جاؤ گے۔ یہ سارا

سگرڈ کا قصہ..... ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تو کچھ عرصہ تک تم یونہی احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے رہو گے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

وہ اسٹینڈرڈ پہنچ گئے۔

اوپر جا کر وہ اپنے پسندیدہ گوشے میں بیٹھ گئی۔ اور بیرے کو آواز دینے کے لئے چاروں طرف دیکھا۔ سارا ہال بالکل خالی پڑا تھا۔ باہر سڑکوں پر سے بلوائیوں کی ہاہا کار کی آوازیں ہوا میں تیرتی ہوئی آ کر کھڑکیوں کے شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے، وہ غیر ارادی طور پر چند لمحوں تک ''سوانی! ہاؤ آئی لو یو۔ ہاؤ آئی لو یو'' کا پامال نغمہ گنگنا کر میز پر جاز کی گت بجاتی رہی، پھر دفعتہً چپ ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

بیرہ قہوہ لے آیا۔ بوبی نے خاموشی سے اپنی پیالی ختم کی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بوبی، کیا تم کو بہت جلدی ہے۔ کوئی ضروری کام ہے؟'' نشاط نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' بوبی نے غیر یقینی لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا تو سنو۔'' وہ رنجیدہ آواز میں بولی۔ ''تھوڑی دیر میرے پاس اور بیٹھے رہو۔''

وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔

''بوبی ڈیر.....'' کچھ دیر بعد اس نے دفعتہً کہا۔ ''خداوند خدا کی اس خوبصورت دنیا میں تمہیں کہیں سے خلوص مل گیا ہے؟ پاکیزہ اور شریف خلوص؟'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور اس کے سرد شیشوں پر اپنی

انگلیاں رکھ کر انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ ''بوبی ڈیر'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے ایک دفعہ کارنیگی کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اگر ایک کتے پر بھی تم مہربان ہو اور اس سے کسی گلی میں ملو تو وہ دس فٹ کے فاصلے پر ہو گا تو اپنی دم ہلانے لگے گا۔ اگر تم اس کی پیٹھ تھپک دو تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمائے گا۔ یہ اظہار محبت کسی خودغرضی کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ کوئی جائداد بیچنا نہیں چاہتا۔ نہ وہ تم سے شادی کا خواستگار ہے۔ بوبی ڈیر کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ کتا ہی ایک ایسا جانور ہے جس کو بغیر کام کیے کھانے کو مل جاتا ہے۔ مرغی انڈے دیتی ہے۔ گائے دودھ دیتی ہے، بلبل نغمہ سرائی کرتی ہے۔ لیکن کتا اپنی بسر اوقات صرف محبت پر کرتا ہے۔'' وہ رک گئی۔ ''میں اس وقت کیسی عجیب باتیں کر رہی ہوں۔''

وہ پھر اپنی انگلیوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ ''کیا تم جانتے ہو بوبی ممتاز کہ عورتیں صرف خلوص کی پرستش کرنا چاہتی ہیں۔ اور نرمی۔ اور مہربانی۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کریں۔ جس سے یہ محسوس ہو سکے کہ یہاں پر خلوص ہے، اور آسائش، اور محبت، اور زندگی کی سادگی۔'' پھر وہ یک لخت دریچے کی طرف مڑی اور گہری، رنجیدہ، صاف آواز میں کہنے لگی۔ ''بوبی تمہاری وہ بے حد معزز بہن کوئینی مجھے کیا سمجھتی ہے؟ غالباً کتا یا بلی یا اسی قسم کا کوئی بے عقل اور آسائش پسند جانور..... یا اس سے بھی کوئی اور زیادہ بری چیز..... تم میرا مطلب سمجھتے ہو نا..... سنو.....'' اس نے کرسی پر واپس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم جب کبھی اس سے ملو۔ تم اس سے ضرور ملو گے۔ ہم سب ایک

دوسرے سے اچھے دنوں میں دوبارہ کبھی نہ کبھی ضرور ملیں گے۔تو تم اس سے کہنا کہ دنیا کی ساری عزت، اخلاق کا سارا اعلیٰ معیار، ساری اچھائی صرف اسی کی ملکیت نہیں ہے۔دنیا کے برے انسان بھی اتنے ہی اچھے بن سکتے ہیں۔یہ ساری بری لڑکیاں..... روبی کھوچڑ، اور انوری خاں اور سگرڈ ربانی بھی اسی کی طرح اچھی اور اونچی بن سکتی ہیں۔انسانیت کی حقیقی اور آخری اچھائی ہم سب میں موجود ہے ہم سب خلوص اور محبت اور زندگی کی سادگی کے اہل ہیں۔''پھر وہ چپ ہوگئی۔اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

بوبی نے پہلی مرتبہ اس ہمیشہ ہنستے اور ناچتے رہنے اور دوسروں کا مذاق اڑانے والی تیتری کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔اس نے کوئینی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے جب پچھلے دنوں وجاہت کو برون کو نمونیہ ہوگیا تھا۔اسے یاسمین روتی نظر آئی تھی، جب اس کا بلی کا بچہ مرگیا تھا۔اس نے لوکو چپکے سے آنسو پونچھتے دیکھا تھا۔جب فریڈا سے ڈانٹ دیتا تھا۔لیکن نشاط اسٹیلے کے آنسو۔یہ بالکل نئی اور غیر متوقع چیز تھی۔

دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔''اچھا بوبی۔اب تم چلے جاؤ۔فساد زوروں پر ہے خدا کرے تم خیریت سے یہاں سے نکل سکو۔مجھے کبھی کبھی یاد کرلینا..... خداوند خدا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔''

وہ بھاری بھاری قدم رکھتا زینہ طے کرکے نیچے آ گیا۔اسی روز آخری گیٹ سے وہ بھی مسوری کو خیرباد کہہ کر میدانوں میں آ گیا۔اور پاکستان کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسرے دن ''وائلڈ روز'' لوٹ لیا گیا۔ اس کے سجے ہوئے خوبصورت کمرے، عمر بھر کی محنت اور شوق سے جمع کی ہوئی کتابیں اور تصویریں، پرانے نوادر سے سجا ہوا لاؤنج۔ سب کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اسٹیلے ہال میں بھی آگ لگا دی گئی اور اس کی ساری شان و شوکت پلک جھپکتے میں اللہ کو پیاری ہوئی۔

''وائلڈ روز'' کے مشرقی دریچے سے چند گز کے فاصلے پر جو خوبصورت سرسبز پہاڑ لاکھوں برس سے وہاں کھڑا تھا اسی سکون اور بے نیازی سے موجود رہا۔ اس کے جھرنے اسی طرح مترنم تھے۔ اور اس پر اسی طرح سفید اور نیلے پھول کھل رہے تھے۔

وقت تیزی سے آگے نکلتا گیا۔

پھر بوبی ممتاز نے کسی سے سنا کہ نشاط اسٹیلے نیویارک پہنچ گئی ہے۔ کوئینی اور اس کا گروپ لکھنؤ میں تھا۔ جیوتی لال کی بمبئی کی زندگی یقیناً ویسی ہی گزر رہی ہو گی۔ اس کا وال کیشو رروڈ کا مکان، اسٹوڈیوز۔ ریس کورس۔ پھر اس نے سنا کہ وہ لکھنؤ فلائینگ کلب کا بے حد سرگرم ممبر بن گیا ہے۔ اور گھنٹوں اپنا طیارہ فضا میں اڑاتے پھرنے کے بعد جب زمین پر اترتا ہے تو مایا کے اس چکر سے کافی مطمئن معلوم ہوتا ہے۔

مغربی یو۔پی کے فسادوں میں بے حد نقصان اٹھانے کے بعد انیس اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاہور آ گیا تھا۔ اور کسی کاروبار کی فکر میں تھا۔ وہ مسوری کے زمانے سب خواب و خیال ہو گئے۔

خداوندا..... یہ چھ سال..... یہ چھ سال..... گھڑی اسی طرح ٹک ٹک کرتی

رہی..... آٹھ پچپن..... برابر کے کمرے میں ریڈیو پر موسم کی رپورٹ جاری تھی۔

''آج شمال میں برف باری ہوگی۔شمال مغرب میں بارش کے چھینٹے پڑیں گے۔ جنوب میں تیز ہوائیں چلیں گی۔''

کارڈ روم میں سے کچھ لوگ پھر برابر والے کمرے میں واپس آ گئے۔ان کی باتوں کی آواز ریڈیو کی آواز پر غالب آ گئی۔

''یہ کیا اس مہینے کا اون لکر ہے؟'' کسی نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

اون لکر کے ورق سرسرانے لگے۔

''ارے یہ کس کی تصویر ہے..... مسز سگرڈ عثمان..... پہلے نے ایک صفحے پر رک کر پوچھا۔

''اوہ..... یہ ہے سگرڈ عثمان.....؟ دوسرے نے کہا۔

''آہ..... دیٹ ربانی گرل.....!! خوب چیز تھی۔'' تیسری آواز آئی۔

''ہاں۔لیکن افسوس کہ اس نے شادی کر لی..... کب کی؟'' چوتھے نے پوچھا۔

''ستمبر میں غالباً..... میں تو اس وقت تک جبلپور ہی میں تھا۔جب میں نے سنا تھا کہ عثمان چھٹی لے کر شادی کرنے مسوری جا رہا ہے۔'' پہلے نے جواب دیا۔

''اوہ.....!'' پھر وہ سب ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

سنسان لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے بوبی ممتاز نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی سیکنڈ اور منٹ کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔نو بج چکے تھے۔وہ کھانے کے

ہال کی طرف جانے کے لئے لاؤنج میں سے نکل کر گیلری کے دروازے میں آ گیا گیلری کے اختتام پر تاریک برآمدے میں سے گزرتی ہوئی دو لڑکیاں ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھیں۔

''اوہ..... یہ اس کی بالکل شراب انڈیلنے والی آنکھیں.....'' ان میں سے ایک نے بوبی کو گیلری میں سے نکلتا دیکھ کر چپکے سے اپنی ساتھ والی لڑکی سے کہا۔

''ہاں..... بالکل شراب انڈیلنے والی آنکھیں۔'' دوسری نے آہستہ سے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ وہ دونوں آگے جا کر ستونوں کے سائے میں غائب ہو گئیں۔

اندر اسی طرح اجنبی لوگوں کی باتیں جاری تھیں۔ بوبی..... بوبی..... وہ ساری پرانی مانوس آوازیں اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئیں۔ بوبی..... بوبی..... بوبی ممتاز.....

''ممتاز صاحب.....'' اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے میزبان کی بیگم صاحبہ برآمدے کی سیڑھیوں پر ہاتھ میں ناشتہ دان تھامے کھڑی تھیں۔ ''ممتاز صاحب واہ آپ بھی خوب ہیں۔ ہم اتنا آپ کو روکتے رہے اور آپ بغیر کھانا کھائے ہی بھاگ آئے۔ آج تو میری سعیدہ نے خود سویاں پکائی ہیں..... بڑا شوق ہے اسے کھانا پکانے کا..... اس کے ابا برج کھیلنے کلب آ رہے تھے۔ تو میں نے سوچا سویوں کی ایک پلیٹ ان کے ہاتھ آپ کو بھیج دوں..... پھر میں خود ہی چلی آئی۔''

وہ ایک لمبا، گہرا سانس کھینچ کر برآمدے میں آ گیا۔

باہر برف گرنی شروع ہو چکی تھی۔

کیکٹس لینڈ

اب خزاں بھی واپس جا رہی ہے۔ اور سفیدے کے جنگل پر ہریالی اتر رہی ہے اور جھیل کے پردے کنارے تک پھیل آئے ہیں۔ اور جب سبز بانس کا جھنڈ پانی کی سطح پر جھک کر ہوا میں ڈولتا ہے۔ تو چپکے سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ سفیدے کا چھوٹا سا جنگل اس طرح چپ چاپ کھڑا ہے۔ اور اسی کی خانقاہ بھی اسی طرح خاموش اپنی جگہ پر موجود ہے اور کبھی کبھی کوئی راہ گیر پتوں کو روندتا سفیدے کے جھنڈ میں سے گزر جاتا ہے۔

میری کیسل! تم نے اس موسم، ان سرخ پتوں اور اس راہگیر کی تصویر کیوں نہیں بنائی۔ خزاں جا رہی ہے۔ اور راتوں کو مٹی میں سے پھولوں کی مہک نکلتی ہے اور وہ زمانہ آنے والا ہے۔ جب لوگ گھروں سے نکل کر پانی کے کناروں پر ٹہلتے ہیں اور پورب کے کھیتوں اور گیتوں کو یاد کرتے ہیں۔

وہ دن بھر سمر ہاؤس میں بیٹھی رہتی ہے۔ اور پتے چاروں طرف اڑتے ہیں۔ اور اسی کے گھنٹے جھیل کے پار اپنی متوازن یکسانیت سے بجتے رہتے ہیں۔ ابھی ڈوبی آئے گا اپنا گھوڑا درخت کے نیچے باندھ کر لمبے لمبے بے فکر قدم رکھتا گھر کی طرف مڑے گا۔ اور چائے پینے کے بعد شام کو پھر شہر کی طرف نکل جائے گا۔ فضا میں بہار کی نئی ہواؤں نے منڈلانا شروع کر دیا ہے اور بانس کی ٹہنیاں آہستہ آہستہ سرسرا رہی ہیں۔ میں سوئٹزرلینڈ جا رہی ہوں۔ وہ خط میں لکھتی ہے۔ میں

سوئٹزرلینڈ جارہی ہوں۔ وہاں سے بلجیم چلی جاؤں گی عطیہ آج کل وہیں ہے۔ اور کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ وہ پچھلی بین الاقوامی آرٹ کی نمائش کے لئے گئی تھی۔ اور اب تک نہیں لوٹی۔ لکھتے ہی وہ خط کو پرزے پرزے کر کے کسی گملے کے پیچھے پھینک دیتی ہے جہاں ایک بڑی سبز مکھی کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر بھنبھنا رہی ہے اور اس کی آواز باہر کی ہواؤں کی گونج میں مل جاتی ہے۔

میں سوئٹزرلینڈ ہرگز نہیں جارہی ہوں۔ وہ لکھتی ہے اس کے لئے سب جگہیں ایک سی ہیں۔ لندن۔ چنگنگ۔ روم۔ روم جہاں شکنتلا ہے۔ اندھیرا گرتا آرہا ہے۔ اور شام کی ہوائیں بہہ رہی ہیں۔ سمر ہاؤس کے باہر سایہ دار راستے کے پتوں میں مدھم سا بلب جھلملا اٹھا ہے۔ اور اس روشن پر اجالا پھیل گیا ہے۔ جو گھر کی طرف جاتی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔ اور بہار کی آمد آمد ہے۔ جھیل کے پار، اسی کے باغ پر خاموشی طاری ہے۔ اور سفیدے کے جنگل کے کنارے کنارے جو راستہ جاتا ہے۔ اس پر وہ سرخ پتھروں والا گھر ہے۔ جو آم کے درختوں میں گھرا ہے۔ جہاں وہ رہتا تھا۔

صبح کو لکڑی کے پل پر سے گزر کر راہبوں کی سفید پوش ٹولیاں عبادت خانے کے راستے کی طرف جاتی ہیں۔ جدھر خوبانی کی ہری ٹہنیوں کے نیچے وہ لودور کی مریم کی پرستش کرتے ہیں۔ اور سنہری بالوں والے بچے وہاں جنگلی پھل چننے کے لئے آتے ہیں۔

یہ اس کا گھر ہے۔ اس گھر میں وہ برسوں سے رہتی آئی ہے۔ اس زمین پر وہ

سب صدیوں سے جیتے اور مرتے رہے ہیں۔ یہ گھر، یہ باغ۔ یہ سمر ہاؤس۔ جھیل کے پار حد نظر تک پھیلے ہوئے کھیت اور چراگاہیں اور ایک بار ایسا ہوا کہ وہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ بہت دور چلے گئے۔ اور اب کبھی ان جگہوں کی خاموش اپنائیت، ان کی چپ چاپ پکار سننے کے لئے واپس نہ آئیں گے۔ سفیدے کے جنگل کے کنارے اس راستے پر باغیچوں اور درختوں کے کنجوں میں چھپے ہوئے سارے گھر خاموش کھڑے ہیں کبھی کبھی کوئی مالی یا کہار آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندر سے نکل کر احاطے کے پھاٹک پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور ناریل کو بے دلی سے کریدنے کے بعد اکتاہٹ کے ساتھ جھیل کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پھر اندر چلا جاتا ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کار خاموشی سے کسی پھاٹک سے برآمد ہو کر سفیدے کے جھنڈ میں سے شہر کی سمت گزر جاتی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔ اور شام کی تاریک ہوائیں باغ پر منڈلا رہی ہیں۔

میری کیسل۔ کیا تم اس تاریکی کی تصویر نہ بناؤ گی؟

اور وہ جو وہ پیلو سعید ہے۔ سمر ہاؤس میں چپ چاپ بیٹھی ہے۔ جھیل کے پار اسی کی خانقاہ کے گھنٹے یک لخت بجنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور اب سفید پوش راہب اور سنہرے بالوں والے لڑکے شام کی نماز کے لئے ہاتھوں میں چاندی کی اونچی موم بتیاں اٹھائے پل پر سے گزر رہے ہیں اور سفیدے کا چھوٹا سا جنگل چپ چاپ کھڑا ہے۔

اسی کے گھنٹے بج رہے ہیں اور سفیدے کے جنگل اور سبز بانس کے جھنڈ پر

اندھیرا گرتا آ رہا ہے۔

خداوند ہمارے پرکھوں کے خدا، جو ہمیشہ سے تھا، اب ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوند ہمارے خدا کے برے جو دنیا کے گناہوں کو اٹھالے جاتا ہے۔

خداوند ہمارا خدائے مطلق جو ابدالآباد تک جیتا اور سلطنت کرتا ہے۔

خوبانی کے جھنڈ میں مریم کی مورتی کے آگے جھکے وہ دعا مانگ رہے ہیں۔ اے سینٹ این کی بیٹی ہم پر رحم کر۔ رحم کر۔

ہم حوا کے بدنصیب فرزند اس آنسوؤں کی وادی میں سے روتے چلاتے ترے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ہم خاک اور گناہ سے بنے ہوئے انسان بہت کمزور اور بہت نالائق ہیں۔ ایسا ہو کہ ہماری گریہ وزاری تیرے حضور میں پہنچ جائے!

اے ملکۂ جنت ہم پر اپنا فضل کر۔

اے خدا کے برے، گو میری چھت اس لائق نہیں کہ تو اس کے نیچے آئے۔ لیکن اگر تو ایک بات کہہ دے تو میری روح بچ جائے گی۔

اسی کے گھنٹوں کی گونج فضا میں منڈلاتی، پھیلتی اور ڈوبتی جا رہی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔ وہ جو پیلو سعید ہے۔ اور نئے دیس کو جا کر وہاں سے لوٹ آئی ہے۔ اور اس نے دیکھا ہے کہ سفیدے کا جنگل اتنا ہی خوبصورت ہے۔ اور اسی کے گھنٹے اسی طرح گونج رہے ہیں۔ اور راستے کے سرے پر آموں میں گھرا ہوا سرخ اینٹوں والا گھر بند پڑا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں سے جا چکا ہے۔

اور کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ وہ نئے دیس کو اپنا چکا ہے۔ اس نے اپنی اس پرانی زمین کی پکار کو نہیں سنا اور اس پکار کو سننے کے بعد جو جذبہ اس نے محسوس کیا۔ اسے اس نے شکست دے دی۔ اور آگے چلا گیا۔ لیکن بانس کی شاخیں اسی طرح سرسرا رہی ہیں۔ اور بہار آنے والی ہے۔

خزاں آہستہ آہستہ واپس جا رہی ہے۔ میری کیسل۔ کیا تم اس موسم، ان سرخ پتوں، اور ان تاریک ہواؤں کی تصویر بناؤ گی؟

خزاں واپس جا رہی ہے۔ آؤ ہم بھی اس کے ساتھ لوٹ چلیں۔ اور پیچھے۔ اور پیچھے۔

(۲)

آسمان کی ملکہ۔ زمین کی مالک۔ صبح کے روشن ستارے۔ ایلیلیاہ۔ گھنٹے بجنے بند ہو گئے۔ ہال میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ ان گنت رنگ برنگے بالوں والے سر سامنے میزوں پر جھکے ہوئے تھے۔

اپنی انگلیوں میں جو روشنائی لگ گئی تھی، جلدی سے اپنے بالوں میں انہیں پونچھ کر اس نے ڈائس پر جا کر دوسری کاپی لی اور اپنی میز کی طرف مڑی۔ اس وقت اس نے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ وہ لڑکی جو عمر میں اس سے بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔ جس نے اپنے سیدھے سیاہ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا

تھا۔ اور جس کے کلاسیکل قسم کے پروفائیل سے غرور، خود پسندی اور احساس برتری کا عجیب سا امتزاج مترشح تھا۔ اس کے ٹیونک کا رنگ مختلف تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے اسکول سے، غالباً مارٹینئر سے امتحان دینے کے لئے وہاں آئی تھی، بے تعلقی کے ساتھ وہ اجنبی لڑکی اپنی میز پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف رہی۔

میں قطعی طور پر اس کو پسند نہ کروں گی۔ وہ جو پیلو سعید تھی اس نے بچوں کی طرح دل میں طے کیا اور دوبارہ انگلیاں بالوں میں صاف کر کے لکھنے میں مشغول ہوگئی۔

یہ سینئر کمبرج کے امتحان کا آخری روز تھا۔ باہر خانقاہ کے باغ میں دسمبر کی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے اور سفیدے کے جھنڈ خاموش پڑے تھے۔

پھر گھنٹے بجے اور اسی کے ہال سے وہ سب باہر نکل آئیں۔

''میں طلعت جمیل ہوں۔'' اجنبی لڑکی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اسی بے تعلقی سے مڑ کر اسے مطلع کیا۔ ''عطیہ فاروق کی کتابیں اگر ابھی آپ کے پاس موجود ہوں تو آپ اومیشوری سپرو کے ذریعے مجھے انہیں مارٹینئر بھجوا دیجئے گا۔''

''تم پر خدا کی لعنت ہو طلعت جمیل۔'' اجنبی لڑکی کو مجمع میں سے غائب ہوتا دیکھتے ہوئے اس نے جو پیلو سعید تھی، چپکے سے کہا۔ اور پھر اپنے بال پیچھے کو سمیٹ کر باہر آ گئی۔

سفیدے کے جھنڈ اور لکڑی کا پل عبور کر کے وہ بہت اکتاہٹ کے ساتھ اپنے گھر پہنچی۔

گھاس پر دھوپ میں اس کی چھوٹی بہن، بلیاں اور خرگوش بیٹھے تھے۔ اس کا بھائی ڈوپی برآمدے میں کمینو سے کرین بنانے میں مشغول تھا۔ پہلو کے برآمدے میں ابی پیچوان گڑگڑا رہے تھے۔ پیچھے مرغیاں کٹ کٹ کرتی پھر رہی تھیں۔

''منہ کیوں لٹکائے ہو کر دیا پڑا پرچے کا؟'' ڈوپی نے چلا کر بشاشت سے دریافت کیا۔

''پہلے جا کر کھانا بھتر لو۔ پھر آ کر مطلع فرماؤ کیسا رہا پرچہ۔ گھاس پر سے شیرو اس کی چھوٹی بہن چلائی۔

''ابھی ہائی کمانڈ کی طرف سے پریس نوٹ ریلیز ہوا ہے کہ کرسمس گزارنے کے لئے تم دونوں نہایت نامعقول لڑکیوں کو دوبارہ پھوپھی بیگم کے یہاں لے جایا جائے۔'' ڈوپی نے پیچوان کی آواز کی طرف اشارہ کر کے بے حد اہمیت سے اطلاع دی۔

''ہائے رے۔ ابھی کچھ اور امور خانہ داری سیکھنے باقی ہیں؟'' شیرو نے فکرمندانہ لہجہ میں پوچھا۔ پچھلی چھٹیوں میں ان دونوں کو اپنی ایک خالہ کے ہاں کھانا پکانا سیکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن وہاں وہ کھانا پکانے کے بجائے خالہ کے چمپین لڑکوں کے ساتھ دن بھر اسکیٹنگ کیا کرتی تھیں۔

''اور پھوپھی بیگم کے ہاں آئے ہوئے ہیں بڑے ابا..... ان کی ٹرینگ میں

دیا جائے گا تم دونوں کو۔'' ڈوپی نے پھر مطلع کیا۔ لڑکیوں نے ایک دوسری کو سہم کر دیکھا۔ اور اندر چلی گئیں۔

اس وقت پھوپھی بیگم کے ہاں جانے کے لئے پیکنگ کرتے کرتے رک کر پیلو نے یک لخت ڈوپی سے پوچھا۔ ''ڈوپی بھیا۔ تم طلعت جمیل کو جانتے ہو؟ تمہارے مارٹینئر ہی میں ہے شاید۔ بڑی سی لڑکی ہے۔ لمبی سی ناک سمجھتی ہے اپنے آپ کو ہیلن آف ٹرائے.....''

''ارے وہ..... طلعت آپا چچا فاروق کے ہاں جو رہتی ہیں؟ کیوں۔ تم نہیں جانتیں انہیں؟'' ڈوپی نے سیٹی بجاتے بجاتے رک کر کہا۔

''چچا فاروق کے یہاں.....؟''

کے گھر پر رہتی ہیں۔ ان کے ابا سر فاروق کے بہت گہرے دوست تھے۔'' ڈوپی نے جواب دیا۔

''اچ چھا..... تعجب ہے کہ میں نے پہلے کبھی ان کو نہیں دیکھا۔''

''زیادہ تر تو طلعت آپا بورڈنگ ہاؤس میں رہتی تھیں اسکول کے۔ نینی تال میں تو ہم روز ان کے ساتھ رائیڈنگ کے لئے جایا کرتے تھے۔'' ڈوپی نے مطلع کیا۔

''تم بہت مرعوب معلوم ہوتے ہو طلعت آپا سے اپنی.....'' پیلو نے اور بھی جل کر کہا۔ اور پیکنگ میں مشغول ہو گئی۔

پھوپھی بیگم کا گھر ایک قسم کا ریفارم اسکول تھا۔ جہاں خاندان بھر کے سارے بچوں کو جو زیادہ شرارتیں کرتے تھے، ٹریننگ کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ ہمیشہ

چھٹیوں میں کنبے کے سارے کزن وہاں جمع ہوتے۔ اور زیادہ شرارتیں کرتے۔ دن بھر غل مچتا۔ درختوں پر چڑھ کر کھانا کھایا جاتا۔ الماریوں میں گھس کر میوزک کانفرنسیں منعقد ہوتیں۔ پلنگوں کے نیچے اور صوفوں کے پیچھے چھپ کر مشاعرے ہوتے۔ حالات جب پھوپھی بیگم کے جوگویا ڈائریکٹر جنرل تھیں۔ قابو سے باہر ہو جاتے تو پریشانی کے عالم میں بڑے ابا کو بلایا جاتا جو ڈی۔ آئی جی پولیس ہونے کی وجہ سے بے حد ڈکٹیٹر قسم کے انسان تھے۔ اور ساتھ ساتھ اپنے خیال میں مصلح ملک وقوم بھی تھے اور نئی پود کی طرف سے سخت مایوس تھے۔ لہٰذا دن بھر وہ مختلف زاویوں سے لیکچر پلاتے رہتے۔ حکم یہ تھا کہ چھٹیوں کا ایک لمحہ بھی بیکار نہ گنواؤ۔ باغ میں جاؤ تو درختوں پر چڑھنے اور کود پھاند مچانے کے بجائے بوٹنی پریکٹیکل میں مشغول رہو۔ کھانے کے وقت فضولیات میں ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے ملک کی غذائی حالت اور حیاتین کے فوائد اور غذائیات سے متعلق دوسرے مسائل پر سنجیدگی سے تبادلۂ خیالات کرو۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کے بجائے صرف کلاسیکل موسیقی سنا کرو۔ اور ہائی بروٹیسٹ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ جس کا تم لوگوں میں فقدان ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حکم تھا کہ مجمع میں صرف جنرل دلچسپی کی باتیں کی جائیں۔ لڑکے کرکٹ کا تذکرہ ہرگز نہ چھیڑیں اور لڑکیاں کسی حالت میں بھی قابل معافی نہیں اگر وہ کپڑوں اور نیٹنگ کے نمونوں کی باتیں شروع کر دیں۔ جہاں تک ہو سکے قانون، ریاضی، کیمسٹری، معاشیات وغیرہ کا تذکرہ نوجوانوں کو کرنا چاہئے۔ اور ہر وقت خدا کو یاد کرنا اور بھی زیادہ بہتر ہے۔

رات کے کھانے کے بعد سب نشست کے بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے جو

شکار کئے ہوئے شیر، چیتوں اور بارہ سنگھوں کے سروں اور کھالوں سے پر تھا۔ وہیں بڑے ابا کا پیچوان لا کر رکھا جاتا اور قیلولے کے بعد بڑے ابا ایک زوردار ہونہہ کر کے آ بیٹھتے اور پھر نئی پود کو سدھارنے کی کوشش شروع کرتے۔ نئی پود نے ان نشستوں کا نام ایکسٹنشن لیکچرز رکھ چھوڑا تھا۔

پیچوان کی نے ایک طرف کو رکھ کر اور عینک اتار کے بڑے ابا اپنے بھتیجوں بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں کے انتہائی نالائق گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے قانون کی موشگافی شروع کرتے اور تواریخ، اسلامیات، اخلاقیات کا تذکرہ ہوتا۔ کمرے کے سرے پر کمایوں کے ایک گلدار کا سر رکھا تھا۔ جس کے متعلق روایت تھی کہ بڑے ابا اسے اس کی مونچھوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے ہمراہ خیمے تک لے آئے تھے اور پھر وہاں آرام سے مسہری پر بیٹھ کر اس کا شکار کیا تھا۔ سامعین اکثر اکتا کر اسے دیکھتے رہتے۔ بڑے ابا اپنے لیکچر عموماً اسی گلدار کے ذکر سے شروع کرتے۔ ''اے نالائق بچو..... اس خوش قسمت گلدار کو دیکھ کر عبرت پکڑو۔ جسے میں نے بائیں ہاتھ سے اور دونوں آنکھیں بند کر کے مارا تھا۔ اور تمہارا یہ حال ہے کہ تم لوگ اپنا نشانہ درست کرنے کی طرف سے بالکل غافل ہو۔ بس دن بھر فلمی گانے۔ ہونہہ۔''

''بڑے ابا یہ گلدار تو ہم لوگوں کو دیکھ کر کچھ بہت زیادہ بشاش نہیں ہے۔ افیمچیوں کی سی شکل بنائے بیٹھا ہے۔ کیوں نہ ہم اس بارہ سنگھے کو دیکھ کر عبرت پکڑیں جو آپ نے.....''

''بس پھر بولے بیچ میں۔ ساری قیامت یہ ہے۔ کہ تم لوگوں میں ڈسپلن

نہیں۔ بالکل ہے ہی نہیں ڈسپلن۔تم لوگوں میں تو ایسا ڈسپلن ہونا چاہیے۔ جیسے ایک فیلڈ مارشل جو جہاز کے مستول کے پاس کھڑا ہو اور.....''

''لیکن بڑے ابا جہاز کے مستول کے پاس تو فلیگ آفیسر کمانڈنگ کھڑا ہوتا ہے یوں خیال فرمائیے کہ ایک گورنر جنرل کی طرح جو.....'' کوئی بول اٹھتا۔

''جو..... جو باورچی خانے میں کھڑا حلوہ تیار کر رہا ہے.....'' دوسرا اپنی رائے کا اظہار کرتا۔

''ہرگز نہیں۔ بلکہ جو گھوڑے پر سوار ہے۔اور گھوڑے کی دم پکڑے بھاگا چلا جا رہا ہے بگٹٹ.....'' تیسرا کہتا۔

''تو آپ کے خیال میں گورنر جنرل کے گھوڑے کی دم بھی ہونی چاہیے؟'' کوئی لڑکی سنجیدگی سے دریافت کرتی۔

''تمہارے رائے ہے کہ دم کٹا گھوڑا ہوگا گورنر جنرل کا.....؟'' دوسری اس سے بگڑ کر پوچھتی۔

''بہرحال، اگر گورنر جنرل کو دم کٹا گھوڑا ہی پسند ہے تو کیا میں یا آپ اسے روک سکتے ہیں کہ میاں دم کٹے گھوڑے پر سوار نہ ہو۔'' اور کوئی جواب دیتا۔اور پھر نہایت شدومد سے گھوڑوں پر تبادلۂ خیال شروع ہو جاتا۔بڑے ابا بے بسی کے عالم میں خاموشی سے ان سب کو دیکھتے رہتے اور پیچوان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

کزن لوگ ایک دوسرے سے بحثیں کرتے کرتے الجھ پڑتے۔کوئی اپنا نظریہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر پوچھتا۔''کیا سمجھتے ہو تم، میرے سر میں عقل نہیں ہے؟''

''جی۔'' کوئی چھوٹا بھائی جواب دیتا۔

''جی کیا نہیں ہے میرے سر میں عقل؟''

''جی نہیں ہے۔''

''کیا نہیں ہے۔''

''عقل۔''

''کس کی۔''

''آپ کی۔ سر میں آپ کے۔''

''میرے سر سے تمہیں کیا مطلب۔ کون پوچھ رہا ہے تم سے؟''

''ہیں؟''

دیر تک بلوہ ہوتا رہتا۔

بڑے ابا رنج سے سر ہلا کر کہتے۔ ''بس ان لوگوں کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہر وقت فضول کی بحثیں ہر وقت پنگ پنگ۔''

''پونگ۔ بڑے ابا۔'' کوئی چپکے سے کہتا۔

''پونگ کیا؟'' بڑے ابا گرج کر غصے سے پوچھتے۔

''پنگ پونگ۔'' آہستہ سے ان کی تصحیح کی جاتی۔

''کچھ نہیں۔ اصلاح ناممکن ہے۔ قطعی ہو ہی نہیں سکتی۔ بس ہر وقت پنگ پنگ کھیلا جائے گا۔ ہر وقت۔'' بڑے ابا بڑبڑاتے ہوئے اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے۔

چھٹیاں شروع ہوئیں اور پیلو، شیرو اور ڈوپی پھوپھی بیگم کے ہاں پہنچے۔ وہاں

ان کے دوسرے سب کزن بھی حسب معمول چھٹیاں گزارنے آن پہنچے تھے۔ شکار کے لئے کچھ فاصلے پر ترائی میں کیمپ کیا گیا تھا۔ اپنی رینج کا دورہ کرتے بڑے ابا بھی وہاں پہلے سے آ چکے تھے۔

ایک روز وہ سب بڑے ابا سے مختلف بندوقوں کی اقسام و اوصاف پر ایک ایکسٹینشن لیکچر سننے کے بعد الاؤ کے گرد تازہ دم ہونے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ خیموں کی طرف دفعتہً غل مچا کہ چچا رجو آ گئے۔ چچا رجو..... سب ہڑبڑا کر پھوپھی بیگم کے خیمے کی طرف بھاگے۔

چچا رجو کنبے کی ایک عجیب و غریب پراسرار شخصیت تھے۔ جوانی کے زمانے میں وہ اپنے گھر والوں سے خفا ہو کر کہیں چلے گئے تھے۔ اور اب دنیا بھر کی سیر کرنے کے بعد اچانک واپس آن پہنچے تھے۔

''چچا تم تو بوڑھے ہو گئے بالکل۔'' پیلو نے ان کے سفید بال دیکھ کر حیرت سے کہا۔

اب ہم چچا رجو سے ان کی سیاحت کی کہانیاں سنا کریں گے۔ بڑے ابا کے لیکچر اگلی چھٹیوں تک ملتوی۔ سب نے خوش ہو کر سوچا۔

چچا رجو اپنے ساتھ قصوں کا ایک خزانہ لے کر واپس آئے تھے۔ ہر چیز میں ان کو دخل تھا۔ طب، فلسفہ، قانون، تصوف، کلاسیکل موسیقی۔

دنیا بھر کے واقعات اور قصے وہ سناتے اور سب انتہائی دلچسپی سے سنتے۔

ایک روز سب اپنی میوزک کانفرس میں مشغول تھے۔ چچا رجو سے بھی شدید اصرار کیا گیا کہ وہ کچھ گائیں۔

''ارے بیٹا۔ اب میں کچھ نہیں گا سکتا۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر افسوس کے ساتھ کہا۔

''کیوں چچا؟'' سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''ارے میاں۔ بہت لمبا قصہ ہے۔ جب یاد آتا ہے تو دل دکھتا ہے۔ بیٹا۔ ہمالیہ پر میں ماؤنٹ ایورسٹ کے نیچے بارہ سال تک لے باندھ کر بیٹھا تھا۔ ایک دفعہ بھگوان شیو کو آ گیا غصہ اور میری لے توڑنے کے لئے وہ مچھر بن کر میری ناک میں جا گھسے اور مجھے چھینک آ گئی اور لے ٹوٹ گئی۔ بارہ سال تک باندھی ہوئی لے ایسی ٹوٹی کہ میری ساری تپسیا بیکار گئی۔ چنانچہ اب میں گا ہی نہیں سکتا۔'' چچا رجو نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ہنستے ہنستے سب لوٹ گئے جب ذرا ہنسی رکی تو چچا نے کوئی اور قصہ چھیڑ دیا۔ فن لینڈ میں جب میں تھا یا برازیل جب میں پہنچا۔ اپنی سیاحت کے تذکروں کے ساتھ ساتھ چچا ان ملکوں کی عجائبات کے نمونے بھی دکھاتے۔ جو انہوں نے ساری دنیا میں گھوم پھر کر جمع کئے تھے۔ ریڈ انڈین لباس کے پر۔ اسکیموز کی ٹوپیاں۔ تبت کی چار دانی۔ چچا کو رنجیدہ کسی نے نہ دیکھا تھا ہر وقت سب کے کام آنے کی کوشش میں رہتے۔ خاندان کے نوجوان افراد میں وہ بے حد مقبول ہو گئے۔ لیکن دوسرے لوگوں پر وہ پھر کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ اتنے طویل عرصے کی غیر موجودگی کے بعد کوئی کامیابی حاصل کئے یا روپیہ کمائے بغیر وہ پھر آن پہنچے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ پیلو اور شیرو کے ہمراہ ان کے گھر آ گئے۔ جہاں ان کو پیچھے کی طرف کا ایک فالتو سائیڈ روم دے دیا گیا۔ جس کے سامنے وہ دن بھر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے یا مرغیوں اور خرگوشوں کی دیکھ بھال

کرتے۔مہینہ میں ایک آدھ بار انہیں زمینداری کے کسی کام پر گاؤں کا چکر لگانے کے لئے بھیج دیا جاتا گھر میں ان کی حیثیت بن بلائے غریب رشتہ دار کی تھی۔لیکن پھر بھی اپنے بھروہ سب کے کام آنے کی فکر میں لگے رہتے اور ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے۔

ایسٹر بھی نکلا اور موسم گرما آ گیا۔پھر بارشوں کا زمانہ آن پہنچا اور سفیدے کے جنگل اور بانسوں کے جھرمٹ پر پانی برسنا شروع ہو گیا۔جھیل کے کناروں کا سبزہ دور دور تک پھیل گیا۔

کالج کھلا۔اور نئی ٹرم کے پہلے روز پیلو کو وہ اجنبی لڑکی دوبارہ کیمپس کے سبزے پر نظر آئی۔سفید ساری میں وہ زیادہ عمر کی اور زیادہ مغرور نظر آ رہی تھی۔ اس وقت وہ انیس بیس سال کی رہی ہو گی۔ڈھیلے سے جوڑے میں سفید پھول لگائے۔بے حد بھاری بھرکم طریقے سے چلتی ہوئی، وہ سولہ سالہ پیلو سعید کو ایک بے تعلق اور مشفقانہ سا ہلو، کہہ کر آگے چلی گئی۔

پھر، چار سال وہ اس کالج میں ایک جماعت میں اکٹھی رہیں۔

لیکن اسی کے امتحان کے ہال میں جو خاموش قسم کا مخالفت کا جذبہ جو عجیب و غریب جھنجھلاہٹ پیلو کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔وہ کبھی نہ نکل سکی۔اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔لیکن پھر بھی وہ نفرت اپنی جگہ پر موجود تھی۔وہ پیلو سعید جس کو سب اتنا پسند کرتے تھے۔اس مغرور لڑکی کی اتنی ہمت کہ اس نے پیلو سے مرعوب ہونے سے قطعی انکار کر دیا۔تم پر خدا کی لعنت ہو طلعت جمیل۔تم جو سفید ساری پہنے ہیلن آف ٹرائے بنی، اکیلی اکیلی اپنے راستے پر چلتی رہتی ہو۔

ڈگری کے آخری امتحانات کے اختتام پر طلعت جمیل چچا فاروق کے ہاں سے بھی جانے کے لئے تیار ہوگئی۔

''طلعت آپا کو مرکزی حکومت میں بہت عمدہ ملازمت پر بلا لیا گیا ہے۔ اور وہ شملے جا رہی ہیں۔'' ڈوپی نے اطلاع دی۔

''جہنم میں جائیں تمہاری طلعت آپا۔'' پیلو نے کہا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں۔ تو ایک چچا زاد بہن، یعنی بڑے ابا کی لڑکی نشو آپا کا جن کی ان دنوں شادی ہوئی تھی۔ خط آیا۔ ہم لینسڈون چل رہے ہیں تمہارے بھائی صاحب کا مکان تارا گڑھ ہاؤس وہاں مدتوں سے بند پڑا ہے۔ وہاں جا کر اس کی دیکھ بھال کرنی ضروری ہے۔ تم دونوں بھی کم از کم ایک ہفتے کے لئے نینی تال جانے سے پہلے وہاں آ جاؤ۔ ڈوپی میاں کے ساتھ آ جاؤ۔ یا اگر ڈوپی میاں حسب معمول اترانا شروع کر دیں تو اکیلی ہی آ جاؤ۔ اتوار کی شام کو ہم وہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم بھی اسی روز پہنچ جاؤ تو اچھا ہے۔ ہفتے بھر کے بعد نینی تال چلی جانا۔ شاید پنکی بھی آ جائے۔ بیحد دلچسپ ہے۔ اس سے مل کر بے حد محظوظ ہو گی تم دونوں۔ اس کے پاس ٹیکنی کلر کا مووی کیمرہ بھی ہے۔

''بھئی واہ..... لینس ڈاؤن کی فطری خوبصورتی تارا گڑھ ہاؤس کی لائبریری کی ان گنت جاسوسی کی کتابیں۔ چلغوزے ایک مووی کیمرہ اور پنکی..... ایک ہفتہ گزارنے کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے۔ پیلو ڈارلنگ.....؟ نندہ دیوی پر جب سورج نکلتا ہے.....'' شیرو نے آنکھیں بند کر کے کہنا شروع کیا۔

''نندہ دیوی لینس ڈاؤن میں کہاں سے آ گئی؟'' پیلو نے جھنجھلا کر کہا۔

''اچھا تو کنچن چنگا پر جب سورج نکلتا ہے تو.....'' شیرو نے اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے اپنی بات جاری رکھنی چاہی۔

''کنچن چنگا لینس ڈاؤن میں ہے؟'' پیلو نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''اچھا تو امرناتھ پر نہیں نندہ دیوی پر جب.....''

''یہ پنکی کون صاحبزادی ہیں۔تم ہی دونوں جیسی کوئی چغد ہوگی.....'' ڈوپی نے خط پڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوگی کوئی۔نشو آپا کی دوست۔گلابی سی ناک سبز آنکھیں۔سرخ بال۔ہر وقت زکام رہتا ہوگا۔نام سے تو یہی سب ظاہر ہوتا ہے۔'' پیلو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو ڈوپی ہمیں لینس ڈاؤن تک پہنچا آؤ گے؟ بہت اچھے سے بھیا.....'' شیرو نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ خاکسار کو آپ جیسی بے وقوف لڑکیوں کو ایسے جنگل بیابان بے تکے قسم کے پہاڑوں پر پہنچانے کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔مثلاً خود نینی تال جانا۔لہٰذا آپ اکیلی لینس ڈاؤن تشریف لے جائیے۔'' ڈوپی نے جواب دیا اور سیٹی بجاتا باہر چلا گیا۔

اتوار کی شام کو وہ دونوں لینس ڈاؤن پہنچیں۔رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ہوا کی تیزی میں زیادتی ہوتی جارہی تھی۔پہاڑ کی چوٹی پر سے نشیب کی عمیق تاریکی میں دور نیچے روہیلکھنڈ کے شہروں کی مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ہوا بہت سرد تھی۔اور بادل چاروں طرف سے امنڈتے آرہے

تھے۔ تارا گڑھ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ نشو آپا اور ان کے خاندان کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

گیلری کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک شاعر نما انسان برآمد ہوئے۔

''بٹیا تشریف لے آئیں.....'' انہوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ''خاکسار کا مفتون سندیلوی تخلص ہے۔ ویسے سب دولہا بھائی کہتے ہیں۔ تارا گڑھ کا مختار عام ہوں۔ بیگم صاحبہ کا فون آیا ہے کہ وہ آج نہیں پہنچ سکیں گی کل صبح آویں گی۔ بٹیا اندر تشریف لے چلے۔'' وہ بے حد اہمیت اور مصروفیت کے ساتھ کسی انتظام کے سلسلے میں نیچے چلے گئے۔

''اب کیا ہوگا پیلو ڈارلنگ.....؟'' شیرو نے سہم کر چپکے سے پوچھا۔

''مری کیوں جا رہی ہو۔ ایک رات اکیلے نہیں گزار سکتیں۔ نیچے دو تین گورکھے چوکیدار موجود ہیں۔ مدفون صاحب ہیں۔ شاید پنکی وہ جو آ رہی ہے۔ وہ بھی آن پہنچے۔'' پیلو نے ڈپٹ کر کہا۔ لیکن ڈرا سے بھی لگ رہا تھا۔

''واہ بھئی نشو آپا۔ اچھی ایکٹیوٹی کی ہمارے ساتھ.....'' شیرو نے کہا۔ وہ دونوں اندر آتشدان کے پاس جا بیٹھیں۔ مفتون سندیلوی کھانا منگوانے کے لئے نیچے باورچی خانے کی طرف جا چکے تھے۔ باہر ہوا کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔

اور آؤٹ کیلی لینس ڈاؤن۔ بڑا شوق چرا رہا تھا۔'' پیلو نے وقت گزارنے کے خیال سے شیرو سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ شیرو پلٹ کر کوئی جواب دینے والی تھی کہ دفعتہً باہر کے طوفان کی گرج لمحہ بھر کے لئے کم ہوئی اور گیلری میں بھاری بوٹوں کی

چاپ سنائی دی۔

''یہ کون؟'' پیلو نے خوفزدہ ہوکر چپکے سے کہا۔ ''یا اللہ پنکی ہی آ جائے۔''

''یہ تو کوئی نگوڑا مردوا جھاڑو پٹیا کھڑا ہے باہر۔'' شیرو نے ڈرتے ڈرتے گیلری میں جھانکنے کے بعد آ کر بتایا۔ ''کہیں یہ مدفون صاحب نہ ہو اور بھیس بدل کر آئے ہوں۔ مجھے تو یہ شروع ہی سے بہروپیہ لگ رہے تھے۔

ہوا کے زور سے دروازہ کھل گیا۔ اور وہ شے اندر آ گئی۔

''یہ تو پنکی نہیں ہوسکتی اتنی لمبی۔'' شیرو نے خوفزدہ ہوکر کہا۔

برساتی اوڑھے وہ چھ فٹ اونچی شے ہال کی روشنی میں آئی تو معلوم ہوا کہ وہ پنکی نہیں تھی، بلکہ پنکی تھا۔

دونوں لڑکیاں آتشدان کے اور زیادہ قریب کو ہوکر بیٹھ گئیں۔

برساتی فرش پر پھینکنے کے بعد وہ اطمینان سے ایک آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''اگر آپ لوگ ڈرپوک گلہریوں کی طرح آتشدان میں اپنی ناک ٹھونسنے کی بجائے اٹھ کر گیلری کا دروازہ بند کر دیں تو زیادہ بہتر ہو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس تیز ہوا سے مجھے زکام ہو جانے کا احتمال ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے آرام سے پائپ نکالا اور آگ کی طرف ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پیلو کا رنگ غصے کی وجہ سے سرخ ہوگیا۔ شیرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے کاہلی سے ایک آنکھ کھول کر انہیں دیکھا۔ اور پھر پائپ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔ ''آپ دونوں غالباً ہماری دلہن بھابی کی وہ مشہور و معروف چچا زاد بہنیں ہیں۔ جن کا کافی دنوں سے ذکر خیر میں سن رہا ہوں۔ آپ کی نشو آپا اور

ہمارے بھائی صاحب قبلہ دونوں نے مجھے لکھا تھا کہ اپنے سارے کام چھوڑ میں اتوار کی شام کو یہاں پہنچ جاؤں۔ اور خود نہیں آئے۔ مجھے کس قدر تکلیف دی انہوں نے ذرا غور کیجئے۔ بہر حال۔ چائے منگوایئے لڑکیوں کو بیکار نہ بیٹھنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''چائے تو آپ مر جائیں گے تب بھی آپ کے لئے نہیں منگواؤں گی میں۔'' پیلو نے غصے سے دل میں طے کیا۔

''میرے سوٹ کیس کے اوپر ٹائم ٹیبل پڑا ہے۔ ذرا دیکھ کر بتایئے گا۔ شاید کوئی ٹرین گھر سے اور چلتی ہو۔ اور ان لوگوں کو راستے میں دیر ہوگئی ہو۔'' اس نے مڑ کر شیرو کو حکم دیا۔

''لیکن پیلو ڈارلنگ مجھے ٹائم ٹیبل دیکھنا نہیں آتا۔'' اس نے شیرو کی بات سن لی۔ ''غضب خدا کا، حال یہ ہے کہ گریجوایٹ ہوا چاہتی ہیں آپ لوگ اور ٹائم ٹیبل نہیں دیکھ سکتیں۔ ایک ہمارے زمانے کی تعلیم تھی۔ حد ہے بھئی۔ حالت یہ ہے کہ آپ لوگ ہوائی جہاز اڑا لیں گی۔ فلسفے کی پروفیسر بن جائیں گی۔ لیڈری کریں گی۔ لیکن ٹائم ٹیبل دیکھنا نہیں آتا۔ ایکوا ایک لڑکی کو نہیں آتا ٹائم ٹیبل دیکھنا۔'' اس نے بے حد بیزاری کے ساتھ پائپ منہ میں رکھ لیا اور اخبار میں مصروف ہو گیا۔

یا اللہ۔ نشو آپا کی شادی آپ کے بھائی کے ساتھ نہ ہوئی ہوتی تو ہمیں یہ روز بدکا ہے کو دیکھنا پڑتا۔ پیلو نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے سوچا۔

''مہربانی فرما کر مفتون صاحب سے کہئے کہ کھانا منگوائیں۔ مجھے اپنا ڈنر ہمیشہ نو بجے مل جانا چاہئے اب نو بج کر دو منٹ ہو چکے ہیں۔'' اس نے ایک اور حکم لگایا۔

''کھا جائے آپ کو رات کو آ کر مایوں کا چیتا۔'' شیرو نے دعا مانگی۔ وہ دونوں دوسرے کمرے کی کھڑکی میں جا کر سوچنے لگیں کہ اس کو اس کھڑکی میں سے نیچے کھڈ میں دھکیلنا ممکنات میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں۔

''کیوں بھئی مفتون صاحب وہ کرنل ریکس کا بھوت اس پچھلے کمرے میں رات کو کے بجے آیا کرتا ہے۔ عموماً؟'' اس نے مفتون صاحب سے اس کمرے کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ جس میں ان دونوں نے آ کر پناہ لی تھی۔ وہ دونوں ڈر کے پھر نشست کے کمرے میں واپس آ گئیں۔

''آیئے صلح کر لیں۔'' اس نے ہنس کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' پیلو نے بگڑ کر جواب دیا۔

''تو جس وقت میں گیلری میں داخل ہوا ہوں آپ کیوں دعائیں مانگ رہی تھیں۔ کہ کاش پنکی ہی آ جائے؟''

''ہمارے سکول میں ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام پنکی تھا۔ ہم اس سے کمروں میں جھاڑو لگوایا کرتے تھے۔'' شیرو نے بچوں کی طرح بگڑ کر کہا۔

''ہمارے سکول میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام شیرو تھا۔ ہم اس سے غسل خانے صاف کروایا کرتے تھے۔'' اس نے اسی طرح جواب دیا۔

پیلو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''صلح؟'' اس نے پیلو کو ہنستے دیکھ کر پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' پیلو نے شیرو کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''ہرگز نہیں۔'' شیرو نے پیلو کے فیصلے سے اتفاق کیا۔

کھانا ختم کرتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سونے کے لئے اوپر کی منزل کی طرف جانے کی غرض سے زینے کی سمت چلا گیا۔

صبح مجھے ٹھیک چھ بجے چائے مل جانی چاہئے۔ لیکن چھ بجے سے پہلے مجھے ہرگز نہ جگایا جائے۔ کیونکہ اس سے میری نیند خراب ہونے کا احتمال ہے۔ میرے پاس جو ٹیکنی کلر مووی کیمرہ ہے، جو میں امریکہ سے لایا ہوں۔ اسے لے کر میں علی الصبح باہر جاؤں گا۔ نندہ دیوی پر جب سورج نکلتا ہے۔'' مڑ کر اتنا کہتے ہوئے وہ زینہ پر چلا گیا۔

یہ پنکی تھا۔ پنکی اشرف..... ہر وقت نل مچانے والا اور اسے بلی کرنے والا پنکی جو بے حد سنجیدگی سے اس سے کہتا۔ پیلو بی بی۔ کاش میں تمہارا بھائی ہوتا۔ تو بچپن میں خوب مرمت کیا کرتا تمہاری گھر والوں کے لاڈ پیار نے بالکل ہی لٹیا ڈبو دی ہے تمہاری۔ اگر میں ڈوپی کی جگہ ہوتا تو اچھی طرح ٹھکائی کرتا تم دونوں کی جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔ چلو۔

'' پنکی بس تم ہر وقت بلی ہی کرتے رہتے ہو سب کو۔''

وہ جل بھن کر کہتی۔'' جا کر گڑھیا میں منہ دھو آؤ۔ ڈوپی کی جگہ تم ہوتے تو بس یا تم ہی رہتے گھر میں یا میں۔''

غضب خدا کا۔ پتہ ہے میں کتنا بڑا ہوں تم سب سے تمہاری نشو آپا سے بھی بڑا، بس تمہارے بڑے ابا کے لگ بھگ ہی ہوں گا۔ یا ان سے ذرا ہی چھوٹا ہوں۔ میں اور تمہارا نوٹس لوں۔ حد کر دی۔ جب آپ مٹی کھاتی ہوں گی اور پٹتی ہوں گی دھبا دھب۔ اس وقت یہ خاکسار اوکسفورڈ میں ریسرچ کر رہا تھا۔ معلوم ہے میں

کتنا سینئر آدمی ہوں؟ بس اب میں بھی کل سے تمہارے بڑے ابا والے ایکسٹینشن لیکچر شروع کرنے والا ہوں۔ تم سب ابھی قابل اصلاح ہو۔ ایمیچور ہو بالکل۔ جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔ اور شیرو سے کہو میرے کوٹ پر استری کرے، فوراً چلو۔

پھر وہ سب نینی تال گئے اور وہاں سے کنبے کے باقی افراد کے ساتھ اکٹھے اپنے شہر واپس آئے۔ پنکی بھی تبدیل ہو کر کچھ عرصے کے لئے وہیں آ گیا تھا۔

یہاں اس نے پنکی کے کردار کا دوسرا رخ دیکھا۔

یہ سنجیدہ اور سینئر قسم کا انسان جس کی ذہانت اور قابلیت سے سب بے انتہا مرعوب تھے۔ اور ڈرتے تھے۔ پنکی اشرف جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے۔

(۳)

مجھے یہ صاحب بہادر کا بچہ لاٹ صاحب کی دم افلاطون زمان پنکی اشرف ایک آنکھ نہیں بھایا۔ چار باغ جنکشن کے پلیٹ فارم پر چچا فاروق نے جب تعارف کرایا تو دو تین منٹ باتیں کرنے کے بعد ہیلن آف ٹرائے دوسری طرف مڑ گئی۔ یہ کلاسیکل مغرور نقوش والی ڈائینا جس نے اپنے ماں باپ کے گھر کی زندگی کبھی نہ دیکھی تھی۔ پنکی اشرف کے اوکسفورڈ کے لہجے کی گفتگو چند لمحوں تک سنتے رہنے کے بعد پلیٹ فارم پر پھیلے ہوئے ڈھیروں سوٹ کیس، تین چار پوڈلز، دو طرے باز

چپراسی اور ایک گوانیز بیرے پر نظر ڈالتی ہوئی اکتاہٹ کے ساتھ ٹہلتی بک اسٹال کی طرف چلی گئی۔ شکر کہ میں اس کے یہاں ٹرانسفر ہو کے آنے کے فوراً بعد ہی شملہ جا رہی ہوں۔ چچا میاں کے ہاں تو یہ لازمی طور پر آیا کرے گا اس نے کلب کی ان لامتناہی شاموں غیر ضروری پارٹیوں۔ غیر دلچسپ، چمکدار لڑکیوں کا تصور کیا۔ جو اس کی زندگی کا یہاں لازمی جزو ہوں گی۔ شکر کہ میں اب اس حلقے، اس زندگی میں شامل نہیں..... طلعت جمیل کیا تم سچ کہہ رہی ہو..... اس نے رک کر اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا تم سچ کہتی ہو۔ کہ تمہیں یہ پنکی اشرف ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اور تم اس کے یہاں آنے سے واقعی ناخوش ہو۔

اگلے روز وہ چچا فاروق کے ہاں برج پارٹی پر مدعو تھا۔ سر فاروق کی برج پارٹیاں عموماً رات رات بھر جاری رہتی تھیں۔ طلعت چچا فاروق کی لڑکی کے ساتھ مہمانوں کو قہوہ اور چائے سرو کرتے کرتے یا خود کھیلتے کھیلتے اکتا جاتی تو چپکے سے اپنے کمرے میں چلی آتی تھی۔ اور وہاں کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتے دیکھتے سو جاتی تھی۔ اس روز سر شام ہی سے مہمان آ کر جمع ہوتے اس نے ابھی شام کا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا کہ کئی لڑکیاں عطیہ فاروق کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ ارے تم ابھی سے پیکنگ میں جٹ گئیں۔ چلو باہر۔

''ابھی اور لوگ تو نہیں آئے؟'' اس نے پوچھا۔

ابھی اور تو کوئی نہیں آیا۔ ابا میاں کے دو تین ملنے والے کسی مقدمے کے سلسلے میں آئے بیٹھے ہیں۔ اور یہ بحث کرنے میں مصروف ہیں کہ مصرا صاحب سیتا پور کے ڈپٹی کمشنر جو ہیں ان کی بیوی رونلڈ بارکر آئی پی کے ساتھ ولایت کیوں بھاگ

گئی۔ میورسن کے ساتھ کیوں نہیں بھاگیں۔ جو اتنے موٹے نہیں تھے بچارے۔''
عطیہ فاروق نے بتایا۔

''اور پنکی اشرف صاحب سخت برا مان رہے ہیں کہ ان کے مصرا صاحب کو کیوں اس طرح موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے۔'' دوسری لڑکی نے اطلاع دی جب کہ وہ ہاؤس کوٹ پہنے پہنے ہی گیلری تک پہنچ چکی تھی۔ پہلو کے برآمدے میں اس کے سامنے پنکی موجود تھا جو بہت اکتاہٹ کے ساتھ چائے کی میز کے قریب بیٹھا کسی اخبار کے ورق پلٹ رہا تھا۔ عطیہ فاروق اور اس کے ساتھ کی دونوں لڑکیاں کسی دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔

''آیئے تشریف لایئے۔'' طلعت کو دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے تعظیماً کھڑے ہو کر بے حد متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

وہ بے نیازی سے جا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''چائے بنا دوں آپ کے لئے۔'' اس نے پوچھا۔

''یقیناً.....'' اس نے جواب دیا۔ اور نظریں بچا کر ذرا غور سے اسے دیکھتا رہا۔

''کیسا لگا آپ کو ہمارا شہر.....'' طلعت نے اخلاقاً دریافت کیا۔

''بہت نفیس.....'' اس نے اسی اخلاق سے جواب دیا۔ ''آپ برج کھیل رہی ہیں آج رات ہمارے ساتھ۔'' تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' طلعت نے جواب دیا۔

''نہیں؟'' واللہ بالکل یہی رات بائیرن کی روح نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ

کے اس بے انتہا سپیریر انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ سے اسی قسم کے جواب کی توقع رکھنی چاہئے یعنی.....

''برج کے متعلق۔ واللہ بھائی بائیرن نے یہی کہا تھا.....'' اس نے بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔

''کیا فرمایا آپ نے.....؟ طلعت نے ذرا سٹ پٹا کر کہا۔

''جی لارڈ بائیرن کی روح نے فرمایا تھا۔ جارج گورڈن، لارڈ بائیرن.....کل رات ہم لوگ پیلو سعید کے ہاں روحیں بلا رہے تھے۔ تو اسی وقت میں نے بائیرن سے آپ کے متعلق تھوڑی سی گفتگو کی تھی۔ یعنی آپ کے برج کھیلنے یا نہ کھیلنے کے متعلق۔''

''تقریباً پہلی ہی ملاقات میں بائیرن کے متعلق باتیں کرنا۔ معاف کیجئے گا ذرا بیڈ فورم ہے۔'' طلعت نے سنبھل کر ذرا سنجیدگی سے جواب دینے کی کوشش کی۔

وہ مسکرا کر دوبارہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ ''اور بیڈ فورم میں آپ کے یہاں اور کیا کیا داخل ہے.....؟ شام کو چھ بجے ہاؤس کوٹ میں باہر آ کر چائے پینا صریحاً عمدہ ترین فورم ہے شاید.....''

طلعت نے جھینپ کر اپنے ہاؤس کوٹ پر نظر ڈالی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''یہ تو بائرن صاحب نے بھی بتایا تھا مجھے کہ.....'' اس نے بات پھر شروع کی۔

''ارے بھئی۔ میں اس لئے کھیل میں شامل نہیں ہوسکتی۔ کہ مجھے پیکنگ کرنی ہے۔''

''رات بھر پیکنگ کیجئے گا.....؟''

''میں شملے جارہی ہوں کل صبح۔''

''افوہ۔غور کرنے کا مقام ہے کہ کس قدر زبردست واقعہ ہے یہ۔''

''کیا.....؟''

''کہ آپ شملے جارہی ہیں۔ اپنے نئے عہدے پر فائز ہو کے..... افوہ، واقعی۔''

''طلعت بٹیا ذرا ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتانا تمہاری ٹرین کل کے بجے چھٹتی ہے۔ یہ بھائی سریواستو بھی کل تمہارے ساتھ ہی جارہے ہیں.....'' چچا فاروق نے اپنی اسٹڈی کے دروازے پر آ کر آواز دی۔

''بہت اچھا چچا میاں۔'' وہ گیلری کی طرف بڑھی۔

''ار..... یا آپ کو ٹائم ٹیبل دیکھنا بھی آتا ہے.....؟'' پنکی نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں..... کیوں.....؟'' اس نے تعجب سے سوال کیا۔

''قیامت ہوگئی۔ بس اب تو قرب قیامت میں کلام نہیں۔ آپ وہ پہلی خاتون ہیں جن سے مجھے نیاز حاصل ہوا ہے۔ جو ٹائم ٹیبل بھی دیکھ سکتی ہیں۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔''

''لارڈ بائرن نے آپ کو اس کے متعلق مطلع نہیں کیا تھا؟'' طلعت نے آہستہ

سے پوچھا اور اندر چلی گئی۔

''خدا مجھ پر رحم کرے۔'' پنکی نے کچھ دیر بعد دوبارہ اپنے آپ سے کہا۔ اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا دوسرے مہمانوں کی طرف چلا گیا۔

کھانے کے وقت جب سب اپنی اپنی پلیٹیں ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو گھومتی پھرتی عطیہ فاروق اس کے قریب آئی۔ ''پنکی بھائی کھانا کھاؤ۔'' اس نے کہا۔

''طلعت کہاں گئیں؟'' پنکی نے پوچھا۔

''طلعت آپا اندر ممی کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ دملا۔ ٹھہرو میں آتی ہوں۔'' وہ دوڑتی ہوئی دوسرے مجمع میں جا ملی۔ اسی وقت ایک ڈش اٹھائے طلعت اس کے قریب سے گزری۔

''ارے بھائی طلعت.....'' پنکی نے برآمدے کے ستون کے پاس سے آواز دی۔

وہ ٹھٹھک گئی۔ ''آپ مجھے طلعت کیوں کہہ رہے ہیں۔ مس جمیل کہئے۔''

''میں قطعی آپ کو طلعت کہوں گا طلعت۔ طلعت۔ طلعت بلکہ مستقل قریب میں تو میرا ارادہ آپ کو طلعت ڈارلنگ کہنے کا بھی ہے..... کیجئے آپ کیا کر لیجئے گا! فی الحال تو آپ جا کر اپنی پیکنگ کیجئے..... جائیے.....''

وہ تیزی سے دوسری طرف چلی گئی۔

یہ زندگی کا اچانک پن۔ اور ہر چیز لڑکھڑاتی ہے اور ہر چیز مختلف ہے۔ اور دنیا ہمارے اوپر زیادہ تیزی سے آ گرتی ہے۔ اور یہاں اتنی دیوانگی ہے کہ ہم سوچ

بھی نہیں سکتے۔

وہ ٹہلتا ہوا لکڑی کے پل پر سے اتر کے سفیدے کے جھرمٹ میں آ گیا۔ اور اس نے ایک پتہ توڑ کر دیکھا اور اس کے چاروں طرف بڑے بڑے گلاب کھلے تھے۔ راستے کے اختتام پر پیلو سعید کے گھر میں سے پیانو کی مدھم آواز بلند ہو رہی تھی اور چند لڑکیاں پل پر سے گزرتی کسی دوسری کوٹھی کی طرف جا رہی تھیں۔

دیکھا تم نے۔ یہ ہے بالکل ہنٹن شوٹن، فشن، ٹائپ اسے دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اور آگے چلی گئیں۔

جھیل کے راستے پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ماضی کے ویرانے کو دیکھا۔ جہاں سنسان ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

جھیل کے پار، اسسی کی خانقاہ کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔

شام کو کلب میں اسے اومیشوری سپرو ملی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی چند نئے ریکارڈ بجا رہی تھی۔

اس اومیشوری سپرو ہی سے باتیں کی جائیں کم از کم ورنہ وہ یقیناً برا مان جائے گی۔ اس نے سوچا۔

''آپ کافی سے زیادہ حسین ہیں مس سپرو۔'' اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور آپ کافی سے زیادہ دیوانے ہیں مسٹر پنکی اشرف۔'' اومیشوری سپرو نے شگفتگی سے جواب دیا۔

''ظاہر ہے۔ جب ہی تو آپ سے ملاقات کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔'' اس نے کوشش کر کے اسی شگفتگی سے کہا۔

''یہ پنکی اشرف ایک مصیبت ہے۔ دن بھر سوتا ہے۔ رات بھر برج کھیلتا ہے۔ یا چھٹیوں کے روز صبح سے اپنی اسٹڈی میں بند ہو کر POUSSIN کے آرٹ اور فرنچ سر ریلسٹوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ مصیبت ہے بالکل۔ اس کے لئے کہا جاتا۔

یہ سب جگہیں ایک سی تھیں۔ یہ سارے لوگ ایک طرح کے تھے۔ دو سو سالہ پرانے اینگلو انڈیا کی زندگی کتنے مطمئن انداز سے گزرتی آ رہی تھی۔

یہ سارے شہر ایک سے تھے۔ وہی اک سا طبقہ۔ جو آبادی سے دور سول لائنز میں رہتا سب کی ایک سی کوٹھیاں۔ ایک سے باغ۔ ایک سی ڈمنیتیں اور خیالات اور اس اینگلو انڈیا کے یہ سارے مشہور اور خاص اسٹیشن۔ پونا، جھانسی، آگرہ، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد۔ پھر ان لوگوں کے یہ ہل اسٹیشن۔ بنگال کا دارجلنگ۔ یو۔ پی کا نینی تال اور مسوری۔ شمال مغرب کا کشمیر۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قیامت تک اسی طرح اپنے ان پرانے کلبوں میں جمع ہو کر برج اور بلیرڈ کھیلتے رہیں گے۔ جہاں کے باغوں میں غدر کی یادگار توپیں سجی تھیں۔ یہ آئی سی ایس، پی سی ایس اور آئی پی کے پرانے عہدیدار، ہائیکورٹوں کے جج اور انڈین آرمی کے سرخ مونچھوں والے کرنل اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں جو صبح کے وقت، ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی ٹٹنگ سنبھال کر اور کتوں کو ساتھ لے کر، سول لائنز کی شفاف، سایہ دار ٹھنڈی سڑکیں عبور کر کے ایک دوسرے کی کوٹھیوں کے برآمدوں میں جمع ہو کر لنچ کے

وقت تک انتہائی بے کار قسم کی سوشل گفتگو میں مصروف رہتی تھیں۔ اور پھر کلب کے چیرٹی بازار، کے لئے پروگرام بناتی تھیں اور جاڑوں میں ہاتھیوں پر بیٹھ کر ریاستوں کے راجکماروں اور راجکماریوں اور انگریز حکام کے ساتھ شاردا ندی کے پار جا کر شیر کا شکار کیا جاتا تھا۔

لیکن طلعت جمیل..... اس نے اپنے آپ سے کہا۔ تم بھی تو اسی اینگلو انڈیا، اسی پرانے طبقے کی پیداوار ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہارا پاپی سی ایس باپ تمہاری پیدائش کے دوسرے سال ہی مر گیا۔ اور تم خس کی ٹٹیوں میں چھپی ہوئی ایسی کوٹھی میں نہ پل بڑھ سکیں۔ جہاں شام کو لان پر پنکھے کے نیچے ضلع کے حکام اور ان کی بیویاں جمع ہو کر انتہائی غیر ضروری باتیں کرتے اور ٹینس کھیلتے۔

تم نے اس ماحول اور اس زندگی کی روح میں سمانے کی بجائے اپنی اتنی عمر فاروق چچا کے گھر کے ایک کمرے میں محض اقتصادیات پڑھنے میں ہی گزار دی۔ طلعت جمیل تم اپنے طبقے کے ساتھ جس کی تم پروردہ ہو، بہت زیادتی کر رہی ہو۔ کیا تمہاری روح بھی قرون وسطیٰ کے سورماؤں کی طرح زرہ بکتر پہن کر ایڈونچرز کی تلاش میں آگے نکلنا چاہتی ہے.....؟

ہاں۔ میں ضرور آگے جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہاں کیا ہے۔ وہاں جہاں پر تاریکی روشنی ہے، غلطیاں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ اور زندگی خواب اندر خواب ہے طلعت جمیل۔ اس نے اپنے آپ سے دوبارہ پوچھا۔ کیا تم اسے بھولنا چاہتی ہو۔ جس نے تم کو طلعت، طلعت، طلعت، کہہ کر پکارا تھا؟

تمہیں دراصل تصورات کا ٹائفائیڈ ہو گیا ہے۔ طلعت جمیل آخر میں اس نے

خودکو جواب دیا۔ اورٹرین کے کمپارٹمنٹ کی کھڑکیاں گرا کے سوگئی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی، لیکن جنگ کا پرندہ کائنات کی بیکراں تاریکی کے اوپر مریخ کی مدھم سرخ، گرم روشنی میں آہستہ آہستہ پرواز کرتا جا رہا تھا اور یہاں پر صرف چلتے ہوئے وقت کی آواز تھی جو اس طرف جا رہا تھا۔ جہاں بہار نہیں تھی۔ زندگی نہیں تھی۔ جہاں کسی سوال کا جواب نہیں ملتا تھا۔

وہ جو پنکی اشرف کہلاتا تھا۔ اس نے ٹھٹھک کر اس بھاگتے ہوئے وقت کے کنارے کو چھونے کی کوشش کی۔ آخر وہ تھک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خدا حافظ او میشوری سپرو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اور وہاں واپس جانے کے لئے تیار ہوا۔ جہاں مرکزی حکومت کی اعلیٰ پالیسیز بنانے کا غیر دلچسپ اور بے حد اہم کام اس کے سپرد تھا وہاں بھی وہ دن بھر سوتا اور رات بھر برج کھیلتا رہا۔

ایک کہر آلود صبح ایک ایر پورٹ کے نیلگوں دھندلکے میں وہ اسے دوبارہ نظر آئی۔ وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ مشرق وسطےٰ اور مغربی یورپ کا دورہ کر کے واپس آ رہی تھی۔ اور ورلڈ ہیلتھ اورگنائزیشن کا فضائی جہاز اسے دوبارہ مشرقی جزیروں کی طرف لے جانے کے لئے شیڈ کے نیچے سکون سے کھڑا تھا۔

کہر آلود اور سنسان رن وے پر وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

''دیکھو وہ ہوائی جہاز پیدل چل رہا ہے.....'' دوسرے رن وے پر سے گذرتے ہوئے ایک جہاز کو دیکھ اس نے بچوں کی طرح کہا۔

پنکی نے ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''اس قدر فلسفیوں کی سی شکل کیوں بنا رکھی ہے آپ نے جناب..... پنکی.....

!''طلعت نے اس کے نام کا گویا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔''آؤ تمہیں اپنا ڈیکوٹا دکھاؤں وہ جہاز کے قریب جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔گھر پر سب لوگ کیسے ہیں۔عطیہ۔چچا میاں۔اور سارے دوست تمہارے پیلو سعید، اومیشوری سپرو وغیرہ وغیرہ.....؟''وہ بشاشت سے باتیں کرتی رہی۔میں نے عطیہ کو بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔وہ بے حد خفا ہو گی۔اور چچا میاں بھی پریشان ہوں گے۔انہیں میں نیپلز سے ایک پکچر کارڈ بھیج سکی تھی صرف.....میں رہتی دراصل اس قدر مصروف ہوں.....!!اس نے پھر ہنس کر اسے دیکھا۔وہ خاموش بیٹھا پائپ پیتا رہا۔''اب کہ جب تم گھر جاؤ اور عطیہ سے ملو تو اس سے کہہ دینا کہ میں بہت سخت بیمار ہوں دراصل اس لئے اسے خط نہ لکھ سکی.....اس سے کہہ دینا کہ مجھے.....وہ ہو گیا ہے۔وہ کیا ہوتا ہے۔اپنڈی سائیٹس!!''

''کیا.....؟''پائپ کی راکھ جھٹکتے ہوئے اس نے ذرا غرا کر پوچھا۔

''اپنڈی سائیٹس بھئی.....اور تھوڑا سا مینن جائیٹس بھی۔اور بران کائیٹس کا بھی احتمال ہے۔اور ساتھ ساتھ نیوموتھوریکس کا ذکر بھی کر دینا تو کوئی مضائقہ نہیں.....''اس نے شگفتگی سے کہا۔اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ورلڈ ہیلتھ اورگنائزیشن نے معلوم ہوتا ہے تمہیں بہت بشاش کر رکھا ہے۔''وہ جل بھن کر بولا۔

وہ یک لخت خاموش ہو گئی اور دھندلکے کو غور سے دیکھنے لگی۔آؤ ٹہلیں.....''تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

وہ رن وے پر چلتے رہے روشنی کے نیلگوں مینارے ان کے چاروں طرف

فضا میں لرز رہے تھے۔

میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوں میں تمہارے دکھ میں مبتلا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ اس راستے پر چل رہی ہوں جس پر صبح کی شبنم جھلملا رہی ہے اور خنک گھاس پر سے کہرے کا دھواں اٹھ رہا ہے۔

''موسیو پنکی! کیا تم سمجھتے ہو کہ اتنی دنیا گھوم کر آنے کے بعد میں بہت خوش ہوں؟'' کچھ دیر بعد اس نے ٹھٹھک کر سوال کیا۔

وہ خاموش رہا۔

''مجھے وہ سیاہ آنکھوں والا خوبصورت یونانی یاد ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ کہتی رہی۔ ''جسے وہ پکڑ لائے تھے۔ اسے انہوں نے چوکولیٹ کھانے کو دی اور دیر تک اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ گراموفون سنو گے کتے کے بچے.....؟ لونیلی ڈینیوب سنو۔ وہ اطمینان سے گراموفون بجاتے رہے۔ اور جب اسے تنگ کرنے کے اس شغل سے تھک گئے تو اسے ایک درخت کے نیچے لے جا کر کھڑا کیا اور بندوق چلا دی وہ وہیں گر کر ختم ہو گیا۔ اس روز انہوں نے اس درخت کے نیچے دس نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشانہ بنایا تھا وہ سیب کا درخت تھا اور اس پر سفید شگوفے کھل رہے تھے۔ وہ خاموش ہو گئی۔

دھند لکے کے پیچھے سے آفتاب طلوع ہوتا جا رہا تھا۔

''وہاں ایک ترچھی، معصوم آنکھوں اور چمپئی رنگت والا انڈونیزین تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ جب اسے ریڈ کراس کے خیمے میں لایا گیا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے آہستہ سے کہا تھا۔ مجھے پرانے عہد نامے میں

سے تیسواں سام پڑھ کر سنا دیجئے تیئسواں سام..... پھر وہ بھی مر گیا تھا۔ ان سب کو اسی طرح مارا جاتا ہے۔ وہ اسی طرح مر رہے ہیں۔ تیسویں سام کے باوجود۔'' وہ کہتی رہی۔ ''وہ مشرقی سمندر کے جزیرے ہیں۔ جہاں رقص پیدا ہوا تھا۔ جہاں بالی کی رقاصائیں اپنی بھویں گہرے سبز رنگ سے رنگ کر پنکھوں کے ساتھ ناچتی تھیں اور درختوں کے نیچے منڈولین بنائی جاتی تھیں۔''

وہ خاموشی سے چلتے چلتے ایر پورٹ کی عمارت کے نزدیک آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔

شعلے سے شعلے کی طرف۔ گریس سے گریس کی طرف۔ جگنوؤں کی میڈونا مریم جو آگ میں رہی۔ مجھے دنیا کے راستوں پر یاد رکھنا۔

کیا وہ بیت لحم کی طرف جا رہے ہیں؟ فضا میں بلند ہوتے ہوئے طیارے کو دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر وہ ایر پورٹ سے واپس آ گیا۔

جنگ اور موت کا پرندہ دیس کے اندھیرے شہروں پر نیچے نیچے منڈلا رہا تھا۔ مریخ کی سرخ روشنی زیادہ تیز ہو گئی۔ وہ زمانہ آیا۔ جب وہ اپنے گھر، اپنے کھنڈر، اپنے کھیت چھوڑ کر لڑکھڑاتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ اپنے کھیت چھوڑ کر، جہاں وہ سنہرے اناج کے ساتھ بھوک بوتے، جوتتے اور کاٹتے تھے۔ اجنبی دیس کے کھیتوں میں اسی طرح بھوک بونے، جوتنے اور کاٹنے کے لئے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس سرخ اندھیارے میں، اپنی واکس ہال پر بیٹھ کر اور اپنے پوڈلز کو ساتھ لے وہ بھی دوسرے دیس کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں پہنچ کر اسے ایک اور بے حد اہم

عہدہ سنبھالنا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیکن دفعتہً راستے کا موڑ اس کے سامنے آ گیا۔ وہ اس راستے پر نہ جا سکتا تھا۔ جدھر وہ گئی تھی۔ خزاں کے بہت سرخ چاند کے نیچے، چپ چاپ، اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

سرخ اندھیارا، گہرا ہوتا گیا۔ عظیم خاموشی آہستہ آہستہ گرجتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔ یہ حیات کی تخلیق کی پہلی اور آخری رات تھی۔ خلا کے اندھیرے میں وہ بے مقصد چاروں طرف گھومتا رہا۔

یہ میں۔ جو میں ہوں۔ خاموشیوں کی دیبی نے آہستہ سے کہا۔ تم جس راستے پر چلو گے بالآخر مجھ تک پہنچو گے۔ جس راگ کو سنو گے اس میں میری آواز ہو گی۔ جس خوشبو کو محسوس کرو گے! اس میں میری مہک پاؤ گے پھولوں کے جو رنگ دیکھو گے ان میں میری جھلک موجود ہو گی۔ میں ستی ہوں۔ میں یشو دھرا ہوں۔ میں تمہارے وجود کا سایہ ہوں۔ سایہ جو کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جو ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے۔ لیکن مل نہیں سکتا۔ اور مستقبل کی صدیوں کے اندھیرے میں کھو جاتا ہے۔

بیکراں تاریکی میں وہ گھومتا رہا۔ جہاں اس کے مختلف وجود اندھیری راہوں پر چکر کاٹ رہے تھے۔

کیا تم اس سائے تک پہنچنا چاہتے ہو..... اس کے ایک وجود نے دوسرے وجود سے سوال کیا۔

ہاں۔ دوسرے وجود نے جواب دیا۔

کیا تمہیں دوسرے سایوں تک پہنچنے کا اتنا ہی شوق نہ تھا.....؟ پیلو سعید..... عطیہ فاروق..... اومیشوری سپرو..... ان سب کو یاد کرو۔

وہ تو دفع الوقتی تھی۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے بھائی روح۔ اس کے دوسرے وجود نے بچوں کی طرح جھنجھلا کر جواب دیا۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بھی تمہارا تصور نہیں۔ محض ایک اور لڑکی۔ (جسے اتفاق سے ٹائم ٹیبل دیکھنا بھی آتا ہے)

نہیں..... نہیں..... دوسرے وجود نے قطعی طور پر بگڑ کر کہا۔ کیسی باتیں کرتے ہو یہاں یہ بالکل دوسری چیز ہے.....

سناٹا اس کے چاروں طرف اور گرجتا رہا۔ یہاں کوئی خاتمہ نہیں۔ کوئی خاتمہ نہیں۔

تخلیق کی ڈولتی ہوئی رات کے ساتھ وہ بہت دور نکل آیا تھا۔ خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ خدا حافظ خوابوں کے انسانو..... اس نے پیچھے مڑ کر چپکے سے کہا۔ جدھر دور بیکراں تاریکی میں اسی کے گھنٹے آہستہ آہستہ بج رہے تھے۔

ہم روتے ہوئے گھر جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں ہم مرنے کے لئے واپس آ جاتے ہیں۔ اور مر جاتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں۔

اور اولیس پیدائش کی اندھیری، ڈولتی۔ رات کے کنارے، فصیل پر پہنچ کر اپنی کالی آنکھیں جھپکا کر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

اسی کے گھنٹے بجتے رہے۔

اور ایک روز خون کے دریاؤں اور موت کی دلدلوں پر سے گذرتی اپنے دیس کو واپس آئی۔ اور اس نے دیکھا کہ دیس سنسان پڑا تھا۔ طوفان اور آگ، اور موت کی ضیافتوں کے بعد اب وہاں مکمل سناٹا تھا۔

وہ پورب دیس کی ان سایہ دار سڑکوں پر سے گذری۔ جہاں آموں کے جھرمٹ میں برکھا کے دنوں میں بچھوا بولتا تھا اور لڑکیاں ڈھولک پر اپنے صدیوں پرانے اور محبوب گیت گاتی تھیں۔ آم بورا۔ آمل پاکی۔ مہوہ ٹپکے آدھی رات۔ گوئیاں نیند نہ آوے، ہوریلوا کی سان۔ ہوریلوا کی سان۔

رات کی بیکراں تاریکی میں دور کوئی دھیرے دھیرے اب بھی گا رہا تھا۔

شیام، رس بینا ڈولاؤ، گوری کے لاگے بیئر یا۔ شیام..... پنکھا آہستہ آہستہ جھلو کیونکہ گوری کو ہوا بری لگتی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں بند کئے سنتی رہی۔ وہ مانوس آوازیں دور ہوتی گئیں۔ سنارا بٹونا، پیاں تورے لاگوں، میرے.....

بینے گھنگرو دے لگائے۔ گوری کے لاگے بیئر یا۔ سنار کے بیٹے میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرے پنکھے میں گھنگرو لگا دو۔ گوری کو ہوا اچھی نہیں لگتی۔

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ لیکن وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ وہاں پر صرف خاموشی تھی۔ اپنے قصبوں اور گاؤں کے یہ محبوب گیت مر چکے تھے۔ دلہنوں کے دوپٹوں کی بیسر کی لڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اب برکھا کی راتوں میں، جب اونچی اٹریوں اور تالاب کے کناروں پر بچھوا بولے گا۔ وہ آنگن کی منڈیروں پر بیٹھ کر اپنی سہیلیوں سے ہوریلوا کی سان کا شکوہ کبھی نہ کر سکیں گی۔ ہوریلوا ورلڈ ہیلتھ اورگنائزیشن کے باوجود پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالا گیا تھا۔ وہ مر رہے تھے۔ یا دیس بدر ہو رہے تھے۔ اور ان کے کھیتوں اور گلیوں میں بھوت چل رہے تھے۔

وہ اپنے شہر کی چپ چاپ سڑکوں پر چلتی رہی۔ وہ اسی کی خانقاہ کے قبرستان کے قریب سے گذری۔ جہاں مرمریں قبروں پر مرمریں فرشتے بے حد تکلف اور

شائستگی سے پر جھکائے کھڑے تھے یا دوزانو بیٹھے ہوئے اچک کر آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ سفیدے کے جھنڈ کے کنارے کنارے کوٹھیوں کی قطاریں کہرے میں رینگ رہی تھیں۔

وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوئی۔

دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا..... رات کی مملکت میں سے نکل کر آنے والی روحو۔ تم کون ہو.....؟

ہم وہ فرشتے ہیں جو ہمیشہ تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن تم ہمیں لوٹا دیتی ہو۔

تم کون ہو..... پھر اندھیرے میں اس نے اسے پہچانا جو بہت دور سے اس کے پاس واپس آیا تھا..... تم میرے وجود میں شامل نہیں ہو، تم مجھ سے علیحدہ، دور کھڑے ہو۔ اس کہر آلودہ راستہ کے کنارے تم ایک بار آہستہ آہستہ گنگنا رہے تھے۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اس وقت میں راستے پر تمہارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن دفعتہً دوراہا میرے سامنے آ گیا تھا۔ اب ہم پھر تنہا ہیں۔ اور ابھی ہوائیں چلیں گی۔ اور ان تنہائیوں کو بکھیر کر آگے چلی جائیں گی۔ اور میں چپکے سے پوچھوں گی۔ تم کہاں گئے۔ موت کے وسیع احاطے میں سے جس کے چاروطرف تار کھنچے ہیں۔ وہ سب آہستہ آہستہ گذر رہے ہیں۔ وہ تھک کر رک جاتے ہیں اور آسمان کو دیکھنے لگتے

ہیں۔اور اپنی صلیبیں اٹھا کر پھر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔تم نے اس انسان کو پہچانا جو ہمارے سامنے ان تاروں پر لٹک رہا ہے اور اس کے گلابی ہونٹوں پر (جن کو کلبوں میں خواتین بڑے تعجب اور غور سے دیکھا کرتی تھیں) عنقریب چیونٹے چڑھنے والے ہیں۔آؤ ہم اس پر ہنسیں۔اس کی قسمت پر۔اس دنیا اور اس زمانے پر جس نے اسے اس لئے پیدا کیا کہ یہ اس طرح مارا جائے۔اور کیڑے اس پر چلیں۔آؤ ہم اس پر ہنسیں۔ہم کتنے بے ہودہ ہیں کہ موت پر ہنستے ہیں۔پھر ہم کیا کریں.....؟ تم اس کے لئے سر ریلسیٹ انداز کی ایک تصویر بناؤ پنکی اشرف۔ میں اس پر ایک مرثیہ لکھوں گی۔

تم نے اس خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔جو سامنے سے جا رہی ہے۔جب یہ مرے گی تو وہی سب ہوگا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔اس کے دماغ میں مکڑی جالے لگائے گی۔اور چیونٹے اس کے دل میں ناچیں گے۔لیکن اس وقت وہ پل پر سے گذرتی کلب کی طرف جا رہی ہے اور بہت خوش ہے۔سوفوکلز۔اور اس نے کہا۔

ہاں، ہم بہت برے زمانے میں ملے ہیں اور اسی کے گھنٹے ہمارے پیچھے بجتے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی کو چوہے کتر رہے ہیں اور ہمارا خدا پہاڑوں پر پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا ہے اور اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت پا کر میں تمہارے پاس آئی ہوں۔

تم نے غلطی کی ہے۔جب یہ سفید بیمار چوہے اپنے بلوں کو واپس بھاگ جائیں۔تب تم بھی بور ہو چکی ہو گی۔اسی طرح مرنے کا انتظار کرو جیسے اور سب مرتے ہیں۔اس نے آہستہ سے جواب دیا۔کیونکہ یہ سب جگہیں ایک سی ہیں۔

ہاں ..... اس نے کہا۔لیکن ان راستوں پر چلتے چلتے تو میں بہت دور آ گئی ہوں بھائی، میں نے دہشت پسندوں کی مجلسوں میں ان کی باتیں سنیں۔ میں نے ٹیل کوٹ پہننے والے دیوتاؤں کے ساتھ سیمبا کیا۔ مجھے POUSSIN کے چیلوں نے اپنی لکیروں میں مقید کیا۔ جبکہ میرے پیچھے پہاڑ تھے۔میرے وجود کے ٹکڑے مختلف رنگوں اور اسٹائلوں میں منتشر کیے گئے۔اور زندگی اسی طرح گزرتی چلی گئی۔ مجھے انہوں نے محض ایک سمبل سمجھا۔ایک طرز۔ایک نظریہ۔وہ رک گئی۔تم نے میرا وہ کوٹ دیکھا ہے جو میں نے طہران میں خریدا تھا۔ذرا ہماری شخصیتوں کے غرور تو دیکھو؟

کیسی مدھم روشنی پھیل رہی ہے۔ وہاں نیلگوں پٹرول اسٹیشن ہیں اور غسلخانوں کی چمنیاں جو اندھیرے میں مدغم اور رینگتی معلوم ہوتی ہیں۔اور کیسی کلوروفارم کی ایسی نیند ہمارے دماغ پر سرسراتی ہے۔اور بھیگے چوراہوں پر اونچی، طویل، دومنزلہ بسیں پراسرار طریقے سے آ کر رکتی ہیں۔اور آگے جاتی ہیں۔اور اس منڈلاتے ہوئے زرد اجالے کے پس منظر میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر وہ سنسان قصبے ہیں۔ جہاں بوڑھے تعلقدار اپنے سلیم شاہی جوتوں میں چھپے روتے ہیں۔ہنٹن، شوٹن، فشن کا خاتمہ ہو رہا ہے۔اور کلبوں میں غدر کے وقتوں کی یادگار توپوں کی جگہ پر مشین گنیں رکھی ہیں۔اور جرمن اور روسی بیلے کا مطالعہ کرنے کے بجائے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بم بنانے میں مصروف ہیں۔اور معزز میزبان خاتون چاندی کے چمچے اٹھا کر شکر گھولتے ہوئے سوچتی ہے میں اس طرح کب تک جیوں گی۔آرٹ گیلریوں میں تصویریں اونگھتی جاتی ہیں اور پہاڑوں پر ضدی

خدا بالآخر پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے استقبال کے لئے وہ اسی کے گھنٹے بجا رہے ہیں۔ موسم کی خنکی کھیتوں اور اصطبلوں پر منڈلا رہی ہے۔ یروشلم..... یروشلم.....

خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ شب بخیر خوابوں کے انسانو!

وہ راستے پر چلتا رہا۔ کیسی مدھم روشنی چاروں پھیل رہی تھی۔ جو دن اور رات کے کسی سمے بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور بھورے اور سرمئی اور گلابی مکان سبزے پر خاموش اور پر ہیبت کھڑے تھے۔

یہ انسانوں کے رہنے کے مکان نہیں تھے، اور یہاں روح چپ چاپ چاروں طرف گھومتی تھی۔ اور گہرے سبز آسمان پر بادل کے ریلے زناٹے سے بہہ رہے تھے۔ ورجن میری کے گلابی، نیلگوں بادل، اس وقت وہ اگر کسی بھوت کو سچ مچ دیکھ لیتا تو اسے ذرا حیرت نہ ہوتی۔ اس وقت اگر لودور کی مریم خوبانی کے جھنڈ میں چھپے ہوئے اپنے گروٹو پر سے اتر کر سڑک پر پیدل چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر اس سے اپنا تعارف کراتی کہ میں طلعت جمیل ہوں۔ تو اسے قطعی تعجب نہ ہوتا۔

اسی کے گھنٹے دفعتہً تیزی سے بجنا شروع ہو گئے۔ کیونکہ یہ کرسمس کی رات تھی۔

خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ اس نے چپکے سے دہرایا۔

شیام رس بینا ڈولاؤ۔ گوری کے لاگے بیریا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ اندھیرا ان کے چاروں طرف بہت گہرا ہو گیا۔

(۴)

وہ جو پیلو سعید تھی اس نے اجنبی دیس میں پہنچ کر چاروں کھونٹ نظر ڈالی۔

وہ سب دوبارہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہاں عطیہ فاروق تھی۔ ڈوپٹی تھا۔ شیرو تھی۔ نشو آپا۔ چچا رجو۔ اس کا سارا کنبہ، سارے دوست، وہاں پنکی اشرف بھی آ چکا تھا۔ چھٹیوں کی سختیں وہ سب یاٹ کلب میں گزارتے۔

پنکی چھٹیوں کے روز حسب معمول دن بھر سوتا، رات بھر برج کھیلتا۔

''پنکی تم شادی کب کر رہے ہو؟'' وہ اس سے پوچھتے۔ کیا وہ آئے گی؟''

''ہاں۔ وہ ایک روز ضرور آئے گی'' ..... وہ غیر یقینی طور پر اپنے آپ سے کہتا بالآ کر وہ ایک روز آ گئی۔

عطیہ نے پھولے ہوئے سانس سے پنکی کو فون کیا۔ پنکی بھیا۔ طلعت آ گئی ابھی اس نے ایرپورٹ سے فون کیا ہے۔

سب نے بے حد ایکسائٹ منٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو یہ خبر سنائی اور خوش خوش پنکی کو مبارک باد دینے کے لئے ٹیلیفون کی طرف دوڑے۔

انہوں نے سرد نعمت خانے میں سے پانی کی بوتلیں نکالیں اور سمندر کے رخ پر آ بیٹھے اور اندھیرا پڑے تک پنکی کی باتیں کرتے رہے۔ وہ سب بے حد خوش تھے۔

خوش آمدید طلعت جمیل۔ انہوں نے اس سے کہا۔ یہ وہ زمین ہے۔ جس کا

یہوواہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اور تم بالآخر اپنی ضدوں کے باوجود یہاں پہنچ گئی ہو۔ اب ہم تمہیں واپس نہ جانے دیں گے۔ خوش آمدید۔

وہ جو خون کے دریا، اور موت کی دلدلیں، اور تاروں پر لٹکتے ہوئے انسان اور درختوں سے لٹکتی ہوئی لڑکیاں دیکھ کر آ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایر پورٹ کے سبزے پر شبنم کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ اور نیا پرچم آسمان کی بلندیوں میں لہرا رہا تھا۔

یہاں کتنی چہل پہل اور رونق تھی، اس نے تعجب سے دیکھا۔

آؤ۔ میں تم کو یہاں کی سیر کراؤں..... عطیہ نے بچوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ یہاں کے ہل اسٹیشن۔ یہاں کی رقص گاہیں۔ دیکھو اتنے سے عرصے میں ہم نے کتنی ترقی کر لی ہے۔

وہ یہ سب دیکھتی رہی۔

کتنی خوشی کی بات ہے طلعت ڈارلنگ کہ قوم کی حیات نو کے بعد سے رقص گاہوں کا مجمع پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے۔ اور ملت کی ہر فیشن ایبل بیٹی کے لئے رقص سیکھنا۔ بال پرم کروانا، اور غرارے پہننا لازمی سا ہو گیا ہے۔ اسے بتایا گیا..... دیکھو یہ بین الاقوامی جلسے ہو رہے ہیں۔

باہر کے وفد آ کر ان چیزوں کی کتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ بے حد رعب پڑتا ہے۔ ان پر۔ یہ الف لیلےٰ کی ہالی ووڈ ورژن ایسی زندگی کس قدر طربناک ہے، کل ہمارے یہاں ایک فرانسیسی آیا تھا۔ اور ایک امریکن اور اس کی بیوی۔ تینوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ جب انہوں نے ہمارے اسٹریم لائنڈ ڈرائنگ روم اور

میرے کھڑے پائنچوں کے پائجامے کو دیکھا (جسے یہاں غرارہ کہتے ہیں) کس قدر کیوٹ اور رومینٹک، کس قدر گریس فل۔ انہوں نے تعجب سے کہا۔ دراصل ہم لوگ اب تک یہی سمجھتے تھے کہ آپ سب جھونپڑوں اور کچی مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں اور موٹے موٹے ویل پہنتے ہیں۔ انہوں نے بعد میں ذرا شرما کے اعتراف کیا۔

شیروا سے بتا رہی تھی۔

آہ ایران کی راتیں۔ بغداد کی راتیں، قاہرہ کی راتیں، پنکی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وہ بے حد رومینٹک انداز میں آنکھیں بند کر کے ان جگہوں کو یاد کرتے رہتے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہتی۔ کاش ان جگہوں کو تم نے دن کی روشنی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہوتی۔ امریکن، انگریزی اور فرانسیسی ہوٹلوں اور سفارت خانوں کی جگمگاہٹ سے باہر نکل کر کاش تم ان جگہوں کے گلی کوچوں میں بھی جاتے۔

تم جو مشرق وسطےٰ کا اتنے رومینٹک انداز میں ذکر کرتے ہو۔ تم ان الٹرا فیشن ایبل خانموں کے نیو لک کے فراکوں کے علاوہ ان کی روحوں کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کرتے۔

وہ بیٹھی قہوہ پیتی رہی۔ پنکی کے دوست حسب معمول زور شور سے بحثوں میں مصروف رہے۔ ان میں سے ایک صاحب ملک کی نئی اسکیموں کے فائیلوں کے انباروں میں اضافہ کرنے کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل تھے مختلف قسم کی اسکیمیں۔ کلچر۔ ایگری کلچر۔ ہورٹی کلچر۔ فنون لطیفہ۔ تعمیرات۔ الٰہیات۔ مصنوعات۔

ادبیات۔کتیات۔بلیات۔

گھنٹوں یہ بحثیں جاری رہتیں اور قہوے کے بلوریں فنجان اور ووڈ کاکی بوتلیں خالی ہوتی رہتیں۔

ایلس ان ونڈر لینڈ والے گرافن کے پورپوائز کی طرح، جس نے ایلس سے بگڑ کر پوچھا تھا کہ بھلا کوئی شریف عقلمند مچھلی کسی پورپوائز کے کہیں جاتی ہے، یہ ان کا پورپوائز تھا۔

دن بھر ریڈیو میں قوالی ہوتی رہی۔

''کیا بوریت ہے بھئی۔'' اس نے ایک جمائی لے کر بالآخر کہا۔

''بوریت.....؟ چپکی بیٹھی سنتی رہو۔ یہ قومی موسیقی ہے۔'' کلچر کے نگران اعلیٰ نے ڈپٹ کر جواب دیا۔

وہ اکتا کر ریڈیو گرام کے پاس جا بیٹھی اور چند ریکارڈ چننے میں مصروف ہو گئی۔ پنکی کے دوست صاحب پیچھے سے اچک کر ان ریکارڈوں کو دیکھنے لگے۔

''یہ کیا..... ماروا..... درگا..... غضب خدا کا۔ مومن ہو کر تم درگا سننے کا ارادہ رکھتی ہو جس کے نام ہی سے کفر ٹپکتا ہے.....؟'' انہوں نے پک اپ پر سے وہ ریکارڈ ہٹا دیئے۔

''اچھا مالکوس ہی کم از کم.....'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ ڈپٹ کر بولے۔ ''میاں کی ملہار البتہ سن سکتی ہو.....'' وہ ریڈیو گرام کے قریب آ بیٹھے۔

ریڈیو میں رات کے نو بجے بھیرویں گائی گئی۔ صبح دس بجے سوہنی ہوئی۔ بارہ

بجے سے پھر قوالیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''دراصل اب ہم مشرق وسطےٰ ایک وفد بھیج رہے ہیں.....'' نگران اعلیٰ صاحب نے اسے بے حد سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ بتایا۔ ''وہاں سے موسیقی امپورٹ کی جائے گی۔ یہ موسیقی جواب تک ہم سنتے سناتے رہے ہیں، ساری کی ساری خالص غیر ملکی تھی۔ ہماری روح اور ہمارے وجدان سے اس کا کہیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہ ہمارے اوپر امپوز کی گئی تھی۔ اور بہت سی چیزوں کی طرح.....''

''لیکن بھائی صاحب۔'' اس نے آہستہ جواب دیا۔ ''مشرق وسطےٰ کے پاس تو آج کل اپنی موسیقی کوئی ہے ہی نہیں۔ تھوڑی بہت عربی اور مصری موسیقی کے علاوہ ساری کی ساری یورپ کی سستی موسیقی کی انتہائی بھدی نقالی ہے اور مغربی کلاسیکل موسیقی کو سمجھنا یا پسند کرنا ان کے یا ہمارے آپ کے کسی کی بھی بس کی بات نہیں۔ آپ کون سی موسیقی امپورٹ کیجئے گا؟''

''غلط ہے.....'' وہ گرج کر بولے۔ ''تمہارے خیالات انتہائی مفسدانہ ہیں۔ ہر بات میں مخالفت ہر بات پر اعتراض.....'' وہ روٹھ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھے۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے طلعت بیگم، کہ زندگی کے ہر شعبے میں یہ ایکس پورٹ و امپورٹ کا سلسلہ ہماری مادی و روحانی و تمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ کلچرل اور انٹلکچوئیل ترقی کے سلسلے میں ہم امریکہ سے کیپٹن ماروِل اور سپر ویسٹرن کومکس اور جین رسل کے فلم منگواتے ہیں۔ وہاں ہم اپنی خواتین کے گریس فل غرارے کلچرل نمائش کے طور پر بھیج رہے ہیں..... دوگ کے تازہ پرچے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ وہ پیرس اور نیویارک کے لباس خانوں میں غراروں کی تقلید میں اس وضع کے

ایوننگ ۔فراک تیار کئے جا رہے ۔انہوں نے اسے مطلع کیا۔

اس رات اس نے ایک عجیب وغریب سا اور بے حد مضحکہ خیز خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بیس سال کے بعد اس سرزمین کو واپس آئی ہے ۔اور جب وہ بندرگاہ پر اترتی ہے تو اسے کوئی آدم یا آدم زاد دکھائی نہیں دیتا۔ ہر سمت ہو کر عالم ہے ۔سڑکیں سنسان ہیں ۔دکانوں میں کوئی کاروبار نظر نہیں آتا۔بس ہر طرف ان گنت بچے جو شیلے نعرے لگاتے لکڑی کے گھوڑوں اور تلواروں سے کھیل رہے ہیں ۔شہر کا یہ منظر دیکھ کر قرون اولی کے قصبوں کا دھندلا سا تصور اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔وہ بے حد تعجب کے ساتھ ایک سڑک پر چل رہی ہے اتنے میں اسے ایک جانا پہچانا سا انسان نظر آتا ہے ۔وہ اسے غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتی ہے ۔اس کی بہت لمبی داڑھی ہے ۔سبز عمامہ اور ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ ۔یہ پنکی اشرف ہے جو ترقی کر کے اس دوران میں قاضی القضاۃ بن چکا ہے۔ وہ شہر کا کوتوال بھی ہے ۔اور اس وقت شہر کا چکر لگانے کے لئے نکلا ہے۔ دو حبشی غلام اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ۔وہ اس کے ساتھ ہو لیتی ہے شہر کے دیسی حصہ سے باہر نکل کر دفعتہً ایک بے حد خوبصورت صاف شفاف اور شاداب مقام اسے نظر آتا ہے۔ جہاں خوبصورت عمارتیں اور کوٹھیوں کی قطاریں ہیں ۔اور ہر پھاٹک پر ان گنت پیکارڈ اور رینش موٹریں کھڑی ہیں ۔اس آبادی کے گرد ایک اونچی سی چہار دیواری کھینچی ہے جس کے سائے میں چھکڑے کھڑے ہیں اور اونٹ جگالی کر رہے ہیں اور سڑک پر دونوں طرف بیشمار دبلے پتلے، رنگ برنگے انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے اونگھ رہے ہیں ۔یا داڑھیوں میں انگلیاں پھیر رہے ہیں ۔یا

حقہ پیتے پیتے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب کون بیچارے ہیں اور سول لائنز ایسی آبادی کس کی ہے..... وہ حیرت سے پوچھتی ہے۔

ہش پنکی بے حد پراسرار طریقے سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ انہیں بیچارے نہ کہو۔ یہ سب غازی ہیں۔ ہم سب غازی ہیں۔ ہم نے اپنا سارا دنیاوی کاروبار امریکنوں کو کنٹریکٹ دے دیا ہے۔ جو اس سامنے والی سول لائینز میں رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حکومت بھی انہیں ٹھیکے پر دے دی ہے۔ اب ہم اطمینان سے اور فرصت سے بیٹھے ہیں۔ امریکن ہماری طرف سے حکومت کا انتظام کرتے ہیں۔ اور ہم غازیوں کو فرصت مل گئی ہے تاکہ اور زیادہ غازی پیدا کر سکیں۔

پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور اسے اپنے خواب پر بے حد ہنسی آئی۔ اور اپنا یہ خواب پنکی کو سنا کر وہ دیر تک شگفتگی کے ساتھ کھلکھلا کر ہنستی رہی۔

وہ یہاں آ گئی ہے۔ اور پنکی آج کل بہت خوش ہے۔ اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ کلبوں میں لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔

آئینے کھڑے ہیں۔ اور چاندی کے برش اور وہ شیلف جس پر نجنسکی رقصاں ہے اور طویل گیلریوں کے پرے سمندر گرجتا ہے۔ جہاں یاٹ ہیں۔ اور ڈونگے۔ اور ساحل کا لوٹ کلب۔ یہ سب چپ چاپ کھڑے ہیں۔ سمندر کتابیں نجنسکی۔ یہ سب اندھیرے میں جگ رہے ہیں۔ اور منتظر ہیں۔ اور انتظار میں ان کا خاتمہ ہے۔ اور یسوع کی روح ایسی راتوں میں پانیوں پر چلتی ہے۔ اب مجھے جانا چاہیے۔ صبح ہو رہی ہے۔ آؤ ہم لوٹ چلیں۔ چھوٹی چھوٹی عورتیں ایسی راتوں میں ہاتھوں

میں پنکھیاں لے کر اپنے باغوں میں گھومتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے انسانوں سے محبتیں کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ تھک کر خدا کی روح کا پانی کی سطح پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خاتمہ اور تکان (تمہارے لئے اور کوکو بناؤ.....؟) انتظار کرو۔ اس نے سوچا۔ اور شدید تکان کے اس شدید حسن کو پہچانو۔ رات گذر رہی ہے۔ اور نیند آتی ہے۔ بغیر نیند کی نیند۔ میں ضرور لوٹ کر آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

شہر اپنی جگہ پر چپ چاپ موجود تھا۔ سمندر سرخ چاند کی مدھم شعاؤں میں جھلملا رہا تھا اور قبرستانوں کے باسی ابدیت کی نیند سے تھوڑا سا جگ کر خاموشی سے اوپر کی آوازیں سن رہے تھے۔ اور ان کے دماغ شاید بے بسی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن چونکہ وہ مر چکے تھے۔ اس لئے قبرستانوں میں بھی ویسی ہی خاموشی طاری رہی۔

آسمان جیسے گہرے نیلے روغن سے رنگا گیا تھا۔ اور سرخ مکینکل پلوں کی قطاریں، جن کے سرے اونچے تھے اور سڑکوں کی دیواریں جن پر اندھیرے میں روشنی کی لکیریں رات رات بھر تصویریں بناتی رہتی تھیں، یہ سب اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

اس کا طیارہ فضا میں بلند ہوا۔ رات کی سطح پر وہ اوپر اٹھتے گئے۔ آسمان کی شدید وسعت نے ان کی نظریں زخمی کر دیں۔ ان کی روحیں منجمد تھیں۔ صرف ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ اور کنٹرولز پر ان کے ہاتھ موجود تھے۔ شمال مغرب کے برفانی میدان جنگ پر اپنی امداد پہنچاتے وہ دوبارہ مشرق کی طرف مڑ گئے۔

وہ اپنے ہمالیہ کے پرانے گھر واپس پہنچ گئی۔ اس نے دریچے میں کھڑے ہو کر

ان نیلی فضاؤں کی سمت دیکھا جدھر سے وہ جا کر لوٹ آئی تھی۔ وہ دریچے میں جھک کر باہر دیکھنے لگی۔ جہاں آلوچے کے زرد شگوفے کھل رہے تھے۔

چنانچہ طلعت جمیل۔ تم بالآخر واپس آ گئیں۔ اس نے اپنے آپ سے آہستہ سے کہا۔ اور اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ چنانچہ اب تم دارالسلطنت کی ٹی پارٹیوں میں بیگم اشرف بن کر مسکراہٹیں نہ برساؤ گی۔ بین الاقوامی کلچرل کانفرنسوں میں شمولیت نہ کرسکو گی۔ انتہائی غیر ضروری ڈنرز میں غیر ملکی سفیروں سے انتہائی غیر ضروری باتیں نہ کرو گی۔ پریس والوں کے کیمرے تمہارے چاروں طرف کلک کلک نہ کریں گے۔

تم کتنی بدقسمت اور بے وقوف ہو طلعت جمیل جو تم نے ان سب چیزوں کی دل کشی کو محسوس نہ کیا۔ اور واپس آ گئیں!!

ہمالیہ اپنی جگہ پر اپنی عظمت اور اپنی ہیبت کے ساتھ ہمیشہ کی طرح سربلند اور اٹل کھڑا تھا۔ اس کی وادیوں اور اس کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی اس زندگی پر انہوں نے کبھی غور نہ کیا تھا۔ وہ جو ڈیڑھ سو سال سے موسم گرما میں وہاں جگل میں منگل لگانے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان نیلگوں جنگلوں اور عظیم الشان پہاڑوں، خطرناک دروں اور خوبصورت وادیوں میں رینگتی ہوئی زندگی کو انہوں نے کبھی قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ ہمالیہ کے بیٹے محض ان کی رکشائیں کھینچتے تھے۔ اور ان کے سامان ڈھو کر بلند ترین چوٹیوں تک لے جاتے تھے۔ ان کے بلیک اینڈ وائٹ سگریٹ اور روپے چراتے تھے۔ اور جاڑوں میں جب وہ اپنے نیپال دیس یا گڑھوال واپس جاتے تھے تو فاقے سے مرتے تھے یا ٹیڑی کا مہاراج انہیں الٹا

لٹکا کر پٹواتا تھا۔

اسی طرح وہ جیتے رہے۔ اور مرتے رہے۔ اور اسی طرح ان پہاڑوں پر یہ اندر سبھائیں سجتی رہیں۔ جھیل کی دھندلی کشتیاں۔ فلیٹس کے مناظر۔ میٹروپول کے ناچ۔ کوئیلے کے بھاری کنڈے۔ ایک نواڑ کے ذریعے پیشانی سے باندھے وہ علی الصبح دھند آلود..... سڑکوں پر بیچنے کے لئے چلاتے پھرتے تھے۔ لیکن اودے شنکر نے وہاں پہنچ کر محض ایک رقص کدہ قائم کر دیا تھا۔ یہاں سے گنگا اور جمنا آتی تھیں۔ یہاں سے شاردا اور گومتی اور گھاگرا نکلتی تھیں۔ یہاں سے کائنات کی تخلیق ہوئی تھی۔

دریچے میں کھڑی وہ باہر دیکھتی رہی۔ یہی وہ نینی تال تھا۔ جس کے بوٹ کلب کے پھاٹک پر ایراف گریس ۴۷ء تک ''ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ منع ہے۔'' اور ان یورپین بچوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ جن کے ساتھ ہندوستانی نوکر ہوں۔'' کا بورڈ لگا تھا۔ یہ سات تال تھا۔ یہ بھیم تال تھا۔ یہ نینی تال تھا۔ جہاں بھگوان شیو کی مہارانی ستی کی آنکھیں گری تھیں۔ جہاں بھگوان شیو نے تخریب و تخلیق کا رقص کیا تھا، جہاں سے دنیا کی تکمیل کی گئی تھی۔

وہ دریچے میں کھڑی رہی۔ جھیل پر روشنیاں رقص کرنے لگی تھیں۔ اور نیچے، آلوچوں کے جھرمٹ میں کوئی والگا کے ملاحوں کا نغمہ بجا رہا تھا۔

پتوں اور شگوفوں میں سے بھیگے ہوئے دھوئیں کی طرح آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔

اس نے نغمے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اور یاد آیا۔ یہ کون سی راگنی، کون سی لے

تھی۔وہ چپ چاپ سنتی رہی۔اس نے پہچانا۔اسے یاد آیا۔

موسیقی بہت قریب سے اٹھتی ہے۔قریب تر۔اس میں کیسا جوش ہے کیسی تیزی ہے۔کتنا درد ہے۔پھر رات کے سناٹے میں یہ لے دور ہوتی جاتی ہے۔دور ہوتی جاتی ہے۔دفعتہً پھر نزدیک آتی ہے۔بہت سی آوازیں اکٹھی اٹھتی ہیں۔کشتی دور ہو رہی ہے۔اور دور.....اور دور.....اس کی نرم روی۔اس کا سکون۔یہ زندگی کا خاتمہ ہے۔دنیا کا خاتمہ ہے۔سنگیت پھر نزدیک آتی ہے۔وہی درد ہے۔وہی کرب ہے۔وائلن کے سر اوپر اٹھتے جا رہے ہیں۔گٹار اور چپوؤں کی ملی جلی آوازیں پھر دور ہوئی جاتی ہیں۔یک لخت گٹار تیز ہو جاتا ہے،اور پھر رفتہ رفتہ اس کی لے ڈوبتی جا رہی ہے۔اسی نرم روئی کے ساتھ۔اسی سکون کے ساتھ۔ایک اکیلی آواز بلند ہو رہی ہے۔یہ حیات کا نغمہ ہے۔کاسکوں کا گیت ہے۔والگا کی روح کی آواز ہے۔وہ دور ہوتے جاتے ہیں۔اور دور۔ان کی آوازوں میں وہ تیزی،وہ ولولہ باقی ہے۔وائلن کے سر رفتہ رفتہ پھر قریب آتے جا رہے ہیں۔قریب تر،وہی زندگی ہے۔وہی روانی۔وہی درد۔یک لخت زندگی جاگتی ہے۔روشنی جاگتی ہے۔یہ کائنات کی نئے سرے سے تخلیق ہو رہی ہے۔پچھلے چھ دنوں میں خدائے قدوس نے اسی سنگیت کی لہروں پر دنیا کی تشکیل کی تھی۔یہ اس عظیم دریا کی لہریں ہیں۔آؤ۔ہم اس کی روشنی میں آگے چلیں۔یہاں پر سکون ہے۔امٹ سکون۔اور امید۔نور۔طاقت۔والگا۔والگا۔ہم ایک روز تیری طرف پہنچیں گے۔اپنے مینڈولین کے تاروں کو بجائے جاؤ میرے بہت پیارے ملاحو۔تم خدا کے اپنے بیٹے ہو۔تم مقصد حیات کے اصلی وارث ہو۔کاسکوں کی آوازیں رفتہ

رفتہ دور ہوتی جاتی ہیں۔ ہم ایک جھٹکے کے ساتھ پھر اپنی دکھی دنیا میں واپس آ جاتے ہیں۔

اس خوش نصیب دنیا کے خوش نصیب انسانو تم پر خدا کی رحمت ہو۔

وہ دریچے میں جھکی رہی ہے آلوچے کے زرد شگوفے موسیقی کے ساتھ ساتھ دھندلکے میں چھپ گئے۔

پھر اپنی چوٹیوں پر چلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ عالم موجودات کا یہ اجتماعی لاشعور زندگی کے ویرانے پر بھٹکتا پھر رہا ہے۔ انسانوں کی یہ جھکی ہوئی قطاریں اس نے دیکھیں یہ انسان جو پگڈنڈی پر جا رہا ہے۔ جو دھان کے کھیت میں کھڑا ہے۔ جو درخت کاٹ رہا ہے۔ اور اس کے پیچھے وہ سارے زمانے گھسٹتے آ رہے ہیں۔ سنہرے زمانے۔ سیاہ زمانے۔

لیکن ٹھہرو! اس نقرئی سرورق کو دیکھو جسے چغتائی نے بنایا ہے۔

اس کے مختلف صدیوں کے مختلف وجودوں کا جلوس اس کے پیچھے پیچھے چلتا آ رہا تھا۔ یہاں کوئی خاتمہ نہیں۔ رنج باقی ہیں۔ محنت باقی ہے۔ پچھتاوے باقی ہیں۔

وہ دنیا کے آخری سمندر، آخری طوفانوں کے قریب آئی۔ جہاں سناٹے مسکرا رہے تھے ان سناٹوں میں آوازیں تھیں۔ آندھیوں کی۔ اور چٹانوں پر لہروں کے ٹکرانے کی۔ وہ ان کے نزدیک آئی۔ اور اس نے عناصر کی اس گرج دار گفتگو کو سنا۔ جو زمان و مکاں کی زبان حال تھی۔ لیکن یہ سب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بہت کم کم وہ اسے پہچان سکی۔ ہوا چاروں کھونٹ سے امنڈتی آ رہی تھی۔ اور اس کے

سامنے عناصر کی سلطنتیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ ان آوازوں اور اس کی زبان کے مقابلے میں اسے اپنی آواز اور اپنی زبان بہت عجیب مضحکہ خیز اور قابل رحم معلوم ہوئی۔ یہاں خدا اور کائنات کا انجام تھا۔

لیکن ان قیامت خیز آندھیوں اور خطرناک سمندروں کے کناروں پر اس نے دیکھا کہ سفید پھول کھل رہے تھے۔ ٹھنڈے اور پرسکون۔ ان سفید پھولوں میں اس نے اپنا چہرہ چھپا دیا۔ اور شبنم کی خنکی کو چھوا۔

آخر کار

آخر کار

آخر کار

(۵)

وہ چلا گیا۔ سنا تم نے۔ طلعت جمیل کے واپس جانے کے بعد وہ بھی یہاں سے چلا گیا۔ مغرب کے سات سمندروں اور برفیلے پہاڑوں کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا وہ ادھر گیا ہے جہاں ایلبنی کے مغرور ایوانوں میں اس کے لئے ضیافتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ ہے نہایت اخلاق کے ساتھ شاہ بلوط کے آتشدانوں کے قریب کھڑا پائپ پیتا رہتا ہے۔ اسے اس ضروری کام کے لئے وہاں بھیجا گیا ہے۔

ڈوپی کہہ رہا تھا۔

پیلو بہت تھکے ہوئے قدم رکھتی آ کر دیوان پر گر گئی۔ یہاں خاتمہ نہیں ہے۔ یہاں خاتمہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ رنج باقی ہیں۔ دکھ باقی ہیں۔ پچھتاوے باقی ہیں۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہم نندہ دیوی کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

چچا رجو..... اس نے بچوں کی طرح کہا۔ چچا رجو۔ کوئی کہانی سناؤ۔ فن لینڈ کی کہانی۔ جہاں تم نے رات کا سورج دیکھا تھا۔ اور اونچی برفانی وسعتیں۔

چچا رجو جوتکیوں کا سہارا لے کر پلنگ پر اٹھ بیٹھے۔ پیلو بٹیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ تم کاہے کے لئے رنجیدہ ہو میں ساری عمر جھوٹ بولتا رہا۔ اپنے آپ کو خوش رکھنے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لئے۔ تاکہ آخری سمے مجھے اطمینان ہو کہ میری باتوں کی وجہ سے دوسروں نے کم از کم چند لمحے مسرت سے بتائے۔ میں نے دنیا کے دور دراز خطوں کے متعلق کہانیاں سوچیں۔ عجیب عجیب چیزیں جمع کر کے ان کے لئے لطیفے گھڑے۔ جبکہ میں خود کبھی اپنے ملک کے ساحل سے آگے نہ جا سکا تھا۔ میں دنیا میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ لیکن کم از کم میری وجہ سے تم سب کو ہنسی تو آ جاتی تھی۔ کسی نے اک دفعہ مجھے ایک واقعہ سنایا تھا۔ کہ کسی سرسبز خطے میں سے ایک ٹرین گزر رہی تھی، کسی وجہ سے وہ ایک جگہ پر چند منٹ کے لئے ٹھہر گئی۔ دفعتہً اس میں سے ایک آدمی اترا۔ اور اپنا اٹیچی کیس سنبھال کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ جدھر نیلگوں پہاڑ اور ہرے مرغزار تھے۔ لیکن وہاں کوئی اور خاص بات نہ تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ مجھے مت روکو۔ مجھے جنم جنم سے اس جگہ پہنچنے کا انتظار رہا ہے۔ اور آج مجھے وہ جگہ نظر آ گئی

ہے۔اور میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔وہ چلا گیا۔اورٹرین اسے وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہوگئی۔ہم سب اس طرح نندہ دیوی پہنچ جائیں گے۔انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ہم سب نندی دیوی پہنچیں گے۔

ہاں۔ہم سب نندہ دیوی پہنچیں گے۔پیلو نے چپکے سے دہرایا۔

وہ اس سرزمین پر لوٹ آئی۔جسے وہ سب چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اب خزاں بھی واپس جا رہی ہے۔اور جھیل کے پودے کنارے تک پھیل آئے ہیں وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔اور سرخ پتے اس کے چاروں طرف اڑ رہے ہیں اور سفیدے کا جنگل چپ چاپ کھڑا ہے۔اور سفید پوش راہب چاندی کی موم بتیاں اٹھائے سایوں کی طرح لکڑی کے پل پر سے گزر رہے ہیں۔

اسی کے گھنٹے اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ بجتے جا رہے ہیں۔اور سبز بانس کے جھنڈ پر اندھیرا گرتا آ رہا ہے۔

خداوند ہمارے پرکھوں کے خدا، جو ہمیشہ سے تھا، اب ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوند ہمارا خدائے مطلق جو ابدالآباد تک جیتا اور سلطنت کرتا ہے۔

خوبانی کے جھنڈ میں لودور کی مریم کی مورتی کے آگے جھکے وہ کہہ رہے ہیں۔

اے سینٹ این کی بیٹی ہم پر رحم کر۔

خدا جس نے ازل میں تجھے اپنی دلہن منتخب کیا۔جس کے ذریعے آسمان زمین اور سمندر تخلیق کئے گئے۔جسے اس گناہ اور جرم سے محفوظ رکھا گیا۔جو زوال آدم کا باعث ہوئی۔اے یعقوب کے نئے ستارے، فرشتوں کی ملکہ، اور انسانوں کی ماں جسے خدا نے اپنی ماں منتخب کیا، جس نے آسمانوں پر ایک روشنی پیدا کی اور زمین پر

کہرا پھیلایا۔تا کہ ہم تیرے ذریعے بادشاہ تک پہنچ سکیں۔ایلیلیاہ۔

اسی کے گھنٹوں کی گونج فضا میں منڈلاتی ،پھیلتی اور ڈوبتی جا رہی ہے۔ تاریک ہوائیں باغ میں بہہ رہی ہیں۔اور سارے میں ایک ایسا مدھم اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔جو دن رات میں سے کس وقت پیدا نہیں ہوتا۔

میری کیسل۔آؤ ہم اس تاریکی اور اس اجالے کی تصویر بنائیں۔کیونکہ ہم نے اپنا راستہ دیکھ لیا ہے۔

اختتام۔۔۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

پانی کنارے کنارے بہتا جا رہا ہے اور پتے پراسرار بادبانی جہازوں کی طرح پانی کی سطح پر وقار اور تمکنت کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ اور سبزے پر جو شکستہ بنچ پڑی ہے اس کے چاروں اور پرانے کاغذ کے ڈبے، سگرٹ کے ٹکڑے اور ان دوسرے راہ گیروں کی چھوڑی ہوئی چیزوں کے نشان بکھرے پڑے ہیں۔ جو ایسی ہی خنک راتوں میں یہاں بیٹھ کر سستائے۔

وہ لوگ جو یہاں سے گزرے تھے۔ ان میں سے کچھ مر چکے ہیں۔ اور کچھ دنیا کے کونوں میں گھوم رہے ہیں۔ کچھ اپنے بستروں پر خاموش لیٹے ہیں۔ وقت مصنوعی ہے۔ اور سرد۔ ستارے تیزی سے جلتے ہیں۔ اور لمحات اس طرح ختم ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے صبح کے بڑھتے ہوئے اجالے میں رات کی روشنیاں گم ہو جاتی ہیں۔ گلیاں۔ اونچے پل۔ لیمپ۔ باغات۔ ساحل سب مر چکے ہیں۔ صرف ہم زندہ ہیں۔ صرف ہمارا دماغ۔ اور بارش لیمپ کی خنک روشنی۔ کہر آلود گھاس اور دماغ نے ان محسوسات کو جمع کیا ہے۔ زندگی کی اس بکھری ہوئی تصویر میں کیا تمہیں خوف نظر آیا ہے۔ تم لوگ جہاں چاروں طرف گھومتے ہوئے سیارے ہیں۔ اور سڑکوں کی تیز روشنیاں، اس چکر میں تم موجود ہو۔ جاگتے ہو۔ زندہ ہو۔ کام کرتے ہو۔ یہ کہر آلود طویل سرنگیں جن کے روشندانوں میں سے اجالے کی تیز لکیریں تیرتی ہوئی نیچے اترتی ہیں۔ فولاد کے شیڈ، ہجوم، چیختی چلاتی موٹریں۔ پریم

گاڑیاں دھکیلتی سرخ بالوں والی سفید فام عورتیں۔

باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے ہوا کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ جو سمندروں پر چل رہی ہے۔ جھاڑیوں کا بھیگا پن۔ پتھروں کی مہک۔ ندیوں کا سکون۔ ان جگہوں پر خدا کی روح رہتی ہے۔ اور میں ان زمانوں کو یاد کرتی ہوں۔ جب صبح کی برف سمیٹ کر وہ اندر آتے۔ درختوں پر دھند جمی ہوتی۔ اور لکڑی کے مکانوں میں سے دھواں اٹھتا۔

دنیا کی آبادیوں پر صبح ہوتی ہے۔ فٹ پاتھوں پر خیموں کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے جھونپڑوں پر۔ اور نیچے فلیٹس کی تاریک قطار اندر قطار کھڑکیوں پر جو پراسرار طریقے سے کھلتی اور بند ہو جاتی ہیں۔ مہربانو۔ شہربانو۔ خدا حافظ۔ اپنی عارضی پناہ گاہوں۔ مکانوں۔ فلیٹوں کو سمیٹ لو۔ آسمان گر رہا ہے۔ گر رہا ہے۔

مملکت تابلستان کے سفارت خانے کا شاردا۔ فیرز صبح کے نو بجے سو کر اٹھا۔ اپنے ملک کے اخباروں پر سرسری نگاہ ڈالی۔ اور مادام استوفسکی کو فون پر صبح بخیر کہنے کے بعد کمرے کے لمبے دریچے میں سے باہر نظر ڈال کر اس نے دیکھا کہ کیرل گانے بہت دیر ہوئی اپنے نغمے سنا کر واپس جا چکے ہیں اس وقت دماغ پر زور ڈال کر اس پرانے کیرل کو یاد کیا۔ اور اس نے سوئٹزرلینڈ کے اسکول میں سنی تھی کہ ایک لنگڑی بھیڑ مقدس شہر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ تاکہ وہاں پہنچ کر دوبارہ پیدا ہو سکے۔

اور میں ان وقتوں کو یاد کرتی ہوں جب پلنگ پوش کے نیلے سمندر پر ہم بید کی ٹوکری کے جنگی جہاز تیراتے تھے۔ اور رنگ برنگے اسکارف اس میں بادبان کے

طور پر لگائے جاتے تھے۔ اور زیتون کے نیچے اور صوفوں کے پیچھے چھپ کر بحری قزاقوں کی جنگ ہوتی تھی۔ اور تب ہم نے رات کو باہر گھاس پر بیٹھے بیٹھے ستاروں کی روشنی میں۔ پھولوں کو بڑھتے دیکھا۔ لیڈی برڈ اور ہولی ہوکس کی مہذب گفتگو سنی۔ اور عینک لگائے عقلمند الو کے فلسفیانہ تبادلہ خیالات پر غور کیا۔

بہار کے سرخ پھولوں اور خزاں کی سرخ آگ کے درمیان ہم وقت گزارتے رہے۔ اور میں نے مالی کو دیکھ کر سوچا کہ یہ کیسا بیوقوف مالی ہے۔ جو دن بھر اس قدر سنجیدگی سے پھولوں میں مصروف رہتا ہے۔ سرخ۔ زرد۔ کاسنی اور آبی پھولوں کی قطاروں کے درمیان اپنے پراسرار زرد پیکٹ نکال نکال کر ٹہنیوں پر اٹکاتا رہتا ہے۔ اور کبھی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ میں اس سے کہنا چاہتی۔ اے بیوقوف مالی۔ تم کتنے عقلمند ہو۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ابھی خزاں آ جائے گی۔ اور تمہاری یہ کیاریاں ویران ہو جائیں گی۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوتا کہ تم میرے ساتھ آ کر دکان دکان یا ریل ریل کھیلتے۔

لیکن یہ پانی اسی طرح رواں ہے۔ اور ان کنجوں کی طرف سے آ رہا ہے۔ جہاں بچپن میں وہ کھیلتے تھے۔ جن کے لئے ناشروں نے کتابیں تیار کیں۔ کہانیاں سوچیں، رنگین تصویریں بنائیں۔ اور دوسرے بچے دوسرے باغوں میں اسٹرابری چننے میں مصروف ہیں۔ اور درختوں کے نیچے بحری قزاقوں کا کھیل رہے ہیں۔

اور کھڑکی کے باہر ہواؤں کے ریلے میں زمانے کا پراسرار موسیقار ارگن بجاتا جا رہا ہے۔ ہم پرانے مکانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اور اندھیرے کمروں میں گرد آلود شاہ بلوط کی میزوں کے گرد بیٹھ کر شمع کی روشنی میں باتیں کرتے ہیں۔ اور

روغنی تصویریں اداسی سے ہمیں دیکھتی رہتی ہیں۔

پانی کے کنارے، سبزے پر جو انسان بیٹھا ہے۔ اسے دیکھو اور عبرت پکڑو۔ یہ ایک مٹے ہوئے گھرانے، ایک زوال شدہ تمدن ایک دھندلے پس منظر سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ اس کے باپ دادا محل سراؤں میں رہتے تھے۔ خواصوں اور مصاحبوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ اور مثنویاں پڑھتے پڑھتے اس جہان فانی کو خیر باد کہتے تھے۔ یہ انسان اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اپنے ان کرم خوردہ شجروں کو لپیٹ رہا ہے۔ جن میں ہر پشت میں ان گنت تعلقداروں، خان بہادروں، ڈپٹی کمشنروں اور سرکار انگلشیہ کے دل پذیر فرزندوں کے اسم ہائے گرامی درج ہیں۔ فلاں ابن فلاں، ابن فلاں۔ فلاں بنت فلاں، بن فلاں۔ میری پھوپھی کی شادی ہوئی تھی۔ تو لکھنؤ سے لے کر سندیلے تلک سڑک پر مخمل کا فرش بچھایا گیا تھا۔ اور میری دادی کی بارات میں ماہی مراتب والے اشرفیاں نچھاور کرتے گئے تھے۔ اپنے خاندان کی ان شاندار روایات کے متعلق سوچ کر ہم بے حد دکھ کے ساتھ سرد آہ بھرتے ہیں۔ ہم پانی کے کنارے گھاس پر بہت اداس بیٹھے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ واقعی پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ تاریک کمروں اور صحنچیوں اور گیلریوں میں گھس کر ہم نے ان سب چیزوں کو کھول کر دیکھا۔ پرانے قالین جو طہران اور مشہد میں خریدے گئے۔ چینی کے برتنوں کا انبار جو پیرس میں جمع کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے جو شنگھائی سے منگوائے گئے تھے اور آپ کو پتہ ہے جناب ہمارے خاندان میں تین نائٹ گذرے ہیں۔ نائٹ کمانڈر آف دی انڈین ایمپائر۔ ہمارا خاندان..... ہمارا خاندان..... ہمارا خاندان۔ اور ایم۔ بی۔ بی۔ او

بی۔ای وغیرہ کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ٹوکروں لے لیجئے۔اور بھائی محض امام باڑے کے سامان ہی کا ایک پورا وقف قائم کیا جا سکتا تھا۔ چاندی کے علم کا رچوبی پٹکے۔ گنگا جمنی ضریح اور گہوارے،نقرئی عود دان۔

اللہ اکبر۔اے معزز ناظرین ہم وہ لوگ ہیں جن کا ایک زمانے میں سارا فیض آباد۔اور بنگالے کا سارا چوبیس پرگنہ اپنا تھا۔اور جنہوں نے اپنی ایک نگڑ دادی کے فرشی پائجامے کا مسالہ۔اور جواہرات فروخت کر کے لاٹ صاحب کی دعوت کی تھی۔جس کو کہ ساری آغا میر کی ڈیوڑھی اب تلک یاد کر کے روتی ہے۔

''اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔''

کنارے کی نمی میں سبراؤن پتے جم گئے ہیں۔میں یہاں بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں۔میرے عزیز۔میرے بھائی تم میرا مرثیہ لکھو گے۔میرے باپ کا مرثیہ میرے دادا کا مرثیہ،سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن۔ویٹس دی وے ٹو لندن ٹاؤن۔ آہ میرا وہ الزتھن وضع کا کنٹری ہاؤس جو میرے باپ نے ہمالیہ کے دامن میں کس شوق سے بنوایا تھا۔

رونے دو بھائی!اے مادہ پرستو۔مڈل کلاس والو میں تو روح کی ارسٹوکریٹ ہوں۔سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن۔ویٹس دی وے ٹو لنڈن ٹاؤن۔

اب آپ صاحبان غم غلط کرنے کے لئے ایک کہانی سنئے۔

''الواور پوسی کی کہانی۔''

الواور پسی سبز رنگ کی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کے لئے گئے۔اور اپنے ساتھ شہد اور ٹافی لیتے گئے۔الو ستاروں کو دیکھتا رہا۔اور گٹار پر اس نے گایا.....

اے میری پیاری پوسی۔تم کتنی خوبصورت ہو۔

پوسی نے جواب دیا اے شاندار اور دل کش اور ہر دلعزیز پرندتم کس قدر عمدہ گاتے ہو! شادی کی انگشتری خریدنے کے لئے تیرتے تیرتے وہ ایک جنگل میں پہنچے۔ جہاں ایک بے حد عالم فاضل اور فنکار ریگ رہتا تھا (جسے اردو میں سؤر کہتے ہیں) جس کی ناک میں ایک انگوٹھی تھی۔ چنانچہ اس سے انگشتری خرید کر وہ پیرو کے پاس گئے جنھوں نے شادی کا خطبہ پڑھا۔بعد ازاں انہوں نے چوہوں اور پنیر کا ناشتہ کیا۔اور چاند کی روشنی میں ریت پر رقص کرتے رہے۔

(انگریزی نرسری کا گیت)

اگر معزز ناظرین اس روح پرور کہانی کو پڑھ کر محظوظ نہیں ہوئے تو مجھے قطعی اس کا افسوس نہیں۔

ہوا یہ کہ انقلاب کے بعد جو لڑکیاں آئیں ان میں سے بہت سی تو کالجوں میں پڑھا رہی ہیں۔سب نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے کیا ہے۔اور ہمیشہ فرسٹ آتی رہی ہیں۔افسوس کہ سب کی ڈگریاں اور اسناد دہلی اور بمبئی کی ایرپورٹ پر پری وی نیو والوں کم بختوں نے قبضے میں لے لئے۔ یہ سب لڑکیاں ہندوستان کے مختلف ہل اسٹیشنوں پر کانونٹ اسکولوں میں پڑھتی تھیں۔اور سب نے موسیقی میں ٹرنٹی کالج سے ڈپلومہ حاصل کئے تھے۔حیف کہ پیانو کے ساتھ ان کے ڈپلوما کے کاغذات بھی ہند ہی میں رہ گئے۔ان میں سے ایک دو لڑکیاں فارن سروس میں لے لی گئیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ شریعت کی رو سے مومنہ کو فارن سروس میں داخل ہونا ناجائز ہے۔چند ایک نے فری لانس

جرنلزم شروع کر دی۔ اور سرکاری رسالوں اور اخباروں میں غراروں کے فیشن اور پڈنگ کی تراکیب کے متعلق مضامین لکھنے لگیں باقی کی سب کی سب زنانہ امدادی افواج میں شامل ہو گئیں اور ترقی کی طرف مارچ کر رہی ہیں۔ دس فی صدی ان میں سے سوسائٹی کے مخلوط کلبوں میں بھی جاتی ہیں۔ چند ایک نے رقص بھی سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ ابھی وہ محض اپنے بھائیوں، بہنوئیوں یا دوسرے قریبی عزیزوں کے ساتھ ہی رقص کرتی ہیں۔ لیکن مصمم ارادہ ہے کہ شادی کے بعد سب کے ساتھ ناچا کریں گی۔

انٹلکچوئیل لڑکیاں ایک فی ہزار بلکہ اس سے بھی کم مقدار میں تھیں۔ ان کو اپنے متعلق بڑے زبردست مغالطے تھے۔ لہٰذا وہ ہر ایک سے بے حد سرپرستانہ انداز میں ملتیں اور تازہ ترین سیاسی اور اقتصادی بین الاقوامی صورت حالات پر مختصر سا تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد خاموشی سے بیٹھی قہوہ پیتی رہتیں۔ اور ان زمانوں کو یاد کرتیں جب وہ وطن مرحوم میں گروپ تھیٹر والوں کے پرتھوی راج۔ چیتن انند۔ کشور ساہو۔ اور زہرہ سہگل کی معیت میں ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ اور فنون لطیفہ کی ترویج کے سلسلے میں جنوبی ہند کی رکمنی دیوی کے ساتھ بھارتیہ ناتیم میں مصروف رہتی تھیں۔

اکثریت ان لڑکیوں کی تھی جو انقلاب سے پہلے پردہ کرتی تھیں۔ لیکن اب جذبۂ قومی کی شدت سے مجبور ہو کر مردوں کے ساتھ میدان عمل میں دوش بدوش کام کرنے کے سلسلے میں مخلوط کالجوں کے لیڈیز روم میں بیٹھ کر فلمی گانے گنگناتی تھیں۔ کامریڈز تقریباً ناپید تھیں کیونکہ فضا اس کے لئے سازگار نہ تھی۔ اشتراکیت

کی دھن اور اس کا ماحول افسوس کہ وطن مرحوم کی یونیورسٹیوں ہی میں رہ گیا۔ یہاں پر ملت اقبال اور ذوق جہاد زیادہ طاری تھا۔ یہ لڑکیاں اپنا زیادہ وقت غرارے سلوانے اور کپڑوں کے متعلق تبادلۂ خیال میں گذارتی تھیں۔ چند ایک نے سوئمنگ سیکھنے کے ارادے سے ون پیس سوٹ بھی تیار کرا لئے تھے۔

نوجوانوں کے لئے تین کیریر کھلے تھے۔ انتظامی اور فارن سروس۔ اور دفاع لڑکیوں کے لئے بھی مستقبل کے سلسلے میں یہی میدان زیادہ دل کش نظر آتے تھے۔ بہت سے نوجوان مختلف اقسام کی ٹریننگ کے لئے سمندر پار گئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق قوی خدشہ تھا کہ وہاں سے بیویاں لے آئیں گے۔ جو لڑکیاں تعلیم کے سلسلے میں باہر گئی ہوئی تھیں ان کے متعلق اب تک کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ شاید وہ بھی باہر سے شوہر ہمراہ لے آئیں۔ گو یہ بھی ممکنات میں داخل ہو سکتا ہے۔

غرضیکہ قصہ مختصر، سمندر کو چائے کی پیالی میں بند کرتی ہوں۔ انقلاب کے بعد یہ صورت حالات تھی۔ تو اے صاحبو۔ میں اب آپ کو اپنی داستان غم کیا سناؤں۔ جگ بیتی سے آپ بیتی کی طرف آتی ہوں۔ قصہ اس فدوی کنیز ناچیز کا ہے کہ اس انقلاب قیامت ہمرکاب میں یہ خاکسار بھی حتی المقدور خدمت ملک وقوم کی بجا لائی۔ فکر وغم سے اس درجہ پریشان تھی کہ راتیں آنکھوں میں کٹتی تھیں۔ دن رات ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر شرنارتھیوں کا 'پھر بساؤ' کام کیا۔ وہ بلبل ہزار داستان، ہماری گورنر نی واہ واہ کیا جنتی بیوی تھی۔ اس نے فدوی سے کہا کہ بٹیا جی توڑ کر کام کرو۔ اور اس ناچیز نے یہی کیا۔ لیکن تا بکے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

ایک روز اس خاکسار کو بھی بصد رنج و بچشم ۔۔۔۔۔ اس دیش کو چلا آنا پڑا۔ اسی ملک و قوم کے غم میں مبتلا ہو کر فدوی نے ایک بولتا ناچتا گاتا ناول۔ زمین کی حور عرف فولادی مُکہ عرف نقاب پوش ڈاکو تالیف کیا۔ جس پر اس کمترین پر حسب معمول بہت لے دے مچی۔ اور برصغیر کے سارے بڑے اور چھوٹے 'انٹلکچوئیلوں اور انٹلکچوئیوں' نے حسب توفیق ڈانٹ پلائی کہ اے :مومنہ غیرت ہو تو فی الفور ڈوب مرو۔ اس مجبور و معذور نے فوراً مصمم ارادہ ڈوب مرنے کا کیا۔

اے پڑھنے والو اگر تم اداس ہو تو افسوس کہ میں کسی طرح بھی تمہیں بشاش نہیں کر سکتی پانی کے کنارے پر اندھیرا بہت نیچے اتر آیا ہے اور باغ کا یہ دیوانہ سبزہ ڈھلوان پر پہنچ کر رات کے انتظار میں یک لخت ٹھٹھک گیا ہے۔ جہاں دیوار ہے۔

وہ انسان پانی کے کنارے تنہا بیٹھا ہے۔ جس طبقے میں یہ پیدا ہوا اس کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک راستہ سول سروس یا آرمی کا جگمگاتا کیریر ولایت سے واپسی پر ایک شپک لڑکی سے شادی اور وہی بے معنی زندگی جو یہ سب ہم سب بسر کرتے چلے آئے ہیں۔ دوسرا راستہ اس زندگی سے بغاوت تھی۔ اس بغاوت کے لئے ہمت چاہئے اور بنے بھائی کی طرح ہر ایک ہمت والا نہیں بن سکتا۔ یہ اداس ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے بے حد شاندار، بے حد بے معنی ماضی کو یاد کر رہا ہے۔ وہ دونوں راستوں میں سے ایک راستہ بھی اختیار نہ کر سکا۔ اور اب کسی طرف سے مطمئن نہیں۔

اور گھر پہ مجھے سکھایا گیا تھا کہ عصرانے پر اس طرح چائے بنا کر مہمانوں کو پیش کروں ٹماٹر کا عرق اس طرح تیار کروں۔ مہمانوں سے مستقل محض ان کی دلچسپی کی

باتیں کروں۔ اور چہرے پر مصنوعی شیریں مسکراہٹ برابر قائم رکھوں۔ اور معزز لیڈی بوکس والا سے پوچھو کہ اب ان کا زکام کیسا ہے۔ اور معزز کموڈور سنگھ سے یہ امید ظاہر کروں کہ کینیڈا میں ان کو اپنا نیا تقرر یقیناً بہت پسند آیا ہوگا۔

اور شفق کے اجالے میں وہ سب چٹان پر ایک قطار میں بیٹھے ہیں۔ اور وطن مرحوم میں ان دنوں کھیتوں کی نرائی کی جارہی ہوگی۔

بابل یہاں سے کتنی دور ہے۔ کیا ہم موم بتیوں کی روشنی میں وہاں تک پہنچ جائیں گے یہ ایک نرسری کا گیت ہے۔ جو مجھے اس وقت یاد آیا۔ یہ چاند کی پہلی تاریخیں ہیں۔ اور چھت کے کنگوروں پر گذرے وقتوں کے بھوت ٹہلتے ہیں۔ اور ادھر وہ نیم روشن سرد ہال ہیں جہاں وہ وسپسٹر کے ڈراموں کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ میرے عزیزو اس انسان کو جو میرے پرکھوں کے گھر میں پیدا ہوا۔ پانی کے کنارے بیٹھا چھوڑ کر اس طرف آؤ۔ جہاں میں نے تمہارے لئے ایک سفید سیڑھی چھپا رکھی ہے۔ جسے لے کر ہم اسٹرابری کی تلاش میں چلیں گے۔ جیسے بچپن میں جایا کرتے تھے۔ تم لوگ کیا میرے اس گرو کو بھول گئے جو آم کی ڈالیوں کے نیچے ٹھنڈی سیتل پائیوں پر بیٹھا ویدانت فلسفے اور کانٹ کے نظریوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ دیکھو۔ وقت خامشی سے اپنے آپ کو ابدیت میں دھکیلتا جا رہا ہے۔ اور مستقبل کے گن مین تاریک نکڑوں پر کھڑے ہیں۔ ساعتیں چاروں اور تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ اور دنیا اپنے وجود کے چکر سے باہر نکلتی جا رہی ہے۔ لیکن کیا ہم اسی جگہ کھڑے رہیں گے؟

فضا میں توپیں گرج رہی ہیں۔ اور ہوا میں طیاروں کی فلیٹ جگمگا رہی ہے۔

ریت پر بچھے ہوئے قالین اور صوفے جن پر بیٹھی ہوئی معزز خوبصورت خواتین گوگلز لگائے سرخ اور نیلی ساریاں پہنے پروگرام کے کاغذوں سے آنکھوں پر سایہ کئے سامنے کے منظر کو کاہلی سے دیکھتی ہیں۔ان کے پیچھے بہت فاصلے پر بہت بڑا ہجوم ریلنگ پر اُمڈا کھڑا ہے۔ان سے کہو پیچھے ہٹ جائیں۔یہ بے حد مخصوص مجمع ہے۔ان لوگوں کو یہاں کس نے گھسنے دیا عام پبلک تمیز کے ساتھ اپنی اوقات پہچانتے ہوئے سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہونے پر کیوں اکتفا نہیں کرتی۔ان کو ہٹاؤ۔میں نے قرطاجنہ اور ایتھنز اور بابل اور اسکندریہ میں بھی یہی مناظر دیکھے ہیں (ان کو ہٹاؤ) اور توپیں سامنے سے آ رہی ہیں۔ٹینک، شرمین ٹینک۔تھری چیرز۔تھری چیرز۔اب وہ آ رہے ہیں۔آگے پائیلٹ آتا ہے۔اور کھلی کیڈیلیک پر سرکار عالی بیٹھے ہیں۔اور ان کا ملٹری سیکرٹری اور تین بدشکل جنرل۔ اور پانی تیزی سے بہہ رہا ہے۔اور ہوا سرسرا رہی ہے۔اور ہم ریت پر کھڑے ہیں۔تھری چیرز۔تھری چیرز۔

چھوٹی پتیوں والی سیاہی مائل سوئس گھاس پر سے ہوا روتی ہوئی گذر رہی ہے چیپل کا دروازہ کھل گیا ہے۔اور سیڑھیوں پر پیپل کے پودے اگ آئے ہیں۔اس قربان گاہ کے سامنے پیاری ڈورکس کی شادی والٹر سے ہوئی تھی، جو آئی پی میں تھا اور اب ہوم واپس گیا۔عرشے پر سفید روغن والی ڈیک چیرز رکھی ہیں۔نورما ڈارلنگ اور جنجر پیو اور دھوپ میں آ جاؤ۔

تھری چیرز۔تھری چیرز۔

میں دھوپ میں بیٹھ کر کینوس تیار کرتی تھی اور TAUBES کے نئے نظریوں

کا مطالعہ کرتی تھی۔ ہالڈر میرا گرو تھا۔

میرے چچا میاں نے مجھ سے کہا۔ میری بہت پیاری بٹیا۔ میرے ہمراہ نیویارک چلا کرو۔ اور وہاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کوئی ہلکا پھلکا کام کرو۔ سیکرٹری جنرلسٹ۔ مترجم۔ میں روتی رہی۔ کیونکہ طہران میں میں نے صرف قہوہ بنانے کا فن سیکھا تھا۔ اور اپنے پورب کے قصبے میں میں برسات کے پکوان تیار کرتی تھی، اور اب کینوس دھو رہی ہوں اور میرے چچا میاں نے یو۔ این۔ او میں ولایتی چوہوں کی غذا میں اصلاح اور ریسرچ کے لئے پندرہ سب کمیٹیاں بنائی ہیں۔ اور ہر سب کمیٹی ہر سیشن کی میٹنگ میں پندرہ ہزار الفاظ کی رپورٹ تیار کرتی ہے۔

کھانے کے دوران میں لیپ لینڈ کے سفیر نے بتایا کہ ان کے ملک کے باشندوں کو ہم سے کس قدر گہری محبت ہے۔ دن رات ہمارا ذکر ہی وہاں ہوا کرتا ہے۔ ہماری قومی تحریکوں کو وہاں کے رین دیر تک بے حد ہمدردی اور دلچسپی کی نگاہ کے ساتھ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ کلچرل تعلقات قائم کرنے کے بعد تو قوی امید ہے کہ یہ الفت دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ یو۔ این۔ او کی چوہوں کی غذا کی اصلاح کی سب کمیٹی کا آئندہ اجلاس لیپ لینڈ میں ہوگا۔

اور ایک لنگڑی بھیڑ آہستہ آہستہ مقدس شہر کی طرف بڑھ رہی ہے تاکہ وہاں پہنچ کر دوبارہ جنم لے۔

میں تابلستان کے سفارت خانے کا ناظم امور ہوں۔ کرنل فلفوز۔ اور گو ہمارے

تعلقات سیاسی نقطۂ نظر سے فی الحال سخت ناخوشگوار ہیں اور انشاء اللہ ایسے ہی رہیں گے اور جایئے آپ جہنم میں۔ لیکن ماموزیل اس وقت تو آپ سفارتی نقطۂ نظر سے اس شترمرغ کے پلاؤ کو نوش کیجئے جو ہمارے قدیم ملک کی پانچ ہزار سالہ تہذیب کا شاہکار ہے۔ تابلستان شاردافیز کرنل فلفوز اس کیرل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو اس نے سوئٹزرلینڈ کے اسکول میں سنا تھا۔ بیت لحم کے چرواہوں کا نغمہ اور تین بادشاہوں کا گیت۔ جو مقدس پیدائش کی خبر سن کر مشرق سے بیت المقدس کی طرف آئے تھے۔

تین بادشاہوں کا گیت

جب ہم وطن سے چلے تو مشرق کا ستارہ آگے آگے ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔ موسم اچھا نہیں تھا۔ اور ولنگڈن ایرپورٹ کے پری وٹو افسر بے حد غیر مہذب تھے لیکن ہم بور نہیں ہوئے اور صحرا، اور دریا اور پہاڑ عبور کرتے روانہ ہوئے۔ فضائی میزبان لڑکی اتنی خوبصورت نہ تھی۔ کہ اس کو اب تک یاد رکھا جاتا۔ اور کوکو جو اس نے پلائی وہ ٹھنڈی تھی گھنٹیاں بجاتے اور ریڈرز ڈائجسٹ پڑھتے ہم اپنی منزل کی طرف بڑھے۔ فضائی میزبان لڑکی نے ہمیں لائف اور لک کے علاوہ OUR TIMES بھی پڑھنے کو دیا (گو یہ دوسری بات ہے کہ اوڈن کی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ اور گرٹرڈ اسٹین کے متعلق بھی میری اپنی رائے ہے جسے میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں) وفور عقیدت اور جلال خدا دی کے نور سے معمور ہم مقدس شہر پر اترے۔ اس روز وہاں نئے جنم کی خوشی کا عظیم الشان جشن تھا ہم مقدس ہیکل تک نہیں پہنچ سکے۔ اور ہمیں بلوچ میس میں ٹھہرا دیا گیا جو وہاں کا سرکاری مہمان خانہ تھا۔ اگر آپ خدائے قدوس سے انٹرویو چاہتے ہیں تو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ کو فون کیجئے۔ ایک اے ڈی سی کے رفیق کار نے ہم سے فون پر کہا۔

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں جشن ہو رہا تھا۔ لیکن زندگی نہ تھی۔ وہاں پر صرف قبریں تھیں۔ مرمریں مقبرے کچے مزار بے نشان مٹ کے ڈھیر۔ وہاں

پیدائش نہیں تھی۔موت بھی نہیں تھی۔محض جانکنی تھی۔محض عالم نزع۔ہم سردی میں باہر لان پر بیٹھے خوشی کے مارے گھنٹیاں بجاتے رہے۔جس کی وجہ سے ہم تینوں کو انفلوئنز اہو گیا۔

فیروی ویل مائی فیری مے ..... میں سوزی اینا سے ملنے لوزانیا جا رہا ہوں .....

راہ میں مجھے ایک حبشی ملا۔اور میں اسے گھوڑا سمجھ کر اس پر سوار ہو گیا۔

(امریکن لوگ گیت)

سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن ویٹس دی وے ٹو لنڈن ٹاؤن۔تم لوگ نہج البلاغہ کیوں نہیں پڑھتے ؟

مجھے تھوڑا سا زکام ہو گیا ہے خانم فہیمی اس لئے میں آپ کے پیارے ہینڈسم شہنشاہ کی سالگرہ کے عصرانے میں نہ آ سکوں گی۔آقائے فہیمی سے میری طرف سے معذرت کر دیجئے گا۔

نخے۔نخے۔

بلے۔بلے۔

پل پر زرد کہرہ مڈلا رہا ہے اور انسانوں کی تاریک قطاریں اس پر سے گذر رہی ہیں۔ہائے چوہے۔ارے کتنے بہت سے چوہے۔اور ہم مر چکے ہیں۔اور دروازہ پھر بند ہو جاتا ہے۔

آدھی بیچ ایکلے۔آدھی بیچ ایکلے

سب دروازے بند رہے اور نکل گیا سوار رے

دھیرے گاڑی ہانک رے۔بھیا گاڑی بانا ..... دھیرے .....

آدھی بیچ ایکلے۔

کنارے پر پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ مجھے یہاں گھاس پر بیٹھ کر رونے دو۔ بوٹ ہاؤس کے پیچھے کیسی تاریکی ہے۔ تاریکی۔ تاریکی۔ کسی چیز کا کسی سے کوئی تعلق کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ اس قرمزی روشنی میں تمہارے ساتھ کون ہے؟ میں اسے نہیں پہچان سکتی۔ سب نے سفید لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ اور ہوا سمندروں پر پھیل رہی ہے۔ اور سرسرا رہی ہے۔ تابلستان کا شاردافیرز ڈنر سے واپس آنے کے بعد مادام استووسکی کو فون پر شب بخیر کہہ کر سو گیا ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔ میرے عزیزو۔

سو جاؤ۔ اور مشرق کے ان تین بوڑھے بادشاہوں کو بھول جاؤ۔ جو ٹھنڈی گھاس پر اداس بیٹھے پیدائش کی خوشی کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں۔

یہی وہ سرزمین ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے۔ جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ اپنا بہت لمبا سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ اور روجن اپنے باغ میں بیٹھی ہے، جہاں پر محبت کا کا تمہ ہے۔ ہم یہیں رہیں گے اور خدائے قدوس کی تکریم میں مصروف رہیں گے۔

کیا ہم واپس چلے جائیں؟

جہاں پھول کھلتے ہیں

خلیج بنگال کے ان دور افتادہ، ہرے جزیروں میں جب ہم ناریل کے بلند درختوں کے نیچے ریت کے قلعے بناتے تھے، یا جب ہم کیپسین کے ساحلوں پر رنگین چھتریوں کے سائے میں بیٹھے تھے۔ یا جب ہم گنگا کی عظیم لہروں پر سفید کیبن اور نیلے پردوں والے اسٹیمروں میں گھومتے تھے۔ ان عجیب دور افتادہ پراسرار زمانوں سے لے کر اب تلک، ان بائیس سالوں کی ریتوں پر چلتے ہوئے میں وقت کے اس کنارے پر آئی ہوں جہاں صرف اپریل کی رات کی اتھاہ، کھلتی، ابھتی خوشبو ہے، اور رات کے لمحے سرسراتے ہوئے میرے اوپر سے گذرتے جا رہے ہیں۔

ان سرسراتے لمحات سے میں نے پوچھا۔ اپریل کی اس رات کے لمحو، تم اس طرح تیرتے ہوئے کس طرف جاؤ گے۔ اور آگے، اور آگے۔ وقت کی اس سیال برستی ہوئی تاریکی میں بہتے بہتے تم کتنی دور تلک پھیلو گے۔ اور کہاں پہنچ کر معدوم ہو گے۔ سمے کی اتھاہ گھمبیر خاموشی کی موجوں پر ڈولتے ہوئے ان لمحات کو میں نے چپکے سے بتایا۔ میں نے بتایا کہ میں نے تمہیں پہچانا ہے اور فرشتوں سے دعا مانگی ہے کہ کائنات پر اداسی پھیلائے بغیر تم یونہی سرسراتے، بہتے، آگے چلے جاؤ۔ اور دعائے شب کے بعد مجھے نیند آ جاتی ہے یہاں تک کہ تم صبح کاذب کی چپ چاپ سنگیت میں تحلیل ہو جاتے ہو۔ صبح کاذب کی وہ اتم سنگیت جو پو پھٹتے سمے کی

درماندگی کی اونچی لہروں پر منڈلاتی ہے۔

اپریل کی رات کے ٹھنڈے لمحو، تم مستقبل کے برسوں کی طویل، لڑکھڑاتی قطاروں تلک پہنچ کر کہاں چلے جاؤ گے۔ آج کی رات میں نے سارے پچھلے زمانوں کو جمع کر کے ایک طرف رکھ دیا ہے۔ اور میں پیچھے کی اور دیکھ رہی ہوں۔ زرد پہاڑی گلاب کی مہک نویں سمفنی کے سر۔ بارش میں بھیگے، بل کھاتے، نیلگوں اور سبز کوہستانی راستے جن پر سے اسکول کی بچیاں کرسمس کے گیت گاتی گزرا کرتی تھیں، نیو لک کی ملبوسات۔ ان سب کو اکٹھا کر کے میں نے ایک طرف کو رکھ دیا ہے تا کہ تم اسی طرح سے چپ چاپ پرواز کرتے رہو اور کوئی چیز تمہاری راہ میں مخل نہ ہو۔

سیاہ موجیں آگے بڑھتی ہیں۔ پیچھے ہٹتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ ایک ریلے کے بعد دوسرا ریلا، اور سکوت کے لرزاں ستونوں کی قطاریں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی آگے روانہ ہو جاتی ہیں اور منجمد یکسانیت کائنات کے زرد، چاروں اور پھیلے ہوئے میدانوں کے اوپر جھکی، روتی اور چلاتی رہتی ہے۔ اور کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سب چیزوں کا انجام بہت خوشگوار ہو گا۔ اور ہم سب یقیناً زندہ رہ پائیں گے۔ اپریل کی رات کے ان لمحات کے نیچے۔ میں نے اپنے باپ سے کہا۔ میرے بہت پیارے ابا میاں۔ وجود کی اس شدت کو تم نے محسوس کیا تھا۔

ہاں، وہ میرا باپ تھا، جو گیارہ اپریل کی اس رات کو ختم ہوا۔ آدھی رات کے ٹھنڈے، نرم، اطلسی لمحو، یونہی خاموشی سے سیال تاریکی میں گھلتے میرے اوپر سے گذرتے رہو۔ کیونکہ میں تمہیں چپکے سے یہی بتانا چاہتی تھی، کہ آج کی رات ابا

میاں چلے گئے تھے انہیں زرد پہاڑی گلاب کی مہک پسند تھی۔ اور نویں سمفنی کے سروں کی لہریں بھی۔ اور جب وہ چپ چاپ، تھک اور اکتا کے آرام سے اپنی مسہری پر سو گئے تو بہت سے لوگ آئے۔ اور انہیں ان کی خواب گاہ میں سے اٹھا کر اس برساتی میں لے گئے۔ جس کا راستہ پچھلے باغ کی طرف جاتا تھا۔ جہاں ہولی ہوکس کے اونچے ڈنٹھل پھولوں کے بوجھ سے جھک آئے تھے۔ کیونکہ وہ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور برساتی میں سے وہ انہیں گومتی کے کنارے کنارے اس جگہ لے گئے جہاں پرانے بادشاہوں کے اچھے زمانوں میں عظیم الشان میلے لگا کرتے تھے۔ وہ جگہ عیش باغ کہلاتی تھی۔ اور وہاں پرانے، بھورے شکستہ، دہشتناک امام باڑوں اور پراسرار اندھیری مسجدوں کے لرزہ خیز میناروں کے سائے میں چنبیلی کی جھاڑیوں کے پیچھے وہ لوگ انہیں چھپا آئے۔ اپریل کی اس ٹھنڈی خوشگوار رات، اور خوشگوار صبح یہ سب ہوا تھا۔ جبکہ باغ میں ہولی ہوکس کے پھول کھل رہے تھے۔

زندگی کی شدت، زندگی کا حسن، اسے اس انسان نے محسوس کیا اور پہچانا۔ جو میرا باپ تھا۔ اور وہ انسان چنبیلی کی جھاڑیوں اور خوشبودار جنگلی پودوں میں چھپ گیا۔ میں نے چپکے سے کہنا چاہا۔ چنانچہ ابا میاں، تمہاری الف لیلیٰ کی کہانی بھی ختم ہوئی اور تم اودھ کی زمین، اس کے کندن رنگ کی خوشبودار، قدیم مٹی میں واپس پہنچ گئے۔ اودھ کا ڈوبتا ہوا سرخ آفتاب، موتیا کی جھاڑیاں، گومتی پر سے آتی ہوئی ہوائیں، یہ سب تمہاری ہیں۔ تم قیامت تک وہیں رہو گے۔ تم خوش قسمت تھے ابا میاں۔ جو تم نے یہ زمانہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا۔ تم یہ سب دیکھ کر یقیناً دل شکستہ ہو جاتے (تاریخ کے دھارے جب پلٹتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بین الاقوامی

امور کے جگمگاتے ادارے میں ایک غیر ملکی سفیر مونوکل لگائے زور زور سے کہہ رہا تھا۔ تاریخ کے دھارے..... تاریخ کے..... گھوں گھوں کرتے طوفان گرجے اور آواز بازگشت فضا میں پھیلتی گئی) اور ابا میاں، تمہارا سارا کتب خانہ اور اس کی فرانسیسی اور ترکی کتابیں اور رسالوں کے وہ پلندے جو تمہارے پاس پیرس انقرہ اور استنبول سے آتے تھے۔ یہ سب اس سفیر اور اس جیسے دوسرے سفیروں کی بنائی ہوئی تاریخ کے دھارے کی زد میں آ گیا اور تمہارے سارے محبوب شاعر، اور پسندیدہ فلسفی اور محترم پیغمبر جنہوں نے دنیا کو بچانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی، سب کے سب اس دھارے میں بے چارے بہہ گئے۔ اور ہمارے باغ کے پچھواڑے، شہتوت اور انجیر کے جھنڈ میں وہ آدمی بیگ پائپ بجا رہا تھا جو برسوں سے اسی طرح روزانہ صبح سویرے پرانی اسکاچ دھنیں بجاتا ادھر سے گذرتا تھا اور امرودوں کے برے جھرمٹ کے پرے پولیس لائنز میں یونین جیک بلند کرتے وقت جو بگل بجایا جاتا تھا اور شام کے اندھیرے میں ری ٹریٹ کے وقت جو بگل بجتا تھا (جس کی آواز پر دل ڈوبتا تھا اور گھاس پر شبنم کے قطرے پھیل جاتے تھے) اس صبح وہ بگل بھی اسی طرح بجا تھا۔ اور ہولی ہوکس اور گل عباس کی کیاریوں پر سے ہوا بھی اپنی مہک بکھیرتی گزری تھی۔ یہ سب اس صبح بھی ہوا تھا۔ جب ابا میاں تم نے منہ اندھیرے ہی عیش باغ کا رخ کیا۔

آنگن میں کچے مہوے کے سائے اور آم کے بور کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جو بہار کی آمد کا پیغام لاتی ہے، اور ٹھنڈے، فرحت بخش راستوں کے کنارے کنارے جامن کے درخت ہیں۔ اور ارہر کے کھیت ہیں۔ اور تھوڑے تھوڑے

فاصلے پر آموں کے جھرمٹوں میں سے کوئی شکستہ گموں والی خانقاہ یا پرانی حویلیوں کے بچے کھچے ستون یا محرابیں، یا کوئی ایک اکیلا گنبد نظر آ جاتا ہے۔ جس پر بھورے رنگ کی گھاس یا اکاس بیل پھیلی ہے اور سرسبز سنگھاڑوں اور پیلے کنولوں والی جھیلیں ہیں جن کے کنارے ہم ٹھہر کر سستا لیتے ہیں اور پھر برابر کے ہرے کھیتوں میں دوڑتی ہوئی چھوٹی لائن کی ٹرین کے ساتھ کوش دلی سے ریس کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے بازار آتے ہیں اور چوپالوں اور پنچایت گھروں کے کچے چبوترے اور قصبوں کے رنگین دیواروں والے مکان اور سرخ اینٹ کی حویلیاں جن کے پھاٹکوں اور محرابوں پر دو مچھلیاں آمنے سامنے بنی ہوتی ہیں۔ یہ بچاری نیک شگون کی مظہر مچھلیاں جو ہمارے اس دیش کا قدیم نشان تھیں اور ٹھنڈے کچے آنگنوں والے زمینداروں کے گھر، یہ سب اپنا ہے۔ اور بسنتی اور سرخ چنریاں اوڑھے اور رنگ برنگے لہنگے اور ساریاں پہنے اور چٹا پٹی کی گوٹ والے پائجاموں کے بڑے پائنچے اوپر سے کواڑ سے، بارش کی پھواروں سے بچتی، لڑکیاں ان باغوں میں جھولے کی پینگیں بڑھاتی ہیں۔ دیس کی لڑکیاں، جن کی گنگا اور جمنا کے پانیوں میں نکھری ہوئی شیریں اور شستہ زبان سننے والوں کے کانوں میں راگنیاں بکھیرتی ہے۔ اور یہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ آسمان بدل گیا ہے، زمین بھی بدل چکی ہے۔ وہ سب ہمارا نہیں ہے۔ وہ سب اب دوسروں کا ہو چکا ہے۔ اغیار کا۔ اغیار..... وہ پہلے بھی ہمارے اپنے تھے اور ہم میں سے تھے۔

اور ہمارے احاطے کے یوکلپٹس کے سائیں سائیں کرتے جھنڈ کے سرے پر سیمل کا وہ اونچا درخت حسب عادت چپ چاپ اور تنہا کھڑا تھا۔ جس کے

پھولوں کی روئی ہوا کے ساتھ سارے میں اڑتی پھرتی تھی۔ اس درخت کی ایک اونچی سی اور موٹی جڑ پر بیٹھ کر میں نے طویل دوپہروں میں امتحان کے لئے ایک مرتبہ کیٹس پر تنقید کی پندرہ کتابیں ختم کی تھیں کیٹس جس نے زندگی کو مر کے محسوس کیا اور سیمل کے سرخ پھول آگ کی طرح گرتے تھے۔ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی خوبصورت ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور سوچا۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ سب کیوں ہوا۔ پھر میں نے چپکے سے اپنے ابا میاں سے پوچھنا چاہا میرے بہت پیارے ابا میاں۔ تم جانتے ہو۔ یہ سب کیوں ہوا۔ تم ضرور جانتے ہو گے ابا میاں کہ ایسا کس لئے ہوا۔ کہ خداوند کے اتنے ان گنت بیچارے انسان یوں دکھی ہو جائیں کیا واقعی ہم اتنے برے ہیں؟ اور ان دکھوں اور سزاؤں اور امتحانوں کے مستحق ہیں؟ لیکن ابا میاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی آگے جا چکے تھے۔

اور سبزے پر حد نظر تک بھیگی ہوئی خودرو جھاڑیاں پھیلی ہیں۔ پیچھے غسل خانوں کی نالیوں والی نم زمین پر جولائی اگ رہی ہے اور باغ کے بڑے نالے کی پلیا کے پرے بھورے سؤر پھر رہے ہیں اور سرجو کے ٹھنڈے ساحلوں پر مور جھنکار رہے ہیں۔ باہر خنک اور سبز گھاس پر وہ سب بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم یقیناً ہو گی۔ فالسے کے جھنڈ کے پار، سڑک کے دوسری طرف، ضلع کے کلب میں بڑی گہما گہمی ہے۔ موٹریں جلدی جلدی آ جا رہی ہیں۔ ٹینس کورٹ، اور بلیرڈ روم اور بار اور بال روم خالی ہو چکے ہیں۔ اور سب ہال میں وائرلیس سیٹ کے قریب بیٹھے ہیں۔ کیونکہ یہ سن انتالیس کی تیسری ستمبر کی شام ہے۔ جنگ عظیم

.....؟؟فوہ.....ابا میاں نے شطرنج کھیلتے میں رخ کی شہ بچتے ہوئے کہا۔کیا بیکار میں لڑائی شروع ہوگئی۔اب اس خزاں میں ہم ولایت نہیں جا سکتے۔ابا میاں تم کتنے خودغرض ہووااللہ۔اس ایک سال نہ جاؤ گے تو کیا قیامت آ جائے گی۔دنیا پر تو اتنی تباہی آ گئی..... میں نے بگڑ کر کہا۔تباہی.....؟ انہوں نے پوچھا۔تمہاری اس خوبصورت دنیا پر امن کب آیا تھا اور کس نے آنے دیا تھا.....؟ اتنی انسانیت پرست بنتی ہو بٹیا۔

آج سے دس سال بعد مجھے بتانا کہ تم اتنی زبردست آئیڈیلسٹ ہو یا نہیں۔خدا کرے تم اتنی ہی انسانیت پرست رہ سکو۔

دس سال وہ اس ردعمل کا نتیجہ سننے کے لئے موجود نہیں۔وہ چنبیلی اور موتیا کے جھنڈ کے پیچھے جا چکے ہیں۔جہاں مری ہوئی صدیوں کے سائے لرزتے ہیں۔

موربڈ لڑکی..... اماں جاؤ بھی کیا باتیں کرتی ہو۔میں تو قطعی موربڈ نہیں ہوں۔میں نے راحیل سے ڈپٹ کر کہا۔جبکہ نیچے ٹیرلیس پر لوگ سمبا ناچ رہے تھے۔سنا ہے سمبا شہزادی مارگریٹ کا پسندیدہ رقص ہے۔ارے واہ ری شہزادی مارگریٹ۔

ہمارے سامنے جو راستہ پھیلا ہے (یہ سڑک ہاکس بے کو جاتی ہے) اس پر صرف گدھ اترتے ہیں اور دبلی پتلی فاقہ زدہ بھیڑیں کنارے پر اگی ہوئی خشک صحرائی جھاڑیوں پر بے چارگی سے منہ مارتی جاتی ہیں اور ہوا میں صرف دھول اڑتی رہتی ہے۔ایک بگولہ تیزی سے چکر کاٹتا پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا (کوئی چڑیل کہیں اپنے سفر پر جا رہی ہے)۔

ارے امن کہاں کھو گیا۔ لمحات کا یہ تسلسل۔ ابا میاں! تم کتنی دور دراز کی سیاحت پر جا چکے ہو کہ اب واپس نہیں آ پاتے۔ یہ میرا باپ ہے؟ جو سب کچھ سمجھتا اور جانتا ہے۔ جو اتنا حلیم، اتنا شریف النفس اتنا عظیم ہے جس کی طرح کا دوسرا انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جس نے زندگی اچھی گزاری اور دوسروں کو اچھی زندگی گزارنے میں مدد کی۔ جس کی وجہ سے لوگ خوش ہوئے جس نے دوسروں پر چپکے چپکے عظیم ترین احسان کیے۔ لیکن کبھی ان پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان اچھائیوں کا ذمہ دار وہ ہے۔ اور جس نے کبھی خواہش اور پروانہ کی اس کے احسانوں کے لئے شکر گذار ہوا جائے۔ میرا باپ۔ جس کے چاندی کے تاروں ایسے سلور گرے بال تھے۔ اور جو ٹیل کوٹ پہن کر جہاز کے عرشے پر چھوٹے چھوٹے متفکر سے قدم رکھتا ہوا ٹہلتا تھا تو ساری کائنات متبسم اور مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ جس کا وجود فرشتوں کی طرح بے ضرر اور معصوم تھا۔ اور بہت سارے پھولوں کے زمانے، برفانی جاڑے اور شگفتہ برساتیں گذارنے کے بعد ایک موسم گل میں وہ چلا گیا۔ جبکہ باغ میں ہولی ہوکس کھل رہے تھے۔

وقت کے اس صحرائے اعظم کی پھسلتی ہوئی ریت پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی میں یہاں تلک پہنچی ہوں اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے۔ اس زندگی میں بہت کم آنسو تھے۔ بہت ساری خوشیاں۔ پھولوں کے موسم۔ سرجو کی اور رام گنگا کی لہروں کی روانی۔ اور برفانی دسمبر کی نرم اور گرم دھوپ۔ لیکن ایسا کس طرح ہے کہ ہم اپنے اپنے لئے جو چھوٹے چھوٹے شیشے کے گھر بنا کر محفوظ ہو بیٹھے ہیں۔ ان میں سے نکل کر ہم آگے نہیں دیکھ پاتے۔ پھر موت آتی ہے اور سب کچھ ختم ہو جاتا

ہے۔

برسوں، صدیوں کے سفر کے بعد وہ اس جگہ پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں مجھے بھی جانا ہے میں یقیناً ان کے پاس واپس جاؤں گی۔ کیونکہ وہ مجھ سے بے حد خوش تھے۔ اور انٹ سمے تک خوش رہے۔ چھٹیوں کی صبح کو، اپنی آرام کرسی پر نیم دراز، اخبار پڑھتے ہوئے وہ اپنے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے۔ اور صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا، اور آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پر رجہاں، رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے۔ اور اخبار پڑھتے پڑھتے اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں سے وہ پکارتے۔ بٹیا یہاں آؤ۔ اور مجھے یہ پڑھ کر سناؤ کہ اس مرتبہ ایلیٹ نے کیا لکھا ہے..... ایک باپ بیٹی کی یہ کیسی مکمل دنیا تھی۔

اپریل کی اس رات کے لمحو۔ تم یونہی سرسراتے ہوئے آگے نکل جاؤ گے۔ لیکن چاروں اور کیسے گھٹیا لوگ ہیں۔ کیسے گھٹیا دماغ ہیں۔ اور کتنی گھٹیا باتیں ہیں۔ اعلیٰ درجے کے انسان۔ اعلیٰ درجے کے ذہن۔ اعلیٰ درجے کے معیار اور اقدار۔ یہ سب کہاں گئے۔ کیا ہمیں اپنے آس پاس کے ان گنت انسانوں میں سے ایک بھی ایسا نظر آتا ہے جسے ہم صحیح معنوں میں بڑھیا انسان کہہ سکیں۔ آؤ ہم ایک آیوی کا برج تلاش کریں اور اس میں جا بیٹھیں اور تصویریں بنایا کریں۔ کیا یہ دنیا کسی اور بات کے قابل نہیں؟ یہاں کی سڑکوں پر صرف تازہ ترین موڈل کی کاریں ملتی ہیں۔ اور غیر ملکی وفدوں کے خیر مقدم کے لئے طیارہ گاہوں کو جایا جاتا ہے۔ اور ایٹ ہوم ہوتے ہیں اور لوگ سمبا ناچتے ہیں۔ اور زیادہ ایٹ ہوم۔ اور زیادہ

پریس کانفرنسیں ۔اور زیادہ سمبا اور رمبا۔اس کے علاوہ یہاں پر اور کچھ نہیں ہے ۔
ہمارے اس نظام حیات کی یہ گاڑی اس طرح کب تلک چلے گی؟

یہ خوفناک ڈرامہ.....تم تو صرف یہی کہتے ہو میرے بھائی جو یونانی تمثیل کا مطالعہ کرتے ہو،لیکن زندگی یونانی ڈرامے کے اس جیومیٹری کی طرح کے پیٹرن اور اس فارمولے سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ یونانی ٹریجڈی سرد ہوتی ہے۔زندگی ٹریجڈی نہیں۔زندگی موت ہے۔جو ہر وقت آتی رہتی ہے۔اور نہیں آتی اور جب آجاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ اگر نہ آتی تو کیا حرج تھا۔

زندگی کا سب سے بڑا غم،عظیم ترین صدمہ مجھے پہنچ چکا ہے کہ ابا میاں تم ایک روز ایسے اچانک چلے گئے اور تمہیں گئے ہوئے آج چھ سال گزر گئے اور اسی طرح گذرتے چلے جا رہے ہیں۔اور بہت ساری دنیا تم کو بھولتی جا رہی ہے۔وہ سارے لوگ جن کو تم پسند تھے۔جو تمہیں پسند تھے۔

ابا میاں تم نے ایک بار خانۂ خدا کے قریب،صحرائے عرب کے خاک آلود،گرم پتھروں پر بیٹھ کر ''کعبے کے سامنے'' ایک نظم لکھی تھی۔

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا
اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں
احرام و طواف سارے ظواہر تو مل گئے
سنتا ہوں دل کا چین ہے ترے خزانے میں

.....خدا کے گھر کے سیاہ غلاف پر ہاتھ رکھ کر تمہاری معصوم آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔اب جبکہ تم اپنے خدا کے حضور میں خود پہنچ چکے ہو ابا میاں۔تم یقیناً بہت

خوش ہوگے۔

اس وقت یہاں پر کتنا سکون ہے۔ مکمل سکون اور چین۔ مدتیں گزریں۔ ایک رات گھر کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے میں نے دفعتہً محسوس کیا۔ دریچے کے شیشے پر جھکی ہوئی انار کے شگوفوں کی ایک ٹہنی سرسرا رہی تھی۔ اس سے مجھے اچانک ایسا معلوم ہوا تھا جیسے آس پاس کی باقی تمام چیزیں دروازوں کے فالسی پردے، سیاہ الماریاں کونے میں رکھی ہوئی سائیکل، یہ سب اتنی اجنبی اور بیکار چیزیں ہیں۔ صرف یہ شاخ زندہ ہے صحیح ہے، اپنی ہے مجھے صرف یہ شاخ چاہئے۔ سرخ شگوفوں کی یہ شاخ، دور سڑک کے پار، درختوں کے جھرمٹ میں چھپے ہوئے دو رویہ، اداس پشیمان، بیکل سے مکان کھڑے اونگھ رہے ہیں۔ اور چاندنی ان پر رینگ رہی ہے۔ اور پھر اسی وقت دفعتہً میں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ یہ سب اس قدر پراسرار ہے۔ اس قدر لرزہ خیز اس سے ڈر لگتا ہے۔ انار کی اس ٹہنی سے بھی ڈر لگتا ہے۔ کتنے ان گنت انسان مجھ سے پہلے پیدا ہوئے۔ ہزاروں برس سے ایک نسل کے بعد دوسری نسل کی زندگیوں کا یہ سلسلہ کیسا لڑکھڑاتا چلا آ رہا ہے۔ میرے اتنے بے شمار پرکھ بھی کبھی زندہ رہے ہوں گے۔ چلتے پھرتے ہوں گے۔ سوتے ہوں گے۔ برساتوں میں خوش ہوتے ہوں گے۔ اپنے پرکھوں کی ان تاریک قطاروں کے سائے مجھے بے حد پراسرار معلوم ہوئے۔

جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو ایک خوفناک، انجانی، ان دیکھی طاقت ہمارے پیچھے پیچھے ہمارے آگے آگے چلتی رہتی ہے۔ اور بالآخر جب ہم خود چلتے چلتے تھک جاتے ہیں تو ہمیں موت کے سایوں کی وادی تک پہنچا کر واپس لوٹ آتی

ہے۔اور دوسری روحوں کے پیچھے اسی طرح چپکے چپکے چلنا شروع کر دیتی ہے۔

پھر ہمیں انسانوں کا ایک گروہ ملتا ہے، جو ہمیں پسند آتا ہے۔ ہم اس سے مانوس ہوتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں۔ یا اللہ یہ اتنے پیارے لوگ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے، ان کے بنا ہماری زندگی کتنی نامکمل رہتی۔لیکن وقت کے دھارے کے ساتھ وہ گروہ ہم سے بچھڑ جاتا ہے۔اور کوئی دوسرا گروہ مل جاتا ہے۔اسی طرح ہم ایک عدم وجود سے دوسرے عدم وجود تک کا فاصلہ طے کرتے رہتے ہیں۔کتنے ایسے انسان ہوں گے جو ہم سے کبھی نہیں ملے اور نہ ان سے کبھی ملنے کا ہمارا اتفاق ہوگا۔اگر کبھی وہ مل جاتے تو ہم کتنے خوش ہوتے۔لیکن ہم انہیں جانتے بھی نہیں۔

وہ ان دیکھی، تاریک روشنی کی طاقت میرے سامنے کھڑی ہے۔اس کھڑکی کے پار۔اس انار کی شاخ کے نیچے۔اس سڑک کے موڑ پر۔لیمپ کے پیچھے کے اندھیرے میں۔دریا کے ساحل پر۔تم کون ہو بھئی۔میں وہ ہوں جو کبھی تم سے مل نہیں سکتی۔لیکن ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔یہ مجھے جانے کس طرح کی موت کی طرف لے جائے گی۔

ایک روز میں نے اپنی مدر سپریر سے پوچھا تھا۔ہولی مدر، وہ کیا وجہ تھی۔جس نے تم کو یہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا۔وہ کون کشش تھی جو تم نے اپنے آئرش مرغزاروں کو چھوڑ کر اس اجنبی اور گرم ملک کو اپنایا اور کیوں تم دوسرے مذاہب کی ضدی اور غیر دلچسپ لڑکیوں کے ساتھ دماغ کھپانے میں اپنی عمر بتا رہی ہو۔کیا۔کیا تم نے بھی انار کے شگوفوں کی کوئی اکیلی ٹہنی سرسراتی دیکھی تھی۔میں نے ان سے سوال کرنا چاہا۔

پھر اس رات سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرتے ہوئے جب میں نے الماری کھولی تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر بے تعلقی سے ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ میرے سارے الٹرا فیشن ایبل فراک اور اسکرٹس جو میں نینی تال میں سلواتی تھی اور ساریوں اور دوپٹوں کے انبار، اور سینڈلز کی قطاریں اور چوڑیوں کے ڈھیر۔ کیا یہ میری کائنات ہے۔ کس قدر حماقت زدہ، کس قدر حماقت زدہ۔ میں نے سوچا۔ یہ میری کائنات ہے۔ یہ میری ہر ہم عمر لڑکی کی کائنات ہے۔ ہر لڑکی کی تمنائیں میں نکتے پر آن کر ختم ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنی چیزیں الٹی پلٹیں۔ تصویریوں کے البم۔ اسکول کے پرانے ڈراموں کے گروپ۔ جین ہارلو اور ڈائنا ڈربن کی دستخط شدہ تصویریں۔ غیر ضروری ٹرنکٹ اور چوکلیٹ کے رنگ برنگے ڈبے۔ میں نے سوچا میں لڑکیوں کے اس طبقے، اس مخصوص گروہ کی کس قدر صحیح اور کیسی فضول ترین نمائندہ ہوں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

ارے اگر حیادار ہو تو ڈوب مرو چائے کی پیالی میں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یعنی بس یہی آپ ہیں۔ اور زیادہ ساریاں۔ اور زیادہ سینڈلز۔ میری معراج بھی یہیں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ارے ہائے رے۔ میں پھر واپس جا کر اپنے کمرے کے آگے کے برآمدے میں بیٹھ گئی۔ جس کی سیڑھیاں پچھلے باغ میں اترتی تھیں۔ جہاں ہوی ہو کس کے پودے تھے۔ اس وقت میں نے سوچا، ہم زندگی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہم زیادہ خوش رہ سکتے۔ کیوں نہیں ہم ایک دوسرے کو سمجھ پاتے، ہم سب ایک دوسرے کا زیادہ خیال، زیادہ احترام، زیادہ قدر کیوں نہیں کرتے۔ یہاں سب بدگمان ہیں۔

ان بلوریں ایوانوں میں میں نے اتنے سارے عالموں کو شدومد سے بحثیں کرتے سنا۔ سلطنت برطانیہ کے نائٹ، جامعہ ازہر کے علماء، برلین اور وی آنا کی یونیورسٹیوں کے ڈاکٹر دوسری مملکتوں کے خوش پوش، اور نرم نرم باتیں کرنے والے سفیر، فوجوں کے جانباز کمانڈر اور خطرناک اڑانیں کرنے والے دلاور ہوا باز۔ ان گیلریوں اور ایوانوں میں ان سب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ان کی باتیں میں نے سنیں۔ لیکن کچھ میرے پلے نہ پڑا۔ یہ سب اتنی بحثیں کس لئے کرتے ہیں۔ یہ محض سگار کا دھواں اڑانے اور ایک دوسرے کی بیویوں کے ساتھ ناچنے اور ووڈکا پینے ہی پر کیوں قناعت نہیں کرتے۔ کیا تم سب کو یہ طویل، بے مصرف بحثیں کرنے اور یہ بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کرنے سے کچھ ذہنی آسودگی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کیا تم اپنے ضمیر کو یقین دلا دیتے ہو کہ انسانیت کے لئے واقعی کچھ کر رہے ہو۔ میں ان سب کو دیکھتی ہوں اور انہیں بھول جاتی ہوں۔ لیکن مجھے صرف لیڈی سوکھے یاد ہے جو ایک فانی عورت ہونے کے باوجود دیوبالاؤں کی طرح ناچتی تھی اور امرت شیر گل یاد ہے جس نے اس بے رنگ کائنات میں تھوڑے دن زندہ رہ کر رنگوں کی ایک نئی دنیا تخلیق کی تھی۔

ابامیاں، ان سب باتوں کا حل، ان کا نتیجہ کیا ہے؟ اس رات میں نے ابامیاں سے پوچھا۔ جب میں اپنے کمرے کے لیمپ بجھا کے اور الماریوں کے دروازے بند کر کے ان کی نشست کے کمرے میں جا کر ان کی آرام کرسی کے قریب فرش پر بلی کی طرح بیٹھ گئی۔

حل.....؟.....انہوں نے سگار راکھ دانی میں رکھ دیا اور آرام کرنے کے لئے

آنکھیں بند کرلیں۔

ہائے ابا میاں۔ کیا تم اس وقت قنوطی بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم یقیناً زوال پسند ہو۔ کم از کم ابا میاں تمہیں اشتمالی اقدار سے تو قطعی کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی فی الحال۔ میں نے بچوں کی طرح بگڑ کر کہا۔ پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

بہت سے انسان جو اتنی پریشان کن باتیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ اور اب انہیں کچھ نہیں ملتا۔ جبھی تو لوگ انارکسٹ بن جاتے ہیں۔ ڈارلنگ..... راحیل ایک روز کہہ رہی تھی۔ اللہ کیا تم بھی انارکسٹ ہو؟ میں نے اپنی آنکھیں پھیلا کے خوفزدہ ہو کر اس سے پوچھا تھا۔

ہاں، ابا میاں تم قنوطی نہیں تھے۔ تم نے ایک بہادر کھلاڑی کی طرح بہت سے رنجوں کو بھی سہار لیا۔ اور ایک پاکیزہ معصوم سرشت فرشتے کی مانند ایک دلچسپ آرام دہ اور شاندار زندگی گزاری۔ تم انسانیت اور شرافت کی بہت اونچی اقدار کے وارث تھے اور تم اپنے پرکھوں کی روایات اور زندگی کے امتحانوں میں پورے اترے۔ تم ایسے عجیب وغریب انسان تھے۔ جس کا زندگی بھر میں کوئی ایک بھی دشمن پیدا نہ ہو سکا۔ اگر کوئی تمہاری زندگی کی کہانی لکھنے بیٹھے تو اسے کتنی مایوسی اور تعجب کے ساتھ، کمزوریوں، برائیوں اور خامیوں کا باب خالی چھوڑ دینا پڑے گا۔

دنیا میں اتنی ساری دل کش۔ پیاری چیزیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا کوئی حاصل نہیں۔ جنوبی سمندروں میں جزیرے ہیں اور خس کی خوشبو۔ اور یوجین اونیل کے ڈرامے اور بیتھوون کی موسیقی اور اچھے انسان برسوں کے الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی مر جاتے ہیں۔ یہ کتنی زیادتی ہے۔

ابا میاں، دنیا کے کتنے کم لوگ اب تمہیں یاد کرتے ہوں گے۔ انقرہ، استنبول اور طہران میں اسی طرح تمہاری دلچسپی کی نئی نئی کتابیں چھپتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس اور آسٹریا میں اسی طرح دسمبر کی برف جگمگاتی ہے۔ اور جب اپریل کا مہینہ آتا ہے تو باغوں میں ہولی ہوکس کے ڈنٹھل اسی طرح پھولوں کے بوجھ سے جھک جاتے ہیں۔ جیسے اس روز صبح جھکے ہوئے تھے۔ جب لوگ تمہیں تمہارے کمرے سے اٹھا کر برساتی میں لائے تھے اور وہاں سے عیش باغ کی طرف لے گئے تھے۔

اپریل کی اس رات کے لمحو۔ یونہی چپ چاپ سرسراتے ہوئے گذرتے رہو۔ تمہاری پرواز روک کر تم سے یہ باتیں کرنے کا بھی کوئی حاصل نہیں۔

آؤ ہم خاموش ہو جائیں۔ اور ان لمحات کے بھاگنے کی آواز سنیں اور چپکے بیٹھ کر مستقبل کے زمانوں کا انتظار کریں۔ اپریل کے آسمان پر اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔ اور ہوا میں بوندیں گرج رہی ہیں کہ اسی طرح رات آتی ہے۔

دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم

''یہ تو تم کبھی بھی نہیں جان سکتیں، پوم پوم ڈارلنگ۔'' پولی نے سر ہلا کر کہا اور پھر نٹنگ میں مصروف ہو گئی۔ اس وقت پانی کی طرف سے آنے والی ہوا معمول سے زیادہ تیز تھی۔ اور ہمارے بال اڑے جا رہے تھے۔ ساحل پر سرخ ناک والا موٹا انگریز اپنا چھوٹا سا موڈل طیارہ اڑانے میں مشغول تھا۔ کارڈبورڈ کا بنا ہوا وہ چھوٹا سا طیارہ اپنے ڈیزل انجن کے زور سے گھوں گھوں کرتا اوپر اٹھتا اور ہوا میں کافی بلندی پر پہنچ کر دس پندرہ منٹ تک اڑتے رہنے کے بعد زمین پر اتر آتا۔ ہر اتوار کی صبح وہ موٹا انگریز اپنی اس ہوبی میں اس انہماک سے مشغول رہتا۔

پولی دریچے میں سے ساحل کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کاہلی سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور پھر نٹنگ میں جٹ گئی۔

''کیا ہوا پولی ڈیر۔'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہم سب کے سب دراصل چھوٹے چھوٹے احمق بچے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے عقلمندی سے سر ہلا کر اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ اور جین سمنز کی تصویر پر مونچھیں بناتی رہی۔

''ذرا ٹوکری میں سے بارہ نمبر کی سلائیاں نکال دینا میری جان۔'' پولی نے فرش پر لیٹے لیٹے ورک باسکٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی

کہ یہ تو تم کبھی بھی.....'' اس نے پھر بات شروع کی۔

''ارے سنو تو۔ بیگم سلمان آج پھر اپنے میاں سے لڑی ہیں۔'' میں نے پیانو کی آواز پر کان لگاتے ہوئے نہایت بشاشت سے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہنہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے بھائی سنو تو۔'' میں نے غور سے سننا شروع کیا۔ دوسری منزل پر بیگم سلمان صریحاً اپنے پیانو کے پردوں پر اپنا غصہ اتار رہی تھیں۔ باہر آسمان پر ساحلی پرندے تیز دھوپ میں بہت نیچے چکر کاٹ رہے تھے۔ افق کے قریب پانی کے دوسرے کنارے پر لکڑی کے تفریحی جھونپڑوں کی قطاریں حد نظر تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ فضا پر مکمل اور گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ سکوت جو زندگی کو کاٹتا، ختم کرتا چلا جاتا ہے۔

''آؤ پولی شطرنج کھیلیں۔'' السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان کے تیسرے نمبر پر جس کے سرورق پر سب سے اوپر ہماری کملا ہسپال کی تصویر چھپی تھی۔ غیر ضروری مونچھیں بناتے بناتے تھک کر میں نے کہا۔ ''جب تک آدمی لوگ مرغابیاں پکڑ کر واپس نہ آویں ہم کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ لہٰذا آؤ تمہیں ایک مات دے دی جائے۔'' میں نے خوش خوش اندر جا کر شطرنج کا ڈبہ تلاش کرنا شروع کیا۔ پولی ٹنگ رکھ کر غور سے کملا کی تصویر دیکھتی رہی۔ جس میں وہ ولایت کے سفارت خانے کے دو آدمیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور ایک انتہائی ڈپلومیٹک قسم کا تبسم اس کے ہونٹوں پر تھا۔ جیسا مسز پنڈت کے ہونٹوں پر تصویروں میں نظر آتا ہے۔ کملا ہمیشہ اسی طرح اپنی فطری بشاشت سے ہنستی ہے۔

پولی غالباً کملا کی تصویر دیکھ کر اپنی کسی تھیوری پر غور و خوض میں مصروف تھی۔ جب میں شطرنج لے کر کمرے میں واپس آئی۔ ''چلو بھئی کھیلیں۔'' میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایں؟'' اس نے اس طرح آنکھیں پھیلا کر پوچھا گویا میں نے اسے شطرنج کھیلنے کی بجائے چھت سے الٹی لٹک جانے کی دعوت دی تھی۔

''اب کھیلو گی نا ہیں۔'' میں نے غصہ سے کہا۔

''شطرنج؟'' اس نے پھر غیر یقینی انداز سے کہا۔

''نہیں تمہارا سر۔'' میرا جی چاہا کہ یا اسے قتل کر دوں یا خودکشی کر لوں۔

'شطرنج..... اس وقت کملا کی تصویر دیکھ کر مجھے زوئی شدت سے یاد آ گئی..... زوئی فرید۔ یاد ہے۔ سب سے پہلے کملا ہی نے اسے ایک مرتبہ ہمارے ہاں مدعو کیا تھا۔'' پولی نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔

زوئی فرید..... مجھے بھی اس خوبصورت لڑکی کا خیال آ گیا۔ لیکن اس سے شطرنج نہ کھیلنے کا کیا تعلق۔ میں نے چڑ کر پوچھا۔ پولی عجب دیوانی لڑکی تھی۔

خدا کے لئے اس وقت اس کمبخت کھیل کو ہٹاؤ سامنے سے۔ سنو۔ اس تمہاری شطرنج اور زوئی فرید میں عجب طرح کا ایسوسی ایشن ہے۔ تم اس کو نہ سمجھ سکو گی۔ جبھی تو میں کہہ رہی تھی کہ یہ تم کبھی بھی نہیں جان سکتیں کہ۔'' پولی نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''زوئی..... آج کل کہاں ہے؟'' میں نے شطرنج پرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ..... وہ سنا ہے کہ کشمیر جا کر ایک ریڈ کراس یونٹ تیار کرنے والی ہے۔''

''زوئی.....؟''میں نے آنکھیں پھیلا کر تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔.....''

زوئی.....ریڈ کراس.....؟؟

''ہاں بھئی.....نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔تبھی تو میں کہتی تھی کہ تم کبھی بھی۔''پوری بات ختم کئے بغیر اون کا دوسرا گولہ لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

افوہ.....افوہ بھئی.....میں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔زوئی .....زوئی فرید کو اگر آپ دیکھیے تو یقیناً بے ہوش ہو جائیے۔میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے پتہ نہیں۔لیکن شاید آدمیوں پر اسے دیکھ کر اسی طرح کا ردعمل ہوتا ہو۔مجھ سے ٹوڈلز نے ایک مرتبہ یہی کہا تھا اور ٹوڈلز کم از کم مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔وہ کچھ اس طرح کا انسان ہے کہ جسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے خدا نے خلوص اور سچائی، انسانیت اور شرافت اور اسی قسم کے سارے اوصاف حمیدہ کوٹ کوٹ کر اس میں ٹھونس دیئے ہوں۔حالانکہ دیکھنے میں وہ اوروں ہی کی طرح ہے۔آپ سب کی طرح وہ بھی شکار اور کرکٹ میں دلچسپی لیتا ہے۔ایک سے غیر دلچسپ موضوع مثلاً موٹروں کے نئے موڈلز پر گھنٹوں انتہائی تندہی سے بحثیں کر سکتا ہے۔صرف اس میں اور آپ سب میں یہ فرق ہے کہ اس کا نام ٹوڈلز ہے اور وہ بے حد سوئیٹ اور گڈو انسان ہے۔بہر حال تو ایک روز ٹوڈلز ہی نے مجھے بتایا تھا کہ زوئی فرید نہایت عجیب وغریب لڑکی ہے۔اور اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کا ردعمل محسوس ہوتا ہے۔بیہوش ہو جانے کو جی چاہتا ہے یا کیا۔یہ ردعمل آدمیوں میں ہوتا ہوگا۔مجھے تو زوئی فرید میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔سوائے اس کے کہ وہ بہت

خوبصورت ہے،تو خوبصورت تو ہماری بی ہمسائی بیگم سلمان بھی ہیں۔لیکن ان کے میاں روز ان سے لڑتے ہیں اور دوسری معمولی شکل کی لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

ان مردوں کی بھلی چلائی۔

تو ٹوڈلز نے مجھ سے کہا تھا کہ زوئی عجیب لڑکی ہے۔ٹوڈلز اس روز کافی اکسائیٹڈ تھا جس طرح کوئی تیرہ چودہ سالہ لڑکا ایک نیا کمینوسٹ یا کوئی نئی قسم کی مشین یا کل پرزے دیکھ کر بے حد اکسائیٹڈ ہو جاتا ہے۔اور تل جاتا ہے کہ فوراً اسے توڑ پھوڑ کر دوبارہ بنائے۔ٹوڈلز اس روز ایک پارٹی میں گیا تھا۔جو بھائی امجد نے دی تھی۔عذرا اپنے ابا میاں کے ساتھ ایران جا رہی تھی اور یہ اس کی رخصتی پارٹی تھی۔عذرا کے متعلق سب سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔لیکن طہران.....تو بس جنت ہے اور عذرا کے پروسپکٹس اس سلسلے میں بہت ہی عمدہ تھے اور اس پارٹی میں ٹوڈلز نے زوئی کو دیکھا کہ وہ خطرناک حد تک کو بصورت نظر آ رہی ہے، خطرناک طور پر خوبصورت ،آدمی لوگ الفاظ بہت دلچسپ ایجاد کرتے ہیں۔ ''سنبھلیے.....خطرہ ہے.....شکریہ کا بورڈ لے کر چلا کرو زوئی فرید۔''عذرا نے اس سے کہا تھا۔یہ بہت ہی معمولی قسم کا مذاق تھا۔لیکن ٹوڈلز کہتا ہے کہ بالکل صحیح۔زوئی یقیناً اتنی ہی خطرناک حد تک خوبصورت ہے۔اس کا رنگ ہلکا سنہرا ہے۔بالوں میں نیلی اور براؤن لہروں کی سی جھلک ہے اور جب وہ باتیں کرتی ہے تو لگتا ہے جیسے بہت دور کہیں چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔زوئی فرید۔وہ ایسی ہی ہے۔ٹوڈلز کہتا تھا کہ وہ اس قسم کی لڑکی ہے جو اچھے بھلے بستے گھروں کو بغیر

جانے بوجھے تباہ کر سکتی ہے۔ یعنی جوا سے ایک دفعہ دیکھ لے بس مر گیا وہ بچارہ.....

اور بیگم سلمان کے میاں کا واقعہ دیکھ کر یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ رستا بستا گھر ان کا بھی ہے جسے دوسری عورتیں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن دوسری عورتوں اور زوئی میں بڑا فرق ہے۔ زوئی کبھی کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ ۱۹۴۴ء کی گرمیوں میں جب وہ طہران گئی تھی تو شا.....

ابھی میں یہیں تک سوچ پائی تھی کہ پولی اون کی لچھیاں سلجھاتی کمرے میں واپس آ گئی اور زور سے ایک بے حد فلسفیانہ 'ہونہہ' کر کے پھر نٹنگ میں جٹ گئی۔ باہر ساحل پر اسی طرح چھٹیوں کی صبح کی مطمئن اور کاہل خاموشی طاری تھی۔ اور انگریز کا ہوائی جہاز ہمارے برآمدے کے قریب کریش لینڈنگ کر چکا تھا۔

''اور واقعہ یہ ہے کہ زوئی فرید اب کشمیر جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ترار خیل.....'' پولی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بات شروع کی۔

''سچ کہو؟'' میں نے بے حد دلچسپی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ترارخیل یا نہیں تراخیل۔ زوئی یقیناً عجیب وغریب لڑکی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ٹوڈلز کو یاد کیا۔ جو زوئی کے متعلق آپ سے گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ یہ آدمی لوگ اپنی دلچسپی کے تذکروں سے آپ کو سو فیصدی بور کر سکتے ہیں اور پھر سوچئے کہ زوئی فرید کے ساتھ یہ واقعہ ہوا۔

پولی نے دیوار کے سہارے فرش پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور نٹنگ کو ایک طرف رکھ کے بھٹے کھانے شروع کر دیئے اور کاہلی سے آنکھیں بند کر لیں۔

''سنو بھائی..... اس روز کیا ہوا.....'' پولی نے بے حد سنجیدگی سے مجھے مخاطب

کیا ''اس روز زوئی دن بھر کے لئے ہمارے یہاں آئی تھی۔ کھانے کے بعد میں نے اس سے کہا آؤ زوئی ڈارلنگ شطرنج کھیلیں..... بالکل جس طرح اس وقت تم نے مجھ سے کہا تھا۔ اور زوئی آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھنے لگی۔ اور اس کا سانولا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔ اور میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو بیحد چغد محسوس کیا۔ گویا میں نے اس سے کہا تھا کہ آؤ زوئی ڈارلنگ میرے ساتھ قلابازیاں کھاؤ۔'' پھر پولی خاموش ہوگئی۔

''کاہے کے لئے اس نے ایسا کیا.....؟ میں نے بے حد دلچسپی اور انہماک سے سوال کیا۔

''کیا.....؟'' زوئی فرید نے اس طرح مجھے کیوں دیکھا.....؟ یہی تو میں تم سے کہتی ہوں پوم پوم ڈارلنگ کہ ہم کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ کیا ہوتا ہے..... اس روز جانتی ہو کیا ہوا.....؟'' پولی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اسی روز، جب زوئی اتوار کا دن گذارنے یہاں آئی تھی۔ میں ایک انگریزی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ اس میں لندن کے ایک شخص کے متعلق ایک مضمون چھپا تھا جو شطرنج کے سینکڑوں برس پرانے اور نادر نمونے جمع کیا کرتا ہے۔ اس کے پاس قدیم چین، ہندوستان، مصر اور یورپ کے شطرنج کے تاریخی سیٹ ہیں۔ جو بے فکرے دولت مند سینکڑوں پونڈ میں اس سے خریدتے ہیں۔'' پولی یہ کہتے ہوئے پھر بھٹے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''قدیم نوادر کا کاروبار، ظاہر ہے۔'' میں نے بے تعلقی سے کہا۔

''ہاں بالکل۔ اور اس میں مضمون کے ساتھ شطرنج کے نمونوں کی تصویریں بھی دی ہوئی تھیں۔''

''لیکن اس سے زوئی فرید کے تذکرے کا کیا تعلق.....؟'' میں نے اکتا کر پوچھا۔ موسم بہت گرم تھا۔ فضا پر غنودگی چھائی جا رہی تھی۔ کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اور پولی اصغر یقیناً اینجیوں کی سی باتیں کر رہی تھی۔

''چنانچہ وہ رسالہ۔'' پولی نے پھر اسی سست رفتاری سے کہنا شروع کیا۔

''قصہ مختصر کرو۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

''اچھا۔ سنو تو پھر کیا۔'' اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ اور کہنیوں کے بل بیٹھ گئی۔ ''وہ مضمون پڑھ کر میں نے رسالہ پرے پھینک دیا۔ تصویریں دیکھنے کے لئے زوئی نے اسے اٹھا لیا اور ورق الٹتے الٹتے غالباً اس کی نظر اس مضمون پر پڑ گئی۔ اور اس کا رنگ پھر سفید پڑ گیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ کسی شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اور اس کے چہرے پر اس طرح کا ایکسپریشن آ گیا۔ جیسے تم نے شکنتلا سر ریواستو کا وہ پورٹریٹ بنایا تھا پیلز سے جو۔''

''..... جو سروائیلی اپنے ساتھ ولایت لے گئے.....'' میں نے مستعدی سے اس کی بات پوری کر دی۔

''ہاں..... جو سروائیلی اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔'' پولی نے اسی سست آواز میں دہرایا۔ جب کبھی شینکی سر ریواستو کے اس پورٹریٹ کا ذکر آتا ہے تو میں سامعین کو یہ یاد دلانا نہیں بھولتی کہ اس پورٹریٹ کو سروائیلی..... صوبجات متحدہ کا آخری برطانوی گورنر اپنے ہمراہ ولایت لے گیا۔ اور یہ یاد دلانا بھی نہیں بھولتی کہ

شینکی بچاری آج کل اتنی دور برازیل میں ہے جہاں اس کا خرگوش کے ایسے کانوں والا میاں ہندسرکار کا راج ووت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بے حد دقیق نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ٹوڈلز کہتا تھا یعنی شینکی کے اس پورٹریٹ میں، یا سروائیلی میں، یا پھر برازیل میں کہیں نہ کہیں کوئی لاشعوری پیچیدگی پنہاں ہے۔ جس کی وجہ سے میں ان سب چیزوں کا تذکرہ ایک ساتھ کرتی ہوں۔ بہر حال پولی اصغر ماہر نفسیات نہیں ہے۔ اور نہ میں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میرا ٹرمپٹر مر چکا ہے۔ اور یہ بات ٹوڈلز مجھے ہمیشہ یاد دلایا کرتا تھا۔

اور چونکہ میرا ٹرمپٹر مر چکا ہے اس لئے مجھے اپنی نفیری خود بجانی پڑتی ہے۔

''سنا تم نے.....'' پولی کہہ رہی تھی ..... ''چنانچہ اس کے چہرے پر وہی ایکسپریشن آ گیا۔ جیسے وہ اپنے سامنے دنیا کو ختم ہوتے دیکھ رہی ہے۔ یا خداوند خدا نے اس کے آگے اسرار کائنات فاش کر دیئے ہیں یا جانے کیا..... اور میں نے اس سے کہا۔ میں نے گھبرا کر اس سے کہا..... زوئی میری جان۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ کچھ نہیں۔ اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔ اور اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔'' پولی یہاں تک کہہ کر پھر بھٹے کھانے لگی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں کہنیوں کے بل فرش پر لیٹ کر ہمہ تن گوش رہی۔

''پھر۔ اس نے وہ رسالہ اس طرح دور پھینک دیا۔ جیسے وہ ناگ تھا جو اسے کاٹ کھاتا یا آگ تھی جس میں وہ جل جاتی یا اسی قسم کی کوئی اور نا قابل برداشت چیز۔''

''اچھا اپنی شاعری اور تشبیہیں ختم کرو اور سیدھی طرح بتلاؤ کہ پھر کیا ہوا.....''

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''پھر تم نے لڑنا شروع کیا۔لڑاکا مرغی!''پولی نے غصے سے کروٹ بدلی۔

''کیا کہا تم نے؟ میں مرغی ہوں؟''میں نے چلا کر کہا۔

''اور کیا ہو۔بالکل،صریحاً مرغی ہو۔یا۔یا۔بلی ہو۔''اس نے سوچ کر کہا۔

ہنسی آ گئی۔

باہر برآمدے کے نیچے سمندر کی لہریں ساحل کی اونچی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔اور آدمی لوگ ابھی مرغابیوں کے شکار سے واپس نہیں آئے تھے۔

''اچھا تو سنو۔''پولی نے پھر بات شروع کی۔''اس نے وہ رسالہ پھینک دیا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔اور دوپہر کے وقت جب وہ کھانے کی میز پر آئی تو سب نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ذرا غور کرنا پوم پوم ڈیر۔زوئی فرید کی آنکھیں رونے کے بعد کتنی پیاری لگتی ہوں گی۔اور میں نے سوچا۔میں نے سوچا کہ زوئی کیوں اس طرح رونے لگی۔زوئی تو کبھی جذباتی نہ تھی۔زوئی فرید جس نے طہران میں شا.....''

''اچھا پولی اصغر تم نے پھر اسکینڈل مونگرنگ شروع کر دی۔''میں نے ڈانٹا۔

''اچھا خیر۔''پولی نے بات کا رخ پلٹ دیا۔''تمہیں یاد ہے پوم پوم ڈیر۔ٹوڈلز کہا کرتا تھا کہ زوئی فرید وہ لڑکی ہے کہ اگر وہ کسی کا دل توڑ دے تو بادشاہ کے سارے گھوڑے اور بادشاہ کے سارے سپاہی بھی مل کر اس کو جوڑ نہیں سکتے۔اور میں سوچنے لگی کہ زوئی تو سب کو رلا سکتی تھی۔لیکن اس کے آنسوؤں کا باعث کون ہو سکتا ہے۔میں پہروں سر کھجاتی رہی۔پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کون ایسا سورما

ہے۔پھر دوپہر کو جب میں آرام کے لئے لیٹی تو میں نے اس اسٹرینڈ میگزین کے اس مضمون کو کئی بار پڑھا۔لیکن میری عقل میں نہ آیا کہ اسے دیکھ کر زوئی کو کیا ہو گیا۔پھر مجھے خیال آیا کہ صبح جب میں نے اس سے شطرنج کے لئے کہا تھا تب بھی وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگی تھی۔گویا میں نے اسے قتل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔آخر میں نے سوچا کہ مجھے اپنے فرائڈ پر پورا عبور حاصل نہیں ہے۔لہٰذا بیکار پریشان ہونے سے کیا فائدہ،اور یہ طے کر کے میں سو گئی۔''پولی بھٹے کھانے کے لئے پھر ذرا رکی اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔''پھر شام ہوئی۔ہم لوگ پکچرز جا رہے تھے۔امجد بھائی اور دلہن بھابی اپنی نئی کار لے کر ہم سب کو لینے کے لئے آئے۔بالکل نئی کار تھی۔اسٹوڈی بیکر کا تازہ ترین موڈل۔''

''وہی جس میں آگے بھی شیشہ ہوتا ہے اور پیچھے بھی.....''میں نے بشاشت سے دریافت کیا۔

''ہاں وہی.....''پولی نے جواب دیا۔''اور بالکل یہی بات میں نے امجد بھائی سے کہی کہ بھیا آپ کی یہ کار وہی ہے نا جس میں آگے بھی شیشہ ہوتا ہے اور پیچھے بھی۔میرا مطلب اس کے بالکل انوکھے ہوائی جہاز کے ایسے نمونے سے تھا۔اور سب لوگ میری اس بات پر خوب ہنسے۔پھر ہم سب پکچرز کے لئے تیار ہوئے اور ہم نے زوئی فرید کو بلایا۔اور ہم نے اس سے کہا۔زوئی دیکھو مجو بھیا نئی کار لائے ہیں۔''''جس میں آگے بھی شیشہ ہوتا ہے اور پیچھے بھی۔''امجد بھائی نے میرا جملہ مکمل کیا۔سب پھر ہنسنے لگے۔اور زوئی نے یہ سن کر ایک بار پھر ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح.....میری اس تشبیہہ کو معاف کرنا پوم پوم ڈارلنگ.....امجد بھائی کو دیکھا

اور اس کے چہرے پر پھر وہی شکستہ مسافی والا ایکسپریشن آ گیا۔ اور جانتی ہو اس نے کہا کہ وہ پکچرز نہیں جا سکے گی۔ اور وہ بیگ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف واپس چلی گئی۔ سنا تم نے۔ اور ہم سب اس قدر ہکا بکا رہ گئے کہ جیسے جانے کیا ہو گیا۔ پھر ہم لوگ پکچرز چلے گئے۔ ایسٹھر ولیمز کی رنگین فلم تھی۔ لیکن میرا دل زوئی میں لگا رہا۔ اور میں سوچتی رہی کہ یہ کیا قصہ ہے زوئی ایسی سمجھدار، باذاق دلچسپ لڑکی ہے۔ وہ ایسی باؤلی انوکھی باتیں کبھی نہیں کرتی تھی۔ میں نے بہت غور کیا۔ لیکن یہ مسئلہ مجھے بہت ہی الجھا ہوا معلوم پڑا۔ اور تم ہی بتاؤ کہ میں اس سے بھلا کیا پوچھتی کہ زوئی میری جان تم اسٹوڈی بیکر کے نئے موڈل اور شطرنج کے کھیل سے اتنی خوفزدہ کیوں ہو۔ کتنی حماقت کا سوال تھا۔''

''پھر؟'' میں نے بالکل سحر زدہ انداز میں پوچھا۔

''پھر ایک روز ہم سب تاش اور دوسرے کھیلوں میں جٹے ہوئے تھے۔ امجد بھائی اپنا الگ فور بنانے پر مصر تھے۔ انہوں نے زوئی سے شامل ہونے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ مجھے برج پسند نہیں، لوفروں کا کھیل ہے اس لئے؟ میں نے ہنس کر پوچھا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ اچھا تو آؤ ڈرافٹس کھیلیں یا کیرم۔ ہیلما۔ لوڈو۔ اور نہیں تو کوئی باؤلا سا پارٹی گیم شروع کر دیں۔ یہ بھی تم کو پسند نہیں تو تم اور جو کہو ہم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کہو تو کسی کو تمہارے لئے قتل کر دیں۔ کوئی پہاڑ کاٹ کر نہر نکال لائیں۔ شولری ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تم کچھ کہو تو سہی۔ شمیم بھائی نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ وہ خوب ہنسی۔ اور پھر ہمیشہ کی طرح ہم سب کے ساتھ کھیلوں میں لگ گئی۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ماموں میاں آ گئے۔

اور انہوں نے آتے ہی نعرہ لگایا کہ تم سب کس خرافات میں لگے ہو۔ آؤ شطرنج جمے۔ ماموں میاں تم جانو ہمیشہ کے لئے شطرنج چمپئن ہیں۔ ہم سب سارے کھیل چھوڑ چھاڑ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے گرج کر زوئی کو بھی مدعو کیا۔ آؤ زوئی بٹیا شطرنج کھیلی جائے..... اور یقین کرو ایسا لگا جیسے زوئی پر کسی نے ریوالور چلا دیا ہو۔ دوسرے لمحے وہ پھر سنبھل گئی اور کسی بہانے کمرے سے نکل گئی۔ کسی نے اس چیز کو نوٹس نہیں کیا۔ لیکن میں پہلے بھی اس کا یہ رویہ دیکھ چکی تھی۔ اس لئے میری عقل اور بھی چکرا گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اور اب میں نے سنا ہے کہ وہ کشمیر جا رہی ہے۔ تر ارخیل۔ لو بھٹا کھاؤ۔'' پولی نے بات ختم کر کے ایک بھٹا پیش کیا۔

آدمی لوگ پہاڑی کی طرف سے آتے نظر آئے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ زور زور سے باتیں کرتے اور تھکے ہارے وہ سب اندر داخل ہوئے۔ پانچ مرغابیاں اور چند قازیں مار کے وہ اس قدر خوش تھے کہ گویا کشمیر فتح کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ آدمی لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انہیں آپ بندوقیں دے دیجئے۔ یا ڈون بریڈ مین کا تذکرہ شروع کر دیجئے بس ان کی دنیا مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ سب آپس میں حسب معمول کسی بحث میں الجھے رہے میں مرغابیاں صاف کروا کے انہیں تلنے اور پکانے میں جٹ گئی۔ پولی آدمی لوگوں کے ساتھ نشست کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اسے کھانے پکانے سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف کھانے کی قائل ہے۔ خالص ''نئی عورت'' جو گھر میں اتوار کے روز صبح سے سلیکس پہنے رہتی ہے۔ اور مارشل پلان اور فرنچ خود وجودیت پر بحث کرتی ہے اور جس کے دھوبی کا

حساب بیرہ لکھتا ہے۔ پولی اصغر بھی تقریباً یہی ٹائپ ہے۔ اور اپنے ٹائپ سے بہت خوش ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''نئی عورت'' ہونا بھی کافی سنسنی خیز اور طمانیت بخش تجربہ ہے۔

کھانے کی میز پر امجد بھائی نے کہا۔ ''سنا تم نے لڑکیو..... آج شاید جیمی آن پہنچے۔''

''واقعی.....؟'' میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''صبح اس کا خط مجھے ملا ہے کہ وہ لکھنؤ سے سیدھا یہاں آ رہا ہے۔'' امجد بھائی نے کہا۔

''کاش ٹوڈلز اس کے ساتھ آ سکتا۔'' میں نے خواہش ظاہر کی۔

''ٹوڈلز بچارہ کیسے آ سکتا ہے۔ یہاں ایرپورٹ پر اترتے ہی اسے فوراً پکڑ نہ لیا جاوے گا؟'' امجد بھائی نے جواب دیا۔

ہاں واقعی۔ پچ پچ پچ۔ میں نے سوچا۔ کتنی عجیب، مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ ہمارا ٹوڈلز۔ ہم لوگوں سے یہاں آ کر نہیں مل سکتا۔ آتے ہی اسے قید کر لیا جائے گا۔ اگر ہم اس سے ملنے جائیں تو غالباً ہمیں بھی پکڑ لیا جائے۔ واقعی ہم لوگ بھی کیسے عجیب و غریب زمانے میں جی رہے ہیں۔

''جیمی۔ گھر کی وہ پارٹیاں یاد ہیں جن میں جیمی کتنا شور مچایا کرتا تھا۔'' امجد بھائی نے کہا۔ آج سب کو رہ رہ کر گذرے دن یاد آ رہے تھے۔

''ہاں۔ اور ایک دفعہ کملا نے زوئی کو بھی بلایا تھا۔ زوئی فرید.....'' بھائی شمیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

پولی نے غور سے چھت کو دیکھنا شروع کر دیا۔

''اولڑکی..... کھاتی کیوں نہیں.....؟'' نادر نے مرغابی کی ایک ٹانگ بالکل اس کی ناک میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔ وہ پھر بے دھیانی سے کھانے میں مشغول ہوگئی۔

او..... گوش..... کھانے کے بعد دریچے میں کھڑے ہو کر میں سمندر کو دیکھنے لگی۔ جس کی لہریں دھوپ میں چاندی کی طرح جھلملا رہی تھیں..... زندگی بھی بس..... حد ہے..... میں نے سوچا۔ ہم سب نشست کے کمرے میں آ بیٹھے۔ پھر جیمی کا تذکرہ شروع ہوگیا کب آئے گا۔ کس راستے سے آ رہا ہے۔ کتنے دنوں کی چھٹی لی ہے۔ اس کی نئی موٹر کار کا انجن کیسا ہے۔ آدمی لوگوں نے پھر انجنوں موٹروں اور گھوڑوں کی انتہائی غیر دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ میں اکتا کر اپنے کمرے میں آ گئی اور نٹنگ کرتے کرتے سوگئی۔

شام پڑے جیمی آن پہنچا۔ اتنے دنوں بعد اس سے مل کر خوشی کے مارے ہمارا جی چاہا کہ قلابازیاں کھائیں اس اجنبی دنیا میں وہ اس دنیا کی طرف سے ایک سفیر کی طرح آ رہا تھا۔ جو ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور جسے ہم بہت پیچھے بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ ہم دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ سارے دوستوں کی اس نے خبریں دیں۔ کون کہاں ہے۔ کون کیا کر رہا ہے۔ تقسیم کے بعد ہمارا سارا گروپ تقریباً دنیا کے سارے گوشوں میں تتر بتر ہوگیا تھا۔ اور اب ایک دوسرے سے ملنے کی بہت کم امید تھی۔

''معلوم ہے میرا کہاں تقرر کیا گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کہاں؟'' پولی نے پوچھا۔

''جو غیر دلچسپ ترین مقام تم سوچ سکتی ہو۔'' اس نے کہا۔

''ٹنڈو آدم؟'' پولی نے بشاشت سے دریافت کیا۔

''نہیں..... ٹنڈو اللہ یار خاں.....'' میں نے مستعدی سے کہا۔ ہم نے اس طرح کے بہت سے نئے نئے انوکھے نام سیکھ لئے تھے۔

''گھوڑا گلی۔'' اس نے بتایا۔

''گھوڑا کیا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پھر چلتے وقت یک لخت اس نے سوال کیا..... ڈولی کہاں ہے؟ تم کو کچھ معلوم ہے؟''

''ڈولی بلگرامی؟'' میں نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔''

''حیدرآباد میں ہوگی۔ اور کہاں ہوتی۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

شام کو وہ چلا گیا۔

''.....ارے بھائی اچھن خاں تو ہمیں آج ہی دکھائی پڑے۔ کلب میں ڈٹے تھے۔'' جیمی کو اسٹیشن پہنچا کر جب ہمارے بھائی لوگ واپس آئے تو نادر نے کہا۔

''کون اچھن خاں.....ہی بلگرام والے؟'' امجد بھائی نے پوچھا۔

''ہاں وہی بلگرام والے۔ اب تو مدتوں سے حیدرآباد میں ہیں۔'' نادر نے جواب دیا۔

''اماں وہی ناجن کی ایک بے حد خوبصورت لڑکی تھی؟'' شمیم بھائی نے دلچسپی

سے پوچھا۔

''اماں لڑکی نہیں بھتیجی یار۔لڑکی تو وہ کسی یار جنگ کی ہے۔بہر حال،تو میاں اچھن یار جنگ تو یہاں براج رہے ہیں۔'' نادر نے کہا۔

''بڑی خوبصورت لڑکی ہے بھائیو..... ڈولی بلگرامی.....'' بھائی شمیم نے گہری سانس بھر کر کہا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں اب تک اندر چپکی بیٹھی ان سب کی باتیں سن رہی تھی جب آدمی لوگ خواتین کی غیر موجودگی میں کسی خوبصورت لڑکی کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس وقت ان کے مختلف ریمارک اور فٹ نوٹ اور رائیں سننے میں بڑا مزا آتا ہے۔

اب واقعہ یہ ہے کہ ڈولی بلگرامی نے حیدرآباد میں بڑی سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ ایک دفعہ مسوری بھی آئی تھی۔ وہاں میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔''جوبلی ہل پر رہتی ہے۔ٹھاٹھ کرتی ہے پٹھی۔اور دیکھنا اس کا مکان ایسا ہے کہ اسے سجانے کے لئے فرانس سے ڈیکوریٹر زبلائے گئے تھے۔'' نادر نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا۔

''اس کے ابا میاں کوئی یار جنگ رہے ہوں گے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا تھا۔

''ہاں یار جنگ تو خیر ہیں ہی۔لیکن ہیں بالکل مقروض۔محض فیشن کی خاطر کوٹھی بنوائی تھی جوبلی ہل پر۔مگر بھائی کیا کوٹھی تھی۔خواب تھا خواب۔اور جتنی خوبصورت کوٹھی اس سے زیادہ خوبصورت لونڈیا۔میری تو دیکھ کر ہی سٹی گم ہوگئی۔'' نادر نے ہاتھ ہلا کر کہا تھا۔

''فرانسیسی ڈیکوریٹرز.....؟ ارے رام رے رام.....'' میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے ایک لمبا سا سانس کھینچ کر حیرت سے پوچھا تھا۔''ارے پھر تو وہ

جانے کیا گجب کی چیز رہی ہو گی۔ پھر کیا ہوا۔؟'' میں نے بے حد دلچسپی سے دریافت کیا۔

''ہوتا کیا..... وہ کسی معمولی حیثیت کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ جو کسی یار جنگ کا بیٹا نہیں تھا اور چھٹیاں گذارنے الہ آباد سے کسی عزیز کے پاس حیدر آباد گیا تھا۔''

''پھر.....؟ اس نے خودکشی کر لی؟''

''کس نے؟''

''اسی لڑکے نے جو یار جنگ کا بیٹا نہیں تھا۔''

''ارے نہیں بھائی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ پھر تو میں خود ہی حیدر آباد سے واپس آ گیا تھا۔'' نادر نے جواب دیا۔

پھر اسی ڈول بلگرامی کو میں نے اکثر دیکھا تھا۔ واقعی وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ لیکن زوئی فرید سے زیادہ حسین ہرگز نہیں تھی۔ بقول کملا زوئی فرید کے حسن میں کلاس تھی۔ ڈولی بلگرامی میں محض گلیمر تھا۔ گلیمر اور اپیل۔

اور دیکھنا میری جان، نادر کہتا تھا کہ ڈولی بلگرامی کے گھر کی تیسری منزل پر سوئمنگ پول تھا۔ اور ڈرائنگ روم میں بلوریں فوارے چلتے تھے۔'' ایک روز پولی نے مجھ سے اس طرح کہا تھا جیسے بچے ایک دوسرے کو پریوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھیں تو بالکل پھیلی کی پھیلی رہ گئی تھیں۔ اور اس طرح حیدر آباد کی ڈولی بلگرامی ہم سب کے لئے ایک عجیب الف لیلوی کردار بن کر رہ گئی تھی۔ جب وہ پہلی بار اور آخری بار لکھنؤ آئی.....

.....نکلتے جاڑوں کی اس خوشگوار شام، سروری اور اس کے منگیتر نے اپنی منگنی کی خوشی میں بہت بڑی پارٹی دی تھی۔ اور اس میں ڈولی بھی آئی۔ لاؤنج کے ایک سرے پر ایک لوکل انٹلکچوئیل کے قریب بیٹھی وہ بظاہر بڑے اخلاق سے ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ مقامی انٹلکچوئیل بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''ارے وہ دیکھو ایک نیا انٹلکچوا.....'' مہر جبیں نے بے حد بشاشت کے ساتھ مجھ سے چپکے سے کہا۔ انٹلکچوا.....یعنی چھوٹی قسم کی غیر ضروری تھا۔ انٹلکچوئیل جو اپنے آپ کو سپر جینیس سمجھتا ہو.....یہ ہماری خاص اصطلاح تھی۔

''اور وہ کون انٹلکچوئی بیٹھی ہے ان کے قریب.....؟'' آصفہ نے دریافت کیا .....میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے کوئی انٹلکچوئی نظر نہ آئی۔ یعنی اس قسم کی لڑکی جس کی شکل پر فلسفہ اور لٹریچر اور پولیٹکس برستی ہو اور جو ذہنی طور پر انتہائی سپیریر محسوس کرتے ہوئے گویا کہتی ہو.....تم مجھے کیا سمجھتے ہو جی۔ میں ابھی لوئی مک نیس سے مل کر چلی آ رہی ہوں۔

''ارے بھئی وہ جو سرخ ساری پہنے ہے۔'' آصف نے کہا۔

''ارے وہ.....وہ تو ڈولی بلگرامی ہے.....'' میں نے جواب دیا۔

''کون.....؟'' جیمی نے جواب تک قریب کے دیوان پر بیٹھے بظاہر بڑی بے تعلقی سے لاؤنج کے دریچے میں سے نیچے باغ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آواز میں اور بھی زیادہ بے پروائی کا سا انداز پیدا کر کے پوچھا۔

''ڈولی بلگرامی.....تم نے شاید پچھلے سال اسے مسوری میں نہیں دیکھا۔'' میں نے اس سے کہا۔

اور جیمی نے سگرٹ کی راکھ جھٹک کر ایک لمحے کے لئے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ گویا کہتا ہو ن۔ ارے بھئی تم اب تک کہاں تھیں؟

پارٹی اپنے پورے سوئنگ پر جا رہی تھی۔ ہم لوگ لاؤنج کے دوسرے سرے پر ڈولی بلگرامی سے اتنی دور بیٹھے تھے کہ بہت دیر تک اس کا جیمی سے تعارف نہ ہو سکا۔ پھر آل حسن نے ایک پیروڈی پڑھی جو انہوں نے اسی روز لکھی تھی اسے سن کر سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ وہ پیروڈی کچھ اس طرح شروع ہوئی تھی۔

آج بکواس کروں گا میں بھی
یہ مصمم ہے ارادہ میرا
اسی اک بات پہ مدت سے تلا بیٹھا ہوں
تو مجھے روز کہاں ملتی ہے
آج بھولے سے چلی آئی ہے
قہوہ خانے کے شبستانوں میں
قمقمے جس میں جلا کرتے ہیں
اور پنکھوں سے ہوا آتی ہے
بادشاہ باغ کے گلزاروں کی
اور پائپ کا دھواں، میرے پائپ کا دھواں
رقص کرتا ہوا لہراتا ہوا
تیرے رخساروں کو چھو لیتا ہے
ایسے ماحول کی پر ہول فضاؤں میں ابوالہول بنا بیٹھا ہوں

ایک مدت سے تلا بیٹھا ہوں

میری بکواس تو سن

اور تو کچھ بھی میرے پاس نہیں

جذبہ ہے گھاس نہیں

یہی بکواس ہے سرمایہ مرا

تجھ پر پڑ جائے اگر سایہ مرا

تو بھی کالج کی جواں سال حسینہ بن جائے

میرے دریائے محبت کا سفینہ بن جائے

میری بکواس کو اس دور کا شہ کار سمجھ

اپنے پازیب کی جھنکار سمجھ.....!!

ڈولی ہنستی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر ہم لوگوں کے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ اور اپنے دلکش انداز میں پوچھنے لگی۔ ''یہ کس کی پیروڈی کی گئی ہے بھئی؟''

اس نظم سے خصوصیت سے وہی لوگ سب سے زیادہ محظوظ ہو سکتے تھے جو بادشاہ باغ یعنی یونیورسٹی کی مقامی پولیٹکس سے اچھی طرح واقف تھے۔ ٹوڈلز نے نہایت مستعدی سے اس نظم کی بیک گراؤنڈ سمجھانی شروع کی۔ ڈولی اسی اخلاق سے مسکراتی رہی۔ جیمی اسی بے تعلقی سے دریچے کے باہر دیکھتا رہا۔

پھر ہم لوگ باہر آئے اور پیدل گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی دور تک ڈولی ہمارے ساتھ آئی۔

اور اس رات آسمان پر سارے ستارے جگمگا رہے تھے اور باغوں کے سارے

پھول مہک رہے تھے۔اور فضاؤں کی ساری خوشبو دار ہوائیں بہہ رہی تھیں۔

کیونکہ سڑک پر ڈولی بلگرامی جیمی قدوائی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

اور جب لڑکیاں آگے نکل گئیں تو ہوا کی زد سے بچ کر سگریٹ جلانے کے لئے جھکتے ہوئے جیمی نے ٹوڈلز نے چپکے سے پوچھا۔''آج کی رات کتنی خوشگوار ہے ..... ہے نا پارٹنر.....؟''اور ٹوڈلز سر کھجانے لگا۔

ڈولی دس پندرہ روز لکھنؤ میں ٹھہری اور اپنے اس چند روزہ قیام میں اس نے وہاں بھی سنسنی پھیلا دی۔ ہر جگہ اسی کا تذکرہ تھا۔اسی زمانے میں بھائی امجد نے عذرا کی رخصتی پارٹی دی۔اس میں ڈولی کو بھی مدعو کیا گیا۔

اور اس روز ڈولی بلگرامی اور زوئی فرید نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور زوئی فرید نے محسوس کیا کہ ڈولی بلگرامی ہی ''دوسری عورت'' ہے۔ وہ کمبخت ''دوسری عورت''جو ہر جگہ آن ٹپکتی ہے جیمی کے لئے''دوسری عورتیں''ان گنت تھیں۔اور پھر یہ بھی تھا کہ زوئی فرید سے کبھی اس کو زیادہ باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔اور نہ اس نے کبھی اک لمحے کے لئے بھی زوئی کے متعلق سنجیدگی سے سوچا تھا۔لیکن زوئی کو یہی احساس ہوا۔ یہ عجیب بات تھی۔لیکن جیمی قدوائی بھی عجیب آدمی تھا۔ایک تو اس میں یہ مرض تھا کہ وہ اپنے آپ کو شہزادہ گلفام اور راجہ اندر اور کرشن کنہیا تینوں کا چچا سمجھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بس جانے کیسا تھا۔ایک مصیبت تھا۔اس روز کملا کہنے لگی کہ مجھے حیرت ہے زوئی نے اب تک

پارٹی کے اختتام تک ڈولی زیادہ جیمی ہی سے باتیں کرتی رہی اور اس چیز کو عذرا نے بالکل پسند نہیں کیا۔لیکن وہ اگلے ہفتے طہران جا رہی تھی۔اس لئے اس نے

زیادہ پروا بھی نہ کی۔

ڈولی اور جیمی کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھے تھے۔ آخر میں سب وہیں جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں بڑے شوق سے عورتوں کے حقوق پر بحث چھڑ گئی اور معلوم ہوا کہ ڈولی بلگرامی اس محاذ کی بڑی زبردست مجاہد تھی۔ اس کی باتوں سے تو لگ رہا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ دنیا کے سارے آدمی لوگوں کو کالے پانی بھجوا دے۔ ہاتھ ہلا کر وہ جیمی سے کہہ رہی تھی ..... ''سب بکواس ہے۔ تم لوگوں کو تو سب کو ایک قطار میں الٹا لٹکا دینا چاہیے'' ..... ''تمہارا کیا پروگرام کیا ہے ڈولی بلگرامی! ہماری بہنیں تو چاند تک سفر کرنے یا سمندروں میں غوطے لگانے کی قبیل کے ارادے نہیں رکھتیں۔ کیا تم نئی عورت بننا چاہتی ہو؟'' ٹوڈلز نے پوچھا۔

''بالکل۔'' اس نے بے حد یقین کے ساتھ جواب دیا۔

''ہماری زوئی بھی نئی عورت ہے۔'' کملا نے بتایا۔

''قطعی .....'' ٹوڈلز نے کملا کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ سب زوئی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ہنس پڑی۔ ''غالباً اس لئے ٹوڈلز مہاراج کہ کل پکچرز سے واپس آتے وقت اوورکوٹ پہننے میں میں نے تمہاری گیلنٹ امداد قبول نہیں کی تھی .....'' اس نے کہا ٹوڈلز جھینپ گیا۔

''فتح طہران کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے عذرا بیگم .....؟'' نادر نے پوچھا۔

''میں .....؟ میں تو یقیناً کسی پرنس چارمنگ کی آمد کی منتظر ہوں۔ میں یہ 'نئی عورت' بننے کے خوفناک ارادے افورڈ نہیں کر سکتی۔'' عذرا نے جمائی لے کر بے پروائی سے لیکن بے حد ناتوانی کے ساتھ دلاور سورماؤں کے جھرمٹ میں گھری

ہوئی قرون وسطےٰ کی کسی نازک شہزادی کی طرح کہا۔

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''تم کب تک یہاں ہو ڈولی؟'' باہر گیلری میں آتے ہوئے جیمی نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''ابھی کچھ طے نہیں۔ لیکن مجھے تمہارا گروپ بہت پسند آیا ہے۔ بڑے چارمنگ لوگ ہیں۔'' ڈولی نے جواب دیا۔

''شکریہ.....شکریہ.....!! میں نے پیچھے سے گزرتے ہوئے بے حد اخلاق سے اس سے کہا۔ اور دوسرے مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے برساتی کی طرف چلی گئی۔ وہ اور جیمی آہستہ آہستہ برآمدے تک آئے۔

''تم بہت دلچسپ ہو۔ ڈولی بلگرامی۔'' جیمی نے یک لخت اسے اطلاع دی۔

''شکریہ.....تم جانتے ہو میں کیا کرنے والی ہوں اور کیا کر رہی ہوں.....؟'' سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں.....'' جیمی نے جواب دیا..... ''یہ کہ تم مجھے اپنا انتہائی غلط امپریشن دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیکن یقین کرو تم اس میں کامیاب نہ ہو گی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم دراصل اس طرح کی نہیں ہو جیسی تم اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہو۔ تم حقیقت میں میری ان بہنوں ہی کی طرح ہو جن کے دماغ میں خیالات نہیں ٹھنسے ہیں اور.....''

''اور.....؟'' ڈولی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اور .....اور یہ کہ.....میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پڑے گی .....'' جیمی نے آہستہ سے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور جھک کر ڈولی کی کار کا دروازہ

بند کر دیا۔

رات گہری ہوتی گئی۔

کچھ عرصے کے بعد ڈولی واپس چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد جیمی بالکل تبدیل ہو گیا۔ ہمیشہ شور مچانے والا جیمی بالکل خاموش رہنے لگا۔ سب اس کو چڑاتے چڑاتے تھک گئے۔ لیکن اس کی بشاشت واپس نہ آئی۔ دیکھنے سننے والوں نے رائے ظاہر کی۔ جیمی قدوائی بڑی غلطی کر رہا ہے۔ ڈولی جیسی ہوا میں اڑنے والی الٹرا ماڈرن لڑکی کے ساتھ وہ کبھی خوش نہ رہ سکے گا۔ ڈولی کی دنیا اس کی دنیا سے بالکل مختلف ہے اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس سے بے حد اعلیٰ و ارفع سمجھتی رہے گی۔ لیکن جیمی نے جواب دیا۔ بھائیو۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری ان عقلمندی کی باتوں کا شکریہ۔ لیکن تم نے کیا وہ مشہور گیت نہیں سنا کہ ہم احمق ہیں۔ اور ہنستے ہیں..... اور گر جاتے ہیں..... اور ٹو ڈلز نے کہا۔ سوچو تو سہی زوئی کتنی مختلف ہے۔ زوئی فرید جسے دیکھ کر بیہوش ہونے کو دل چاہتا ہے۔ جو ڈولی سے کہیں زیادہ دل کش ہے۔ حالانکہ وہ بھی اپنے متعلق غلط امپریشن دیتی ہے۔ لیکن درحقیقت بے حد اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم وہ ڈولی کی طرح ایسا پوز نہیں کرتی۔ گویا بادلوں میں رہتی ہو۔ اور محض بچارے دنیا والوں پر رحم و کرم کے لئے کچھ عرصہ کے لئے ویولوک سے اتر آئی ہو اور جو گویا کہہ رہی ہو..... میرے لئے راستہ چھوڑو۔ میرے سامنے جھک جاؤ..... میں آ رہی ہوں۔

لیکن جیمی قدوائی یہ سب تبصرے اور نصیحتیں سننے کے لئے موجود نہ تھا۔ گرمیاں آئیں تو ایک ماہ کی رخصت لے کر وہ اوٹی چلا گیا۔ جہاں ڈولی ہر سال اپنے

والدین کے ساتھ جاتی تھی۔

ہمیں بتایا گیا کہ اس کشش کی کئی انتہائی فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی وجوہات بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ڈولی خداوند خدا نے محض اس کے لئے پیدا کی تھی۔ اور اب تک وہ صرف اس کی آمد کا انتظار کرتا رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں پتہ نہیں تھا کہ جیمی قدوائی جو جو عمر بھر سائنس اور انجینئرنگ کا طالب علم رہا۔ اور جو اب پچھلے چھ سات سال سے ای آی آر کے انجنوں کو ٹھیک کرواتا تھا۔ اسے فلسفہ اور مابعد الطبیعات میں کب سے دخل ہو گیا۔ لیکن پولی اصغر نے حسب معمول نہایت برجستگی سے عرض کی کہ تم نہیں جانتیں پوم پوم ڈارلنگ کہ کیا ہوتا ہے۔

..... اور اس رات زوئی نے اپنی سب سے خوبصورت تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر چپکے سے اسے مخاطب کرنا چاہا کہ مس زبیدہ فرید..... تم نے ایک بار کہا تھا۔ کاہے کے لئے یہ دنیا اب تک ختم نہیں ہوئی۔ یہاں پر صرف دل کی کھٹک ہے اور بے پایاں تکلیف۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جمود۔ یہ سکوت۔ مدتیں گذر گئیں۔ برس گذر جاتے ہیں۔ تم نے دعا مانگی تھی۔ کاش وہ کسی اور لڑکی سے زور و شور سے عشق شروع کر دے اور پھر اس سے شادی کر لے۔ کم از کم وہ کسی حادثے میں ختم ہی ہو جائے۔ یا اگر یہ بھی نہیں ہوتا تو کوئی اسے جا کر قتل ہی کر دے۔ ایک مصیبت تھی۔ اس کا وجود۔ اس کا نام، جہاں وہ رہتا تھا۔ اس کا محکمہ۔ اس کے دوست، اس کا خاندان۔ ہر وہ چیز جس کا اس سے کہیں دور کا بھی تعلق یا واسطہ تھا۔ یہ سب کچھ تمہارے لئے ایک مستقل قیامت ایک مسلسل سوہان روح بن چکا تھا۔ اب جا کر یہ کرب ختم ہوا۔ اور اب بادشاہ کے سارے گھوڑے اور بادشاہ کے سارے

آدمی بھی مل کر تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔ آؤ میں تمہیں پوم پوم کے گھر لے چلوں جہاں اس وقت ان سب کا کراؤڈ حسب معمول جمع ہو گا اور..... رفیعہ کارمن میرانڈا کا کوئی گیت گا رہی ہو گی اور کارمن میرانڈا کا گیت اس وقت تمہارے لئے یقیناً بے حد مفید ثابت ہو گا۔

.....اور زوئی فرید آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہمارے نشست کے کمرے میں داخل ہوئی جہاں سب حسب معمول آتشدان کے گرد۔ اور وسط کے بڑے سرخ قالین پر اور صوفوں کے سہارے اور دریچوں میں بیٹھے بقول پولی گپا سٹک میں مشغول تھے۔ ہفتے کی رات تھی۔ دوسرے دن چھٹی تھی۔ ٹوڈلز نہایت تندہی اور سنجیدگی سے گتار بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور رفیعہ گا رہی تھی۔

ٹوڈلز کے گتار کی زور زور کی بے سری جھنکار کے ساتھ اس نے گیت ختم کیا۔ اور حسب معمول خوب تالیاں بجیں اور پھر سب زوئی کی طرف متوجہ ہو گئے اسے بڑی شگفتگی کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا اور اندر نے اسے کیرم میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ لیکن وہ املا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

.....وہ سب وہاں تھے۔ لیکن سب کا چہیتا، جیمی قدوائی وہاں نہیں تھا۔ وہ عین اس وقت انہی لمحات میں وہاں سے ہزاروں میل دور جنوب کے جنگلوں اور دریاؤں اور گھاٹیوں کے پرے۔ نیلگری کی پہاڑیوں پر موجود تھا اور یہ بے حد عجیب بات تھی۔ اسے یقیناً اس وقت یہ کمرہ یاد آ رہا ہو گا۔ یہ کمرہ اور یہ لوگ۔ یہ کمرہ اس کے بڑے بڑے نیچے صوفے۔ پرانے سرخ پردے۔ کونوں میں رکھے ہوئے اور اونچے لیمپ جن کی آرام دہ روشنی میں انہوں نے اتنی شامیں اکٹھی

گزاری تھیں۔ ان سب چیزوں کا خالص اپنا پن ان کی طمانیت بخش مہک، ان کا وجود اس کے وجود میں رچ چکا تھا۔ وہ ان چیزوں سے کبھی علیحدہ نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن ایک اجنبی دیس کی اجنبی لڑکی وہاں آئی اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اجنبی دیس کی لڑکی جس کے باپ کے گھر میں بلوریں فوارے چلتے تھے۔ جیمی قدوائی کو یقیناً یہ کمرہ دیا ہوگا۔ یہ کمرہ اور یہ لوگ جو اس کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ لیکن محض اخلاقاً خاموش تھے۔ یہ جیمی قدوائی کا بالکل نجی معاملہ تھا۔ اور اس میں کسی کو دخل دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ بالکل جس طرح اپنے جوتے خریدنا، اپنے کلب کی فیس ادا کرنا، یا صبح کو فروٹ سالٹ پینا قطعی اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اور اس میں اسے کسی کی رائے درکار نہ تھی۔ وہ بہر حال اپنے پرانے گروہ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کوئی اسے نہ روک سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر وہ اوٹی جانے کی بجائے سرکس میں نوکر ہو جاتا یا ایکٹر بن جاتا تو اسے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹوڈلز کا چچا زاد بھائی اندر۔ املاسر یواستو سے شادی کرنے کی بجائے سربلراج سنگھ کی اکلوتی لڑکی پدم سے شادی کر رہا تھا۔ جو اس کے مذہب سے بھی تعلق نہ رکھتی تھی۔ لیکن یہ بھی اس کا اپنا معاملہ تھا۔ اور کوئی اس میں دخل نہ دے سکتا تھا یہ خالص اس کا اپنا معاملہ تھا۔

.....رات بھیگتی جا رہی تھی۔ جب زوئی فرید اس سرخ قالین والے تکلیف دہ کمرے سے نکل کر باہر آئی اور پہلو کے سنسان برآمدے کے جنگلے پر جھک کر باغ کے اندھیرے کو دیکھنے لگی اور فضا کے بھاری اور بھیگے پن کو اس نے

محسوس کیا۔ اوپر گہرے، اندھیرے آسمان میں مدھم اور تاریک اور تیز روشن سیارے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اور ہوا درختوں میں کاہلی سے سرسرا رہی تھی۔ یہ سب چیزیں جن کے وجود کے احساس سے ڈر لگتا ہے وہ رات کی خوشبو اور اندھیارے میں وہاں کھڑی بچوں کی طرح آنکھیں جھپکاتی رہی۔ اندر رفیعہ نے کوئی اور گیت شروع کر دیا تھا۔ ٹوڈلز اسی طرح نہایت کوشش سے گٹار بجا رہا تھا۔ شاید وہ سب کوئی پرانا انگریزی کورس گا رہی تھیں۔ جو عموماً سالگرہ یا منگنیوں کے موقعوں پر خوب چلا چلا کر گایا جاتا ہے۔ اور وہ سب یقیناً اس تہنیت کے نغمے میں اندر اور پدم بلراج سنگھ سے مخاطب تھے۔ وہ دیر تک برآمدے کے جنگلے پر جھکی رہی۔

جیمی اس وقت بہت دور تھا۔ بہت، بہت دور، اور شاید وہ اس پرانی دنیا کو بھولتا جا رہا تھا۔ لیکن گہری راتوں کے ایسے ہی خاموش لمحات میں اسے یک لخت بڑی تکلیف دہ شدت سے یہ سب لوگ یاد آ جاتے۔ کملا اور ٹوڈلز اور یہ سب دلچسپ، پرخلوص لوگ۔ اور وہ سوچتا۔ مجھے ان کی فکر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بالکل میرا اپنا کاروبار ہے۔ وہ سب لاکھ میرے خیر خواہ سہی۔ لیکن بھلا سوچو تو مسٹر جمیل الدین قدوائی کہ تم نے آج تک کیا کبھی پوم پوم سے یہ کہا تھا کہ پوم پوم بٹیا یہ نیلے رنگ کی ساری نہ خریدو۔ یا آبی رنگ کے لباس نہ پہنا کرو۔ ساریوں کا انتخاب اور خریداری یا سلیکس کا پہننا یا نہ پہننا بالکل اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی خالص میرا ذاتی کاروبار ہے۔

دن گزرتے گئے۔ لیکن جیمی واپس نہ آیا۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے اختتام پر وہ

اوٹی سے سیدھا دارجلنگ چلا گیا۔ جہاں اس کا تبادلہ ہو گیا تھا۔

اور ٹوڈلز نے بڑے دکھ کے ساتھ نادر سے کہا۔ ''نادر بھائی دیکھو تو بھلا کبھی ایسا کہیں ہوا تھا کہ جیمی اس لڑکی کے مارے ہم سب کو بھول گیا۔ حد ہے بھئی۔''

اور نادر بھی بڑے دکھ سے سر ہلاتا۔ اور اسے ڈولی بلگرامی کا سوئمنگ پول یاد آ جاتا اور اس کا نیلے رنگ کی روغنی دیواروں والا دیوان خانہ، جس میں بلوریں فوارے چلتے تھے۔ جو اس نے حیدرآباد میں دیکھا تھا۔ اور وہ ٹوڈلز سے کہتا۔ ''بھائی ٹوڈلز ایسا ہی ہوتا ہے۔ جبھی تو میں اب دنیا کو رفتہ رفتہ تیاگ رہا ہوں۔ میں اپنے پانچوں کتوں کو لے کر ہمالیہ کی طرف نکل جاؤں گا۔ میرے یہ پانچوں اسپنیل رفیق انسانوں سے اور خصوصاً کمبخت لڑکیوں سے بہر حال لاکھ درجے بہتر ہیں۔''

اور ٹوڈلز ٹھنڈی سانس بھر کر نادر کی رائے سے دلی اتفاق ظاہر کرتا۔ اور اسے زوئی فرید کا خیال آ جاتا جسے دیکھ کر بے ہوش ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔ اور پھر وہ دونوں فلسفیوں کی طرح سر ہلا کر خاموشی سے سگرٹ کے دھوئیں کے حلقے بناتے بناتے مراقبے میں چلے جاتے۔ کیونکہ نادر بھی ٹوڈلز کی ناؤ میں سوار تھا اور بے حد دکھی تھا۔ اسی شام اس نے رفیعہ کو بظاہر بے حد بے تعلقی سے بھائی امجد سے یہ کہتے سنا تھا کہ وہ عنقریب ٹرنٹی کالج میں داخلے کی غرض سے ولایت جا رہی ہے۔ اور وہ یہ بات اس انتظام سے کہہ رہی تھی کہ دوسرے کمرے میں موجود نادر بھی سن لے اور ساتھ ساتھ اس کے اس بے پروائی کے لہجے کو بھی نوٹ کرتا جائے۔

''یہ لڑکیوں کا ولایت جانے کا نسخہ بھی خوب ہے پارٹنر۔ افوہ۔ کہہ دیا کہ ولایت جا رہی ہیں۔ گویا ٹرنٹی کالج میں بس صرف ان کے شامل ہونے کی کسر ہے۔ جب

کسی ہماری تمہاری طرح کے احمق کو محض امید و بیم کی حالت میں سفید و لائی چوہے کی طرح لٹکائے رکھنے کو جی چاہا، فوراً ناک اونچی کر کے بے حد بے تعلقی کے ساتھ ارشاد کر دیا کہ ابھی تو میں دنیا میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو میں موسیقی میں ٹرنٹی کالج کا ڈپلوما لوں گی۔ پھر ممکن ہے اوکسفورڈ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے داخل ہو جاؤں۔ ہونہہ..... پی۔ ایچ۔ ڈی مائی فٹ.....'' نادر نے غصے سگریٹ کی راکھ جھٹکی اور پھر چپ ہو گیا۔

''میں تمہارے اس حق بجانب غصے کو خوب اچھی طرح ایپری شی ایٹ کرتا ہوں پارٹنر۔'' ٹوڈلز نے بے حد ہمدردی کے ساتھ اس سے کہا۔ اور وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراقبے میں چلے گئے۔

پھر دیوالی کی رات آئی۔ ہر سال دیوالی پر ہم بہت بڑا ڈنر دیا کرتے تھے اور یہ ہماری آخری دیوالی کی رات تھی۔ پچاس ساٹھ مہمانوں کا مجمع گھاس کے قطعوں پر اور برآمدوں میں اور کمروں کے اندر دیوں کی روشنی میں ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے برقی روشنیاں بجھا دی تھیں اور صرف موم بتیوں اور دیوں کی روشنی سارے کمروں میں جھلملا رہی تھی۔ اور باغ کے ایک کونے میں ٹوڈلز گٹار بجا رہا تھا۔ ہم سب نے رنگ برنگی زرتار ساریاں پہن رکھی تھیں اور زوئی نے اپنے بالوں میں سرخ پھول لگائے تھے۔ اور ایسے میں سب کو جیمی معمول سے زیادہ شدت سے یاد آیا۔ لیکن سب بظاہر خوش خوش قہقہے لگاتے ادھر ادھر اور باغ کے پھاٹکوں اور برساتی اور برآمدوں کی چھتوں پر دیے جلاتے پھر رہے تھے۔ دو دن بعد اندر اور پدم کی شادی ہونے والی تھی۔ اور اندر نے املا کو دیکھا جو اپنے منگیتر کے ساتھ، جو

اسی پارٹی کے لئے دہلی سے پرواز کر کے آیا تھا۔ بظاہر بے حد دلچسپی سے باغ کی سیڑھیوں پر دیے جلانے میں مصروف تھی اور اندر نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر اسے دیکھا گویا کہتا ہو: مجھے معلوم ہے میری جان تم اس کالے بھجنگے بہاری سے محض مجھ سے انتقام لینے کے لئے شادی کر رہی ہو۔ لیکن میں کیا کروں۔ بھئی میں مجبور ہوں اور نادر نے اندر کو دیکھا۔ کیونکہ نادر خود بہت دکھی تھا۔ اور وہ دونوں ٹوڈلز کی طرف چلے گئے۔ جو لیموں کے درخت کے نیچے گٹار بجانے کی سعی میں مشغول تھا۔

اور اس شام رفیعہ سارا وقت سب سے بے حد انہماک سے محض اپنے پاسپورٹ اور اپنے ٹرنٹی کالج کی باتیں کرتی رہی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد کمینی ہے۔ اور آدھی رات گئے مہمانوں کے جانے کے بعد جب صرف گھر کے لوگ اور ٹوڈلز اور چند اور دوست ہی باقی رہ گئے اور رفیعہ بھی چلی گئی تو نادر نے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے بجھتے ہوئے دیوں کی روشنی میں آہستہ سے کہا ..... ''تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں جتنا بے وقوف یہ رفیعہ زاہدی مجھے سمجھتی ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ اب میں اشتراکی پارٹی کا کام کیا کروں گا۔''

''نہایت مبارک اور نیک خیال ہے.....'' بھائی امجد نے سنجیدگی سے جواب دیا سب ہنس پڑے۔

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔'' نادر جوش سے کہتا رہا ..... ''جتنا اندر ہے جو اپنے فرقے کے خلاف جا کر پدم سے شادی کر رہا ہے۔ جو عیسائی ہے اور ہمیشہ

عیسائی رہے گی۔ یہ سول میرج کے معاہدہ کی مفروضہ لامذہبیت سب بکواس ہے۔ لیکن اندر جانتا ہے کہ پدم کے ڈیڈی عنقریب کسی صوبے کے گورنر بنائے جانے والے ہیں۔ اور وہ ٹھاٹھ کرے گا املا کے بابا افسوس کہ زندہ نہیں۔ اگر انکل سر یواستو زندہ ہوتے اور سر بلراج سنگھ کے بجائے وہ گورنر بنائے جا رہے ہوتے تو یقین کرو اندر فوراً املا سے شادی کر لیتا اور رفیعہ سمجھتی ہے کہ میں بھی اندر کی طرح کا ہوں اور اس کی امارت اور اس کے ٹرنٹی کالج کے ارادے سے مرعوب ہوں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اور میں اب جنتا کی خدمت کیا کروں گا۔ اور..... اور..... اور۔ افسوس کہ اس دنیائے فانی میں خلوص اور جذبات کی قدر نہیں۔ ٹرنٹی کالج..... ہونہہ..... فڈل اسٹکس.....'' اتنا کہہ کر وہ بے حد رنج کے ساتھ بجھتے ہوئے دیوں کو دیکھنے لگا۔

''لیکن نادر.....'' ٹوڈلز نے کچھ کہنا چاہا۔

''ہونہہ.....'' اس نے ٹوڈلز کی بات کاٹ دی۔ رفیعہ سمجھتی ہے کہ مجھے بھی جیمی قدوائی کی طرح کا سورما ہونا چاہیے تاکہ میں اس کے مارے جیمی قدوائی کی طرح گھر بار اور عزیز و اقارب چھوڑ کر افریقہ چلا جاؤں۔''

''لیکن نادر جیمی قدوائی افریقہ نہیں گیا ہے۔ دار جلنگ گیا ہے جو سنا ہے کہ بے حد دلچسپ جگہ ہے۔'' میں نے آہستہ سے اسے یاد دلانا چاہا۔

''ہوگی۔'' اس نے غصے سے مجھے جھڑک دیا۔ ہم سب چپ ہو گئے۔

''نادر تم اتنے بڑے گدھے ہو۔'' پولی اصغر نے سب سے اونچی سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے کچھ دیر بعد ہاتھ پھیلا کر اشارہ کرتے ہوئے بنایا..... ''گو یہ دوسری بات ہے

کہ جیمی قدوائی بھی تم سے کچھ چھوٹا گدھا نہیں ہے۔ نادر بھیا تم اشتراکی، اشتمالی، دہشت پسند، کانگریسی، لیگی جو چاہو بن جاؤ۔ لیکن خیال رہے جو لوگ محبت میں مایوس ہو کر آئیڈیلزم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ محض اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ تم سے تو یقیناً تمہارے پانچوں کتے عقلمند ہیں۔ جنہوں نے اب تک کسی پارٹی میں شامل ہونے کا پروگرام نہیں بنایا۔ تمہیں شمی سپرو یاد ہے۔ جو برج مالا جوشی کے واقعے کے بعد، بورژوا لڑکیوں کی ذہنیت پر، دو تین لیکچر پلانے کے بعد پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ اور اب ساری دنیا کو گالیاں دیتا ہے..... میں اس وقت تم سب کو بتاؤں نادر میں اگر جذباتی طور پر اتنا ہی لڑکپن کچھ عرصے تک اور موجود رہا تو یہ کیا کرے گا.....؟ یہ بھی ہم سب کو چھوڑ کر چلا جائے گا..... مثلاً بمبئی.....''

''اور پھر ..... پھر میں کیا کروں گا۔ تمہارے خیال میں۔ تم افلاطون کی نواسی.....؟'' نادر نے غصے اور دلچسپی کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

''پھر غالباً تمہیں ایک روز ایک کامریڈ مل جائے گی۔'' پولی اصغر نے بالکل پیغمبرانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''جو تمہاری ہی طرح اپنے خیال میں دنیا سے لڑ کر اپنے آئیڈیلز کے لئے میدان میں آئی ہو گی اور اس کے مقابلے میں تمہیں رفیعہ کی محبت انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے گی۔ اور پھر تم اس سے شادی کر لو گے۔ اور ایک چھوٹا سا فلیٹ لے کر رہنے لگو گے۔ اور محسوس کرو گے کہ تم دونوں کے سروں کے گرد نور کے ہالے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس قدر اعلیٰ و ارفع محسوس کرو گے۔ پھر وہ گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے کسی اسکول یا کسی اخبار میں نوکر ہو

جائے گی اور شام کو تمہارے دوستوں کے ساتھ سوشلزم بگھارا کرے گا۔ اور ان کے لئے کافی بنائے گی اور جب وہ اس مستقل پکنک قسم کی زندگی گذارتے گذارتے اکتا جائے گی تو ایک سہانی صبح کسی اور تخیل پرست کے ساتھ اپنے چند اور آئیڈیلز کی تلاش میں کہیں اور چلی جائے گی تم ہم لوگوں سے نفرت کرنے لگو گے۔ لیکن ہم تم سے نفرت نہیں کریں گے کیونکہ ہم انسانی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ اور انہیں معاف کرنے کے لئے تیار ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے پولی نے انتہائی سنجیدگی سے آنکھیں بند کرلیں۔ ہم سب ہنسنے لگے۔

''زندگی کے متعلق تمہارا بہت ہی کمینہ نظریہ ہے پولی اصغر۔'' نادر نے رنج سے کہا۔

''ہر نظریہ جذباتی ہوتا ہے۔'' پولی نے کہا۔ ورنہ صرف تین چیزوں سے تمہارے ذہن اور دل کو سکون حاصل ہوسکتا ہے۔ کیتھولک چرچ۔ کمیونزم۔ یا پھر یوگا۔ اور کیا پتہ جیمی قدوائی نے اس وقت کنچن چنگا کی چوٹیوں پر یوگا سے رجوع کر لیا ہو!''

یہ سوچ کر سب کو ہنسی آ گئی۔

.....جیمی کنچن چنگا کی چوٹیوں کے قریب تھا لیکن اس نے یوگا سے رجوع نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت سوچ رہا تھا میرے گھر والے اور میرے ساتھی جانے اس سمے کیا کرتے ہوں گے۔ یہ دیوالی کی رات ہے۔ کاش میں اس وقت ان کے ساتھ ہوتا لیکن وہ وہاں سے بہت دور تھا۔ ڈولی بلگرامی نے اسے اس دنیا سے کھینچ کر ایک دوسری دنیا میں لا ڈالا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ اب کیا

کرے۔ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے اس وقت اسے اس گھر اور اس کمرے کی ایک ایک چیز تفصیل سے یاد آ رہی تھی۔ جس میں اس سمے اس کے سارے ساتھی دیوالی کی رات جمع تھے۔ گلاب کے عنابی اور تیز سرخ پھول اور سبز پتے اور اس کا چوڑا گہرا سبز حاشیہ اور ڈرائنگ روم کے سرخ پردے جس پر اسی طرح کے گلاب کی بیلیں کڑھی تھیں۔ اور لیمپوں کے گلابی شیڈز میں سے چھنتی ہوئی تیز روشنی میں جیسے یہ قالین جاگ اٹھتا تھا۔ اور پھر پہلو کا وہ چوڑا برآمدہ جس کے شفاف فرش پر وہ لکڑے کے گھوڑوں کی ریس کھیلا کرتے تھے۔ اور ڈرائنگ روم کے وہ پرانی وضع کے سرخ صوفہ سیٹ۔ اور آبنوس کی لکڑی کا وسیع اور گہرا آتشدان جس کے اوپر بالی کے ایک رقاص کا بڑا سا رومنی پورٹریٹ رکھا رہتا تھا اور جنوبی ہند کے مندروں کے چھوٹے چھوٹے نمونے اور ایک پیگوڈا، اور ایک کونے میں عجیب وغریب چینی نقوش والی پرانی اسکرین جس کے پیچھے ریکارڈوں کے البم اور لکڑی کے گھوڑے اور دوسرا الم غلم پڑا رہتا تھا۔ جو پارٹیوں پر نکالا جاتا تھا۔ اور گیلری کے سرے پر وہ کمرہ تھا۔ جس کے دروازہ پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا تھا۔ اور جو پوم پوم کے والد کے انتقال کے بعد سے زیادہ تر اسی طرح بند رہتا تھا۔ اور جس میں ان گنت کتابیں بند تھیں اور اکثر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ موم بتی کی روشنی میں اطمینان سے اس کمرے کے فرش پر بیٹھ کر یہ کتابیں پڑھنی شروع کر دے اور پڑھتا چلا جائے۔ یہ پراسرار فرانسیسی، جرمن، ترکی اور انگریزی کتابیں۔ اکثر جب وہ وہاں اکیلا موجود ہوتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس سرخ قالین والے نشست کے کمرے کی مدھم روشنی میں ابھی یہ بالی کا رقاص آتشدان پر سے چھن چھن کرتا اتر آئے گا۔ اور

تانبے کا خدائے رقص جس کے چھ ہاتھ ہیں اور اسکرین پر کڑھی ہوئی ترچھی آنکھوں والی پیکن کی شہزادیاں۔ اور یہ سب ہاتھ میں ہاتھ دے کر رات کی گہرائی میں رقص شروع کر دیں گے۔ کوئی گجراتی گربا۔ جس طرح پوم پوم اور اس کی سہیلیاں کرتی تھیں۔ واگے بندرا بن ماں بانسریا کھوب کھوب بجا دینا۔ رے واگے بندا بن ماں..... اور وہ سب زندگی کے، دنیا کے خاتمے تک اسی طرح ناچتے چلے جائیں گے۔

اور جیمی کو یہ کمرہ اسی شدت احساس کے ساتھ یاد تھا۔ اور دیوالی کی اس رات دارجلنگ کے ڈاک بنگلے میں بیٹھے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔

وہ یہ سب سوچتا رہا لیکن عجیب بات تھی کہ اسے زوئی فرید بالکل یاد نہ آئی۔ زوئی فرید جس کے لئے ٹوڈلز نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا کہ اسے دیکھ کر بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے.....

اور دیوالی کی اس رات برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے خوش دلی سے ''گپا سٹک'' کرتے ہوئے ان بشاش لوگوں کو دیکھتے ہوئے زوئی فرید نے یک لخت کچھ طے کیا۔ وہ مر جائے گی۔ اس نے محسوس کیا۔ اسے یقین ہو گیا اسے قطعی طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ اور صبح کاذب کی جھلک سرو کی قطاروں کے پرے نمودار ہونے والی تھی۔ جب دلہن بھابی نے تجویز پیش کی کہ اب تو سونے

کے لئے چلنا چاہئے۔ سب کو ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔

''ہاں بھئی اب اٹھو ورنہ سب کو نمونیہ ہو جائے گا۔'' نادر نے سیڑھیوں پر سے کود کر نیچے اترتے ہوئے بے حد شگفتگی سے کہا۔

زوئی نے برساتی کے آخری ستون کے قریب بیٹھے بیٹھے ان سب کو دیکھا۔ فش ..... اس نے دل میں کہا ..... یہ لوگ ..... جو زندگی کے جذباتی نظریوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ جذباتی نظریے ..... مائی افٹ ٹو ..... انہیں کیا پتہ زندگی کیا چیز ہے۔ زندگی محض موت کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کے اس دوسرے حصے میں میں اب شامل ہو جاؤں گی او گوش ..... اس نے اٹھتے ہوئے سوچا ..... مجھے کافی سردی محسوس ہو رہی ہے یہ لوگ تو مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے واقعی نمونیہ ہو جائے گا ..... اور ..... یہ کتنا اچھا ہوگا۔

سب اندر چلے گئے۔ برآمدے کے جنگلے پر جھک کر اس نے آخری بار پھر باہر باغ کے اندھیرے کو دیکھا۔ مجھے معلوم ہے۔ اس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا۔ مجھے معلوم ہے وہ جنگل کہاں ہیں ..... وہ پہاڑ ..... وہ ندیاں ..... وہ جگہیں ..... جہاں زندگی ہے۔ اور روشنی۔ اور نور۔ اور امن۔ افسوس میں وہاں تک پہنچ نہیں سکتی۔ میں نے ان چیزوں کو صرف محسوس کیا ہے۔ لیکن چونکہ میں ان چیزوں کو محسوس کر چکی ہوں۔ اس لئے میں اطمینان سے مروں گی۔

باہر ہوا تیزی سے چلنی شروع ہو گئی تھی اور باغ کے درختوں کی ڈالیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر مبہم سا شور کر رہی تھیں۔ جس طرح موت کا بدمزاج خدا آوارہ روحوں کو اپنے ساتھ اندھیارے میں آگے لئے جا رہا ہو۔

پھر وہ اپنے گھر چلی گئی اور صبح تک اسے سچ مچ انفلوئنزا ہو گیا۔ پھر اس انفلوئنزا نے برانکائٹس کی شکل اختیار کر لی۔ پولی جب اس کی مزاج پرسی کے لئے گئی تو اس نے خلاف معمول اسے بےحد خوش پایا۔

زوئی کئی ہفتے تک بیمار رہی اور پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ گھنٹوں سوچا کرتی۔ جب وہ مرے گی۔ اس کے سرہانے موم بتیاں جگیں گی۔ کاش اس وقت کوئی بیتھوون کا نغمہ بھی بجا دے۔ اور پھولوں سے وہ ڈھک جائے گی اور اس کی قبر کے سرہانے سیب کے شگوفے اگیں گے اور جنگل کی کنواریاں بہار کی صبحوں کو وہاں پھول جمع کرنے آیا کریں گی۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ کروٹ بدل کر وہ پھر تصور میں کھو جاتی..... پھر یہ ہوگا کہ مرنے سے پہلے وہ ای خط لکھے گی اور جب ٹوڈلز اس کی عیادت کے لئے آئے گا تو وہ اس سے کہے گی بھائی ٹوڈلز تم میرا ایک کام کر دو گے؟ جب میں ختم ہو جاؤں تو یہ خط جو میں نے لکھا ہے اس پتے پر پوسٹ کر دینا اور ٹوڈلز کہے گا۔ کیسی حماقت کی باتیں کرتی ہو زوئی رانی۔ تم زندہ رہو گی۔ ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ اور یہ سن کر وہ مسکرائے گی۔ ایک تھکی ہوئی بےنیاز، بےتعلق سی مسکراہٹ گویا اب وہ دنیا والوں کی ان حماقتوں سے بہت علیحدہ بہت بلند ہے۔ اب دنیا کا کوئی غم، کوئی مایوسی اس پر اثر نہیں کر سکتی۔ اور وہ اسی طرح مسکرا کر آنکھیں بند کر لے گی۔ اور بچارہ سوئیٹ ٹوڈلز اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دریچے سے باہر دیکھنے لگے گا۔ اور وہ خط۔ وہ اپنا پہلا اور آخری خط..... نسائیت کے غرور اور عزت نفس کے سارے تصورات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ خود اسے مخاطب کرے گی۔ وہ اس کو لکھے

گی۔تم جانتے ہوتم نے کیا کیا ہے؟تم نے ایک زندگی تباہ کر دی ہے۔لیکن شاید تمہیں اس کا احساس، اس کی پروانہیں۔تم اسی طرح ہنستے رہو، خاموش، پراسرار آدمی۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ تم مر جاؤ۔لیکن اب میں ہی مر رہی ہوں۔اس لئے سب معاملہ ٹھیک ہے۔اے کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ اتنی مدت تک کس شدت کے ساتھ تمہاری پرستش کی جاتی رہی۔کس شدت کے ساتھ عمر بھر تمہاری پرستش کی جاتی۔کاش تمہیں اس کا خیال آتا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غالباً ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں اب ختم ہو رہی ہوں۔اور خدا حافظ..... یہ خط اسے ملے گا۔اور اسے یقیناً بڑا تعجب ہوگا۔ممکن ہے اسے یہ خط بے حد دلچسپ، بیحد ٹریجک معلوم ہو۔اور وہ افسوس کے ساتھ اپنے کسی دوست سے کہے۔ چچ چچ چچ بچاری جذباتی لڑکی۔صحیح طور پر رومینٹک تھی۔غریب مرگئی۔ برا ہوا۔لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔پارٹنر۔اور میں تو اپنے آپ کو اس وقت بے حد کسی جذباتی قسم کے ناول۔یا بلو ڈرامہ کا ہیرو سمجھ رہا ہوں۔لیکن بہر حال جو کچھ بھی ہوا برا ہوا۔ بے حد رومینٹک دماغ پایا تھا۔ اس نے..... بچاری..... اور ذرا سوچو کہ میں خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے اس قصے میں INVOLVE ہو گیا۔'' غالباً اسی قسم کی باتیں وہ کلب میں اپنے ساتھیوں سے کرے گا۔اور پھر ٹینس کھیلنے چلا جائے گا۔اور یہ خط اسے احساس بھی نہ ہوگا کہ جذبات اور ٹریجڈی اور لٹریچر کے لحاظ سے اپنی جگہ پر اس مغربی مصنف کے مشہور افسانے ''اجنبی عورت کے خط'' کی ٹکر کا شاہکار ہے۔اگر صرف ایسا ہو جائے۔اگر ایسا ہو جائے..... کاش وہ اس بیماری میں ختم ہو جائے..... اسی طرح لیٹے لیٹے اسے وہ شام یاد آئی۔ جب شام کے جھٹپٹے میں وہ سب ٹو ڈلز کے ڈرائنگ روم میں

قالین پر بیٹھے گپ میں مصروف تھے۔صبح کو ٹو ڈلز کہیں باہر جانے والا تھا۔اور ان سب نے مل کر جلدی جلدی اس کا سامان پیک کیا تھا۔اور لیمپ کی روشنی میں فرش پر بیٹھ کر، انہوں نے خود چائے بنائی تھی اور اتنے اچھے لمحات گذارے تھے اور ٹو ڈلز سب کو کسی کتاب کے چند حصے پڑھ کر سنا رہا تھا اور ادبیات پر باتیں کرتے کرتے اسی افسانے کا ذکر آ گیا تھا اور ٹو ڈلز نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا تم نے ''اجنبی عورت کا خط'' پڑھا ہے۔اس وقت اسے کیا پتہ تھا کہ ستاروں کی ستم ظریفی سے ایک وقت ایسا آئے گا کہ اسے خود ایسا خط لکھنا پڑے گا.....

اور یہ سب سوچتے سوچتے یک لخت اسے ہنسی آ جاتی۔اور وہ تکیوں میں منہ چھپا کر سوچتی۔حد ہے میں بھی حماقت کی انتہا کر رہی ہوں۔کیا کیا نفیس خیالات دماغ میں رہے ہیں۔حد ہے کیا میں بھی ایسی انتہائی تھرڈ کلاس پھٹیچر باتیں سوچ سکتی ہوں۔کہاں کامرنا اور کیسا خط.....لاحول ولاقوۃ.....توبہ توبہ توبہ.....تم نے بھی پڑھ لکھ کر سب گدھے پر لاد دیا زبیدہ بیگم.....لٹیا ہی ڈبو دی بالکل.....چچ چچ چچ.....

زوئی کچھ عرصے بعد تندرست ہوگئی۔

پھر ہم نے سنا کہ ڈولی بلگرامی کے ابا میاں نے جیمی کی درخواست کو بھی نامنظور کر دیا کیونکہ وہ بھی کسی یار جنگ کا بیٹا نہیں تھا اور صرف آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا اور آٹھ سو روپے ڈولی کے لئے کچھ بھی حقیقت نہ رکھتے تھے۔چنانچہ جیمی بہت ہی دل شکستہ ہو کر دار جلنگ سے وطن لوٹ آیا۔

.....لیکن جب وہ لوٹا ہم لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں نہ تھا۔ہماری پرانی

کوٹھی بند پڑی تھی۔ سرخ قالین والے کمرے۔ اور لکڑی کے گھوڑوں پر گرد جم گئی تھی۔ دنیا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ تقسیم کی خونی آندھی آ کر نکل چکی تھی۔ سب خزاں زدہ پتوں کی طرح دور دور سارے عالم میں تتر بتر ہو گئے تھے اور جیمی کو تعجب ہوا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے، محسوس کرنے اور جھیل لینے کے باوجود اب تک کس طرح جی رہا ہے۔ سب کس طرح جیئے جاتے ہیں۔

لیکن ہم یقیناً زندہ تھے اور اس وقت کھانے کے بعد اپنے اس نئے ملک میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ اور اسٹیشن سے واپسی پر نادر بچوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے کلب اور..... ''اچھن یار جنگ'' اور جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا۔ اور پولی کہہ رہی تھی۔ ''بھئی واہ۔ جیمی کی نئی جائے قرار کا نام کس قدر دلچسپ ہے..... گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ گویا ہم سب ہمیشہ سے اسی جگہ اسی طرح رہتے آئے ہوں۔ انسان کتنی جلدی اپنی ساری تکلیفیں، ساری پریشانیاں بھول کر نئے حالات اور نئے ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے۔

دوسری صبح، پولی حسب معمول ٹنک میں مشغول تھی اور میں نادر کے پانچوں کتوں کو ناشتہ کرا رہی تھی۔ مجھے ان پانچوں اسپینل کتوں سے ازلی نفرت ہے، ان پانچوں کم بختوں کو نادر نے تقسیم کے بعد خاص طور پر ہوائی جہاز کے ذریعہ وطن سے منگوا لیا تھا۔ اور بمبئی تک ان کا استقبال کرنے خود گیا تھا۔ اور صبح سے شام تک وہ ہر شخص کو ان کے تذکرے سے بور کرتا رہتا ہے۔ یہاں آ کر بھی اسے کسی کام سے کسی دوسرے شہر جانا پڑا تو وہاں سے اس نے ایک بے حد مفصل خط میں ان کے اوقات کا نظام بنا کر بھیجا کہ انہیں اس وقت ہوا خوری کروائی جائے۔ اس

وقت سلایا جائے۔ اس وقت موسیقی سنوائی جائے تا کہ فنون لطیفہ سے انہیں انسیت پیدا ہوا۔ اس وقت خواتین کی سوسائٹی میں 'بی ہیو' کرنے کے آداب سکھلائے جائیں، اور یہ تاکید تھی کہ اس ٹائم ٹیبل پر باقاعدہ عمل ہو۔ نادر کہتا ہے کہ اب وہ حیات انسانی پر ان کتوں کے زاویہ نظر سے ایک مقالہ لکھنے والا ہے جو ایک بے حد قیمتی اور قابل قدر چیز ہوگی۔ شروع شروع میں جب وہ پانچوں یہاں آئے تو اپنے پرانے برآمدوں اور لان اور پرانی مانوس جگہوں کو نہ پا کر وہ انتہائی دل دوز انداز میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر روتے۔ پھر جب انہیں کاٹھیاواڑی مہتر نہلانے آتا اس وقت بھی غالباً وہ اپنے پرانے مہتر جیتو کو یاد کر کے رونا شروع کر دیتے۔ عین اس وقت جب میں پولی سے لڑنے جھگڑنے کے بعد بیٹھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اور تب میرا جی چاہتا کہ ان کے پاس بیٹھ کر میں بھی ان کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔

چنانچہ اس وقت میں نادر کے ٹائم ٹیبل کے مطابق نہایت مستعدی سے ان پانچوں فلسفی اسپینل کتوں کو ناشتہ کروا رہی تھی کہ میں نے دور پہاڑ کی طرف سے زوئی فرید کو آتے دیکھا۔ اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کل ہی ہم نے زوئی فرید کے متعلق باتیں کی تھیں اور کل ہی شام جیمی قدوائی یہاں سے گیا ہے اور زوئی میرے قریب آ گئی۔

ہلو زوئی ڈارلنگ۔ میں نے بے حد شگفتگی سے اس سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی۔

''زووئی.....!!'' پولی نے چلا کر کہا۔ اور اس سے لپٹ گئی۔ پھر وہ دونوں

ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں صوفے کے پیچھے کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

''یہ سچ ہے زوئی رانی کہ تم ترارخیل جا رہی ہو.....؟'' پولی نے بے حد ایکسائیٹڈ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔ بالکل سچ۔ کوئی اعتراض.....؟'' زوئی نے ہنس کر کہا۔ ''کیا یہ زمانہ ایسا ہے کہ خالی بیٹھ کر تم یہی سوچتی رہو کہ شام کو کونسی ساری پہنو گی؟''

''اوہ.....تو گویا آپ بھی نیشنل گارڈ میں شامل ہوگئی ہیں۔'' پولی نے اکتا کر کہا۔

''زوئی۔ پیاری اب تمہاری صحت کیسی ہے؟'' میں نے بے حد اخلاق سے پوچھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا باتیں کی جائیں۔

''صحت.....میری صحت کو کیا ہوا تھا پوم پوم ڈیر.....؟'' اس نے بظاہر تعجب کے ساتھ پوچھا۔

''ارے بھئی اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''جب سے یہاں آئی ہوں..... پاکستان.....میرا مطلب ہے .....یہاں کی آب وہوا بہت اچھی ہے۔''

''ہاں۔ بہت اچھی ہے.....'' میں نے گلا صاف کر کے چوٹوں کی طرح سے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ پولی اس وقت آڑے آ گئی۔ اور اس نے حکم دیا کہ چائے منگواؤ۔ اور میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

زوئی اندھیرا اترے تک ہمارے یہاں رہی اور ہمارے بھائیوں کے شہر سے واپس آنے کے کچھ دیر بعد واپس چلی گئی۔ آدمی لوگ رات گئے تک اس کا ذکر

کرتے رہے۔

ایک روز نادر بے حد ایکسائیٹ منٹ کے ساتھ شام کو گھر واپس آیا اور آتے ہی صوفے پر گر گیا اور شور مچا مچا کر اس نے سب کو چاروں طرف اکٹھا کر لیا

.....''سوچو آج کی کیا خبر ہے.....؟''اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا۔جلدی بتاؤ۔''سب نے کان کھڑے کر لئے۔

''ڈولی بلگرامی یہاں آ گئی۔''اس نے جواب دیا۔

''وہی اچھن یار جنگ کی لڑکی.....؟''بھائی شمیم نے ٹب میں زور زور سے پانی اچھالتے ہوئے غسل خانے میں سے چلا کر استفسار کیا۔

''اماں لڑکی نہیں بھتیجی یار.....''نادر نے جھنجھلا کر تصحیح کی۔

''وہ یہاں کہاں سے آن پہنچی.....وہ تو حیدر آباد میں تھی.....''بھائی امجد نے کہا۔

''یار میرے وہی تو بتا رہا ہوں تم لوگ بات تو پوری کرنے دو۔''نادر غصے سے بولا۔

''ہاں۔ہاں بتاؤ میرے اچھے سے بھیا.....''پولی نے بے حد چاپلوسی کے ساتھ پوچھا۔

''چپکی بیٹھ کر سنتی جاؤ۔''نادر نے ڈپٹ کر کہا۔''تو واقعہ یہ ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہے۔''اتنا کہہ کر نادر نے انتہائی فنکارانہ انداز میں سگریٹ جلایا۔

''والد محترم بھی ساتھ تشریف لائے ہیں؟''بھائی امجد نے پوچھا۔

''ارے نہیں بھائی یہی تو سارا قصہ ہے۔وہ اپنے ابا میاں کی خلافِ مرضی

ہوائی جہاز میں بیٹھ کر یہاں آن پہنچی۔ لیکن اس کے چچا میاں اچھن خاں یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ غالباً اس لئے اس کے ابا میاں نے زیادہ سختی سے نہیں روکا۔ اور اب وہ پیلس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اچھن خاں کلب میں ملے تھے۔ بے حد پریشان نظر آ رہے تھے۔ کہتے تھے۔ کیسی خودسر بھتیجی اللہ میاں نے عنایت کی ہے جو کسی کی بات ہی نہیں سنتی۔ بھائی صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ وہ کہتی ہے میں ہرگز اس چغد سے شادی نہ کروں گی جسے ابا میاں نے میرے لئے چنا ہے۔''

''شابس ری لڑکی کا جگرا..... وہ تو ہمیشہ کی اس میدان کی مجاہد تھی بھیا۔ یاد ہے جب لکھنؤ آئی ہے تو عورتوں کے حقوق پر کیسی کیسی الٹی سیدھی بحثیں کیا کرے تھی .....'' دلہن بھابی نے بے ساختگی سے کہا۔

''ہاں بھابی جان اور سنئے تو ایک اور انکشاف..... وہ یہ بھی کہتی ہے کہ میں آٹھ سو روپے ماہوار میں قطعی گزر کر سکتی ہوں۔ اس لئے کروں گی تو جمیل الدین قدوائی ہی سی شادی کروں گی ورنہ..... ورنہ امریکہ چلی جاؤں گی..... وہی رفیعہ زاہدی والا پرانا نسخہ.....'' نادر نے ہاتھ ہلا کر کہا..... ہم سب ہمہ تن گوش رہے۔

''پھر..... پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''پھر کیا ہوتا..... کیا میں تمہیں داستان امیر حمزہ سنا رہا ہوں؟'' نادر نے ڈانٹ کر کہا۔ ''فی الحال تو وہ پیلس ہوٹل میں مقیم ہے اور اچھن خاں کی سٹی گم کئے دے رہی ہے۔'' اتنا بتا کر اس نے اطمینان سے دوسرا سگریٹ جلا لیا۔

ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ آخر اسے ترس آ گیا اور اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اور سنو بھائی.....'' اس نے کش لے کر کہا۔ ''اب ہم تم پنچ کا ایسی خبر سنایت

ہے کہ تمہرا ہارٹ فیل ہو جائے ہے..... ارے میاں شمیم ذرا الماری میں سے خواتین کے لئے عرق گلاب نکالتے لانا۔'' اس نے آواز دی۔

''اچھا۔'' بھائی شمیم کا غسلخانے میں سے جواب آیا۔

''سنو۔ قصہ یہ ہے کہ دفتر میں میرے نام آج ہی جیمی کا تار آیا ہے کہ وہ بھی آ رہا ہے۔ وہ گھوڑا گلی گدھا گلی کیا وہ کم بخت جگہ ہے۔ وہاں سے اس نے تبادلہ کروا لیا ہے اور پہلے ہوائی جہاز سے یہاں پہنچ رہا ہے۔ لو یہ رہا تار۔ ارے بھئی سنگھاؤ اسے عرق گلاب۔'' نادر نے میری طرف اشارہ کر کے تار سب کے سامنے پھینک دیا۔

..... ''جیمی آ گیا۔ اور پیلس میں ٹھہرا ہے۔ نواب صاحب کا بچہ کہیں کا۔ گویا ہم سب تو مر گئے اس کے لئے.....'' اگلے روز سہ پہر کو نادر نے اپنے دفتر سے فون کر کے ہمیں اطلاع دی۔

اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد قدوائی ..... بلگرامی ..... شادی ہو گئی۔ سمندر کے کنارے والے ہوٹل میں اچھن خاں کی طرف سے ایٹ ہوم ہوا۔ ایک ڈنر جیمی نے دیا۔ برعظیم ہندو پاکستان کے سوسائٹی اخباروں میں تصویریں چھپیں۔ کچھ عرصے تک پیلس میں ٹھہرنے کے بعد انہوں نے ایک فلیٹ لے لیا۔ اور جب وہ ہوٹل سے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ تو کار میں بیٹھ کر بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں کی مٹھی سی بناتے ہوئے ڈولی قدوائی نے کہا۔ ''او جیمی ..... جیمی بوائے ..... میں کتنی خوش ہوں.....''

اور اس طرح دونوں بقول شخصے ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ان دونوں سے ہماری ملاقات کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ ڈولی پتہ نہیں اپنے شوہر کے عزیزوں اور دوستوں سے ملنا جلنا پسند نہ کرتی تھی یا جانے کیا۔ ''بد دماغ تو وہ ہمیشہ کی ہے۔'' پولی نے ایک روز رائے ظاہر کی۔ جب کبھی وہ ملتی ہمیشہ پٹرول کی مہنگائی کا عذر کر دیا کرتی تھی۔ اور اگر جیمی ہم لوگوں کے اس سے بالکل ہی قطع تعلق کر لینے کی شکایت کرتا تو امجد بھائی بھی اس کے سامنے نہایت تندہی سے یہی پٹرول کا عذر پیش کر دیتے تھے اور اس طرح ہم لوگ ایک دوسرے سے مدتوں نہ ملتے۔ کبھی کبھی ڈولی پکچرز میں یا شاپنگ کرتی نظر آ جاتی اور جیمی جب بھی ملتا بے حد اخلاق سے پیش آتا۔ ''دیکھا۔ یہ ہوتا ہے۔ شادی کر کے اچھا خاصا قرینے کا آدمی بالکل گدھا بن جاتا ہے۔ اور سوچو کہ جیمی کو اس لڑکی نے بالکل ہی گدھا بنا دیا۔ جیمی جو لاکھوں میں ایک تھا۔ ایسا دوست اب ہمیں کہاں سے ملے گا۔'' نادر بے حد رنج کے ساتھ کہتا۔

اس دوران میں زوئی فرید سے بھی ملنے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ بہت دنوں بعد ایک روز اس کا فون آیا اور اس نے ہمیں اپنے ساتھ اتوار گذارنے کے لئے مدعو کیا۔ میں اور پولی اور دلہن بھابی اس کے ہاں گئے۔ اس کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ کتابیں اور اخبار اس کے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔

''افوہ بھئی بہت ہی اسکالرلی بنتی جا رہی ہو تم.....'' میں نے مرعوب ہو کر کہا۔ ہم لوگوں نے قصداً ڈولی اور جیمی کا تذکرہ اس سے بالکل نہیں کیا اور وہ بھی اس کی باتوں سے لگتا تھا جیسے جیمی قدوائی کے وجود سے ہی ناواقف اور بے خبر ہے۔ ہم

لوگ اندھیرا پڑے تک ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے رہے۔

''تم کیا پڑھ رہی تھیں زوئی ڈارلنگ۔ لینن.....'' پولی نے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ورق پلٹتے ہوئے کہا..... ''عوام..... عوام..... آئیڈیلز..... نظریئے..... کاہے کے لئے ان سب حماقتوں کی خاطر ہمیں اپنی زندگیاں قربان کرنے اور جدوجہد کرنے کے لئے کہا جاتا ہے.....؟''

''بہت ساری حماقتوں اور غلطیوں کے بعد ہی ہمیں ایک صحیح چیز حاصل ہو سکتی ہے پولی ڈیر۔'' زوئی نے سکون سے جواب دیا۔

''او گوش۔ چنانچہ اس کا بھی زندگی کے متعلق وہی جذباتی نظریہ ہے۔ ابھی تک یہ اسی راستے پر چل رہی ہے۔ اب تک یہ اپنی منزل تلاش نہیں کر پائی۔'' میں نے اکتا کر بہت دکھ سے سوچا۔ باہر کھجور کے پتوں میں سمندری ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے سرسرا رہے تھے۔

''اچھا۔ پھر کیا ہوگا زوئی فرید؟'' پولی نے دیوان پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ کہا۔ ''تم اپنے سارے افعال، سارے خیالات سے اسی PRETENCE کو ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہو گی کہ تمہارے سامنے ایک بڑا آئیڈیل ہے۔ تم اور سب کی طرح خرگوشوں یا بلیوں کی سی زندگی نہیں گذار رہیں۔ ایک اونچا سا سویلین یا فوجی عہدیدار شوہر حاصل کرنے کی تمناؤں کی عام سطح سے بہت زیادہ بلند ہو۔ ارغوانی بادلوں کی سطح پر تیر رہی ہو۔ زندگی کی واقعیت کو کوئی معنی پہنا رہی ہو وغیرہ وغیرہ۔ یا ممکن ہے مذہب تمہیں اپنی طرف متوجہ کر لے۔ جس طرح اچھے کیتھولک، اچھے سناتن دھرمی۔ یا اچھے شیعہ

اپنے اپنے نظریوں سے ذہنی اور روحانی طمانیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تم کوچہ بہ کوچہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، اس کی تلاش میں محو ہو جاؤ۔ تمہیں انیسویں صدی کے ایران کی وہ شاعرہ یاد ہے۔ جس کے لئے اقبال نے ''نوائے طاہرہ'' لکھی تھی۔ لیکن زوئی میری جان.....'' پولی نے ذرا رک کر پھر کہنا شروع کیا۔ ''زندگی اتنی عجیب وغریب ہے کہ اسے کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے چاہے تم کتنی ہی کوشش کرو۔ اور پھر آخر میں ہار کر بھی اپنی شکست کا اقرار نہ کرتے ہوئے CYNIC بن جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ۔ سب کچھ حاصل کر کے بھی ہم موت پر، اور کچھ نہ ہونے پر فتح نہیں پا سکتے۔ اور ایک روز خوبصورتی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب چیزوں کا بھی جو زندگی کو بقول تمہارے کچھ معنے پہناتی ہیں..... ہر اچھی چیز کے پیچھے اس کچھ نہ ہونے کا، احساس کیا تمہیں نہیں ستاتا؟ کیا..... کیا تم سمجھتی ہو کہ ڈولی۔ اور جیمی، یا اندرا اور پدم اس کچھ نہ ہونے کو شکست دے چکے ہیں .....اور.....اور بہت خوش ہیں۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتی.....'' پولی نے پہلی مرتبہ جیمی کا ذکر کیا اور پھر وہ چپ ہو گئی۔

باہر رات کی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور دور جزیرے کی روشنیاں سمندر کے افق پر جھلملا رہی تھیں۔

زندگی میں صرف یہی ہے۔ میں نے دکھ سے سوچا۔ کہ ہم آئیڈیلز بناتے ہیں اور ان کے بوجھ کو بھی نہیں سہار سکتے۔ پولی۔ میں نے دل میں چپکے سے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا تم اتنی کمینی ہو کہ زوئی سے ایک آئیڈیالوجی چھین لینا چاہتی ہو؟''

ہم لوگ باہر آ گئے۔ زوئی۔ زوئی فرید عجیب وغریب لڑکی ہے۔ وہ اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا پوم پوم ڈارلنگ کہ۔ پولی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ رات کی سمندری ہوا ہمارے بالوں کو اڑائے دیتی تھی۔

اور اس رات جب ہم گھر واپس پہنچے تو ہم نے نادر کو برآمدے کی سیڑھیوں پر مراقبے میں پایا۔

''ہلو نادر بھیا۔ کیا قصہ ہے۔ دیکھو ہم زوئی کے گھر سے واپس آتے میں تمہارے لئے چوکولیٹ خریدتے لائے ہیں۔'' میں نے اسے بشاش کرنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں..... بھئی.....'' نادر نے بچوں کی طرح سر ہلا کر اپنے فطری انداز میں بڑے رنج کے ساتھ کہا..... ''کچھ نہیں..... زندگی کا بھی عجیب گھپلا ہے۔ یارو گھپلا ہے بالکل.....'' اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔

''کیوں..... کیا رفیعہ کا خط آیا ہے کہ وہ بالآخر ٹرنٹی کالج پہنچ گئی؟'' میں نے ہمدردی سے اس سے پوچھا۔

''ارے نہیں بھائی۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''آج..... آج جیمی مجھے کلب میں نظر آیا تھا۔ جہاں وہ اب تک ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا بیئر پیتا رہا۔ اور ایک بڈھے انگریز کے ساتھ ہیلما کھیلتا رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن چلتے وقت وہ میرے قریب آیا اور اس نے صرف اتنا کہا۔ تم جانتے ہو نادر..... میں..... میں بے انتہا دکھی ہوں..... ڈولی سے میری ایک لمحے کے لئے نہیں بنتی۔ وہ مجھ سے بے حد مختلف ہے۔ اور ہر وقت اپنے سوئمنگ پول اور ایر

کنڈیشنڈ دیوان خانے کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ اور میں اس وقت اس سے لڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔ اور میں اس فلیٹ کو واپس نہ جاؤں گا۔ جہاں وہ رہتی ہے..... اور یقین جانو پوم پوم بٹیا اس کی آواز میں اتنا رنج اتنی تکلیف تھی کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔''

اور میں نے جب یہ سنا تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ نادر جانے کیا کہہ رہا ہے۔ اور میں آنکھیں پھیلائے نادر کو دیکھتی رہی اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی اب تو مجھے صریحاً بے ہوش ہو جانا چاہیے۔ مجھے ایسا لگا..... کہ..... جانے کیسا لگا..... بہر حال تو ہم سب حسب عادت رات گئے تک اس واقعے پر زور شور سے تبصرہ کرتے رہے۔

اور پھر اس کے بعد جیمی روزانہ کلب میں نظر آنے لگا۔ جہاں وہ رات گئے تک چپ چاپ بیٹھا سب کو دیکھتا رہتا۔ اور کسی شامت کے مارے نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بگڑ گیا۔ اور بعد میں اس نے بچوں کی طرح مچل کر نادر سے کہا۔ میں قطعی یہ نہیں چاہتا کہ لوگ میرے معاملات میں دخل دیں۔ اور ایک دوسرے سے ہمدردی کے طور پر کہیں بچارا جیمی..... جیمی قدوائی جو اتنا ہینڈسم اور شیطان تھا اب تنہا اداس رہتا ہے..... جیمی قدوائی جس کی گھریلو زندگی بے حد تکلیف دہ اور غم انگیز ہے..... میں یہ بالکل نہیں چاہتا..... جہنم میں جائیں سب کم بخت۔ جو مجھ سے ہمدردی کرنا چاہتے ہیں..... گدھے.....

اور پھر ایک روز ہم سب شام کے وقت چائے کی میز پر بیٹھے تھے کہ وہ آ گیا۔ اس کی شادی کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ ہمارے ہاں آیا۔ وہ چپکے سے آ کر ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

''میں واپس آ گیا ہوں۔'' اس نے اس شریر بچے کی معصومیت کے ساتھ کہا۔ جو اسکول سے بھاگ آیا ہو۔ اور اب واپس جانے پر رضامند نہ ہو۔

''اچھا ہوا جیمی..... خوش آمدید.....'' پولی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور میں نے اس کے لئے بے حد اہتمام سے چائے بنائی۔ وہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھا باہر سمندر کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ جیمی جو ہم سب کو چھوڑ کر لکھنؤ سے بھاگ گیا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد واپس تھا۔ پھر ہمارے گروہ کا وہی پرانا جیمی معلوم ہو رہا تھا اور انتہائی معصومیت سے سینڈوچز کھا رہا تھا۔

چائے کے بعد ہم لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ڈولی سے صلح کر لے اس میں دونوں کا فائدہ ہے اور اس قسم کی ساری جرحیں، سارے مقولے، ساری مثالیں پیش کی گئیں جو ایسے موقعوں پر ناصح اور ثالث فریق ثانی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس نے ڈولی کے پاس اپنے فلیٹ واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''اچھا جیمی بھیا۔ تمہاری مرضی۔ لیکن کاش تمہاری اتنی رومینٹک شادی ایسی ناکامیاب نہ ثابت ہوتی.....'' آخر میں نے ایک آہ بھر کے افسردگی سے کہا۔ ہم سب کو واقعی بے حد افسوس تھا۔

اگلے روز جیمی نے اپنا سامان فلیٹ سے منگوا لیا۔ اور اسے ساحل پر نادر کی 'بیچلرز لاج' میں دو کمرے دے دیئے گئے۔ آدمی لوگوں کی دنیا پھر آباد ہو گئی۔ دن بھر برج جمتا۔ اتوار کو وہ سب شکار اور موٹر کے انجن کی توڑ پھوڑ اور اسی قسم کی چیزوں میں لگے رہتے۔ جس میں صرف مرد ہی اتنی بچوں کی سی دلچسپی اور انہماک

سے مصروف رہتے ہیں۔جیمی رفتہ رفتہ پھر بشاش ہوتا گیا۔

اس عرصے میں ہمیں یا اسے ڈولی کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔وہ بھی غالباً فلیٹ چھوڑ کر اپنے چچا اچھن خاں کے پاس چلی گئی تھی۔

دن گذرتے گئے۔

ایک روز ہم لوگ رات کے کھانے کے بعد نشست کے کمرے میں آ کر ریڈیو کی خبریں سننے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ باہر برآمدے کی گھنٹی زور سے بجی۔

''ڈولی آئی ہے۔''جیمی نے بچوں کی طرح خوفزدہ ہو کر کہا۔

''کون ہے بھئی؟''میں گیلری کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

باہر ڈولی کھڑی تھی۔اس کا خوبصورت چہرہ دبے ہوئے غصے اور رنج سے دہک رہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح گلیمرس اور شاندار وہاں سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔

''ہلو ڈولی.....آؤ.....آؤ.....اندر آ جاؤ.....''میں نے بے حد اخلاق سے اس سے کہا۔

''میں اندر نہیں آؤں گی.....وہ کہاں ہے.....''اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جس میں غرور اور غصہ اور رنج اور شکست ایک دوسرے سے جنگ کر رہے تھے، آہستہ سے پوچھا۔

''وہ کون.....؟''یہ پوچھتے ہوئے میں نے پھر دفعتہً اپنے آپ کو بے حد احمق اور کمینہ محسوس کیا۔

''میرا شوہر۔جمیل الدین قدوائی۔غالباً آپ لوگ اس سے واقف ہیں۔میں .....میں اسے واپس بلانے آئی ہوں۔''اتنا کہہ کر وہ جلدی سے دوسری طرف

دیکھنے لگی۔ اور ایک بڑا سا آنسو ٹپ سے اس کے پرس پر گر پڑا۔ اور میرا جی چاہا اس سے لپٹ کر رونے لگوں..... وہ اتنی پیاری سی تھی۔ کاش اس کی شادی کامیاب رہی ہوتی۔ میں نے اس سے کہا۔ لیکن ڈولی تم اندر تو آ جاؤ۔ تم جیمی سے خفا ہو ہم لوگوں سے تو خفا نہیں ہو۔''

غالباً اس نے محسوس کیا کہ بڑی بد اخلاقی برت رہی ہے۔ لیکن وہ پھر ٹھٹھک گئی اور اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر کے اس نے کہا۔ ''مہربانی کر کے اسے باہر ہی بھیج دو پوم پوم ڈیر..... میں اندر جا کر سب کے سامنے کوئی سین نہیں کرنا چاہتی۔

''اس طرح دروازے میں کھڑے ہو کر بیکار بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پوم پوم بٹیا۔ میں ہرگز نہیں آؤں گا۔ سمجھیں تم۔ بالکل نہیں آؤں گا میں۔ پیچھے سے جیمی غرایا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ گیلری کے دروازے میں اندر کی طرف کھڑا تھا۔ یا اللہ یہ میں ان دونوں کے درمیان اچھی مصیبت میں پھنس گئی۔ اگر میں بھی اندر چلی جاتی تو یہ اور بھی زیادہ بد اخلاقی تھی۔ اتنے میں پیچھے سے امجد بھائی نے آواز دی..... بٹیا تم چلی آؤ۔ ان دونوں کو نپٹ لینے دو..... بچے ہیں دونوں کے دونوں اور بچوں میں لڑائیاں ہو ہی جاتی ہیں.....'' انہوں نے بے حد بزرگی کے ساتھ فرمایا۔

''نپٹ کیا لینے دو جی۔ کہہ جو دیا میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ بیگم قدوائی افسوس ہے کہ میں اب آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور اندر آ کر صوفے پر گر گیا۔ اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ شاید وہ بھی رو رہا تھا۔

باہر کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور غالباً ڈولی واپس چلی گئی۔ ہم سب ششدر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''میں سمجھتی ہوں کہ جیمی بھیا اس وقت تم نے تھوڑا سا..... میرا مطلب ہے کہ کمینہ پن کیا ہے۔ وہ بچاری خود آئی اور تم نے.....'' پولی نے تھوڑی دیر بعد آہستہ سے کہا۔

''چپ رہئے آپ مس پولی اصغر۔ یہ قطعی میرا اپنا معاملہ ہے اور اس میں مجھے آپ کی رائے کی ضرورت نہیں۔ میں جو چاہوں گا کروں گا اور اس میں آپ اپنی ناک نہ ٹھونسئے، اور اگر یہی بات ہے تو میں کل ہی گھوڑا گلی چلا جاؤں گا۔'' اس نے غصے سے کہا۔

پولی سہم کر خاموش ہوگئی۔

اس واقعے کے بعد اس نے باہر گھومنا پھرنا، آنا جانا بھی چھوڑ دیا۔ دفتر سے واپس آ کر وہ دن بھر نادر کے کمرے میں بیٹھ کر ٹو ڈلز کو خط لکھتا جو ہم سب کے چلے آنے کے بعد لکھنؤ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں کی غیر موجودگی میں ایک روز ڈولی پھر آئی۔ لیکن جیمی نے اٹھ کر دروازہ بھی نہیں کھولا۔ اور وہ واپس چلی گئی۔

اس کے بعد کئی بار ایسا ہوا کہ وہ رات کو آتی اور دیر تک برآمدے کی گھنٹی بجاتی رہتی لیکن جیمی کے غصے کے ڈر سے کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اٹھ کر دروازے تک جائے یا اسے اندر بلائے، اور یہ سب اتنا عجیب لگتا کہ رونے کو دل چاہتا تھا۔ آخر ایک دن امجد بھائی کو سچ مچ غصہ آ گیا اور انہوں نے ڈانٹ کر اس سے کہا۔ ''جیمی تم کب تک اسی طرح یہ گاڑی چلاؤ گے اس سے صلح کر لو۔ یا اسے طلاق دے دو۔

یہ کیا واہیات گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ چلو آج ہی میرے ساتھ چل کر اچھن خاں سے ملو اور قانوناً علیحدگی یا طلاق کا فیصلہ کرلو..... ایک شریف اور خوددار لڑکی کو اتنا تنگ کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔''

''لیکن مجو بھائی وہ طلاق بھی نہیں چاہتی..... اور پھر یہ بھی ہے کہ.....'' اس نے گویا اقبال جرم کرتے ہوئے ملزم کی طرح آہستہ سے کہا..... ''کہ مجھے اس سے بے انتہا محبت ہے..... میں کیا کروں بھئی..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

اور پھر ایک روز ہفتے کی شام کو ہم سب بیٹھے اتوار کا پروگرام بنا رہے تھے جیمی بھی آ کر قریب بیٹھ گیا اور بے دلی سے کھڑکی کے باہر سمندر کی لہروں کو دیکھتا رہا۔

''آؤ شطرنج ہی کھیلیں۔ کم از کم۔'' اس نے اکتا کر تجویز کیا۔

شطرنج۔ میرے ذہن میں کوئی چیز کودی۔ میں نے غیر شعوری طور پر پولی کی طرف نظر ڈالی۔ پولی فوراً چھت کو دیکھنے لگی۔

''ارے نکالو شطرنج..... یہ کیا احمقوں کی طرح منہ کھولے کیوں بیٹھی ہو.....'' نادر نے ڈپٹ کر مجھ سے کہا۔

میں چپکے سے جا کر کھیلوں کا ڈبہ اٹھا لائی۔

''چلو کھیلا جائے بھئی۔'' جیمی نے اکتاہٹ سے جمائی لے کر کہا۔

''آؤ جیمی بھیا.....'' میں نے بے حد مری آواز میں اس سے کہا اور بورڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''تم سے.....؟ ارے تم سے کیا کھیلوں..... تم لوگ تو بالکل اناڑی ہو.....'' اس نے کہا۔

''تم ہی نے کھیلنے کی خواہش ظاہر کی تھی بھئی۔''میں نے بے حد برا مان کر کہا۔

''وہ.....کون تھی.....ٹھہرو.....مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا.....''اس نے میری بات شاید نہیں سنی اور اسی خوابناک، گہری، رنجیدہ، سوچتی ہوئی آواز میں دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہتا رہا.....''وہ.....زوئی.....زوئی فرید.....اس کے ساتھ میں نے ایک مرتبہ شطرنج کھیلی تھی.....ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے اور.....'' وہ اسی طرح کہتا رہا گویا کوئی بہت پرانی، بہت غیر ضروری بات اسے دفعتہً یاد آ گئی ہے۔''اور باہر بارش ہو رہی تھی اور نینی تال میں ہم لوگ پدم کے گھر کے برآمدے میں بیٹھے تھے.....اور کمرے میں دھن راج پیانو بجا رہا تھا.....پدم کا بھائی دھن راج.....وہ بہت اچھا پیانو بجاتا تھا.....اور میں نے اس سے کہا تھا .....کنور دھن راج سنگھ بہادر! اب ہمیں بخشو اور باہر آؤ تا کہ تمہیں ایک مات دے دی جائے۔ میں اسی روز اپنی نئی اسٹیوڈی بیکر رانی کھیت سے وہاں لے کر گیا تھا۔ اور پدم کا مطالبہ تھا کہ نئی کار کی خریداری کی خوشی میں ان سب کو پکچرز دکھلائی جائے۔نئی اسٹوڈی بیکر

.....؟زوئی نے بچوں کی طرح پوچھا تھا اور ہم سب خوب ہنسے تھے.....پھر میں نے اس سے پوچھا تھا کہ تمہیں شطرنج کھیلنی آتی ہے.....؟اور وہ جواب میں برآمدے کے سرے پر سے اٹھ کر میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔اور اس نے صرف ایک بازی کھیلی تھی.....اور اس نے مجھے ہرا دیا تھا.....یا یوں کہو کہ میں جان بوجھ کر ہار گیا تھا.....لڑکیوں کو کھیلوں میں تکلفاً جتا دینے میں مجھے ہمیشہ بڑا مزا آتا تھا۔اور میں نے اسے بھی جیت جانے دیا تھا۔پھر شام کو میری نئی

کار میں وہ ہم سب کے ساتھ کاٹھ گودام تک آئی تھی..... اس روز نینی تال میں، پدم کے گھر میں، جبکہ بارش ہو رہی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا..... کئی برس..... تین..... نہیں چار یا پانچ برس گذر گئے اس بات کو..... زوئی..... زوئی فرید..... جانے آج کل وہ کہاں ہوگی..... تم سب کے ہاں وہ لکھنؤ میں بھی تو آیا کرتی تھی، میں نے کئی دفعہ اسے تم لوگوں کی پارٹیوں میں دیکھا تھا..... زوئی فرید..... میرا خیال ہے..... میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے ساتھ ذرا زیادتی کی..... بڑی پرخلوص سی لڑکی معلوم ہوتی تھی..... میں نے زیادتی کی اس کے ساتھ..... لیکن..... لیکن کیا اب یہ ڈولی میرے ساتھ زیادتی نہیں کر رہی..... یہ لڑکیاں مصیبت ہیں۔'' اس نے الجھن سے بچوں کی طرح کہا..... ''مصیبت ہیں بالکل..... انہیں کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔'' وہ پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے۔ جیسے میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا..... خداوندا..... خداوندا..... اور پولی بالکل ایسی کھوئی ہوئی نظروں سے جیمی کو دیکھ رہی تھی۔ جس روز اس نے مجھے دیکھا تھا۔ جب میں نے اس سے شطرنج کھیلنے کے لئے کہا تھا۔ اور جب جیمی بات ختم کر کے سگریٹ سلگانے کے لئے اپنے لائیٹر پر جھکا۔ اس وقت میرا اور پولی کا بھی دل چاہا کہ ایک دوسرے سے لپٹ کر بس رو پڑیں۔

''یہ تم کیا اینچیوں کی سی شکلیں بنائے بیٹھے ہو.....'' ماموں میاں نے کمرے میں داخل ہو کر گرجتے ہوئے کہا۔ اور دوسرے لمحے وہ نہایت انہماک سے جیمی کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

.....اتفاق سے اسی روز زوئی کا فون آیا کہ وہ صلیب احمر والوں کے ساتھ عنقریب ہی ترا رخیل جانے والی ہے اور اس لئے ہم سے ملنے کے لئے اتوار کی شام کو آئے گی۔ یہ سن کر نادر کافی ایکسائیٹڈ ہو گیا۔..... ''خوب لڑکیاں ہیں آج کل کی یارو..... اور کچھ نہیں تو یہ محترمہ میدان جنگ ہی کو تشریف لئے جا رہی ہیں۔ خدا رومینٹک دماغوں اور ایڈونچر کی خواہاں روحوں کو ایسے موقعے بھی دیتا ہے۔'' اس نے کہا۔

اتوار کی شام کو وہ آ گئی۔ جیمی برآمدے میں بیٹھا تھا۔ سامنے ساحل کی چٹانوں والی سڑک پر سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر وہ خاموشی سے تعظیماً کھڑا ہو گیا اور سگریٹ پھینک کر اس سے ہلو کہا۔

''او ہلو جیمی..... ہاؤ آر یو.....'' زوئی نے بشاشت سے اس سے پوچھا۔

''تم یہاں کب آ گئیں زوئی..... اور ذرا سوچو کہ کل شام ہی ہم لوگ تمہارا ذکر کر رہے تھے.....'' جیمی نے بے حد میٹر آف فیکٹ انداز میں اس سے بات شروع کی۔

''ارے بھئی سارا عالم ہی یہاں آن پہنچا۔ تو ہم ہی کیوں پیچھے رہ جاتے۔'' زوئی نے ہنستے ہوئے لیکن میٹر آف فیکٹ انداز میں جواب دیا۔

ہم سب چائے کے لئے کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ سب کو یہ جان کر بہت ایکسائٹ منٹ ہو رہا تھا۔ اور کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ایمبولنس کار خود ڈرائیو کر کے لائی تھی۔

''لیکن تم تو اتنی چھوٹی سی ہو زوئی۔ تم نے اتنی بھاری گاڑی کیسے ڈرائیو کر

لی.....'' امجد بھائی نے پوچھا۔

''جناب عالی آپ سمجھتے کیا ہیں ریڈ کراس میں سب کچھ سکھایا جاتا ہے.....''

اس نے ذرا رعب سے کہا۔

''اوہو..... یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کمانڈر زوئی فرید.....!'' امجد بھائی نے ہنس کر کہا۔ ''تھری چیرز فور کمانڈر زوئی فرید.....!!''

باہر سرخ رنگ کا آفتاب پانی کی لہروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور اسٹوو پر چائے کی کیتلی سریلا سا شور کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ باہر آسمان پر جھٹ پٹے کا اجالا دھیما ہو گیا۔ اور کمرے میں شفق کی گلنار روشنی گھل مل گئی۔ اور لیمپ مدھم پڑ گیا۔ فضا اسی طرح باتوں اور قہقہوں کی مانوس آوازوں سے گونجتی رہی اور پھر دفعتہً ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں کی روشنی سے کمرہ دفعتہً بھر سا گیا۔ مدھم، نرم، لطیف، تکلیف دہ۔ میز پر بکھرا ہوا چائے کا سامان اس روشنی میں جھلملاتا رہا۔ اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر غیر شعوری طریقے سے وقت کے اس ٹریجک سہانے پن کو شدت سے محسوس کیا۔ پولی کو یاد آیا۔ ایک دفعہ زوئی نے اس سے کہا تھا۔ مجھے اندھیرا پڑے لیمپ کی گلابی روشنی میں چائے پینا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا بہت ہی آرام دہ، بے حد محفوظ اور پیاری جگہ ہے۔ اور جیسے کہ۔ جیسے کہ جانے کیا۔ اور اس وقت زوئی وہاں موجود تھی۔ اور جیمی بھی وہاں تھا۔ جھٹ پٹے کی اس آرام دہ اور محفوظ روشنی کے نیچے وہ دونوں موجود تھے، لیکن یہ سب جانے کس طرح کتنا غلط ہو گیا تھا۔

شفق کی روشنی کچھ دیر تک اسی طرح جھلملاتی رہی اور پھر رات کے بڑھتے

ہوئے اندھیرے میں گھل مل کر ختم ہوگئی۔

دیر تک زوئی نے جیمی سے باتیں کیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ممکن ہے جیمی اس سے ذرا تکلف اور اجنبیت یا کم از کم اس، لیئے دیئے انداز سے ملے جس طرح وہ عموماً لوگوں سے ملتا تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ ایک حد تک بد دماغ مشہور تھا۔ لیکن وہ بہت اپنائیت اور بے تکلفی اور سیدھے سادے طریقے سے اس سے باتیں کرتا رہا جس طرح وہ ہم لوگوں سے باتیں کرتا تھا، اور اسے آپ کے بجائے، تم سے مخاطب کیا اور دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ کہ اگر ایمبولنس یا کسی اور بھاری گاڑی کا چلتے میں انجن بگڑ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔

اور جب زوئی چلی گئی تو پولی نے بہت ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔ ''جیمی اگر ڈولی تمہیں طلاق دے دے تو کیا تم زوئی..... میرا مطلب زوئی سے شادی کر لوگے..... تم جانتے ہو زوئی کتنی پیاری لڑکی ہے..... یعنی کہ اگر.....''

اور جیمی نے اسے اس طرح دیکھا گویا وہ سمجھ نہیں سکا کہ پولی کیا کہہ رہی ہے اور گویا اسے ایسی نامناسب بات قطعی نہ کہنی چاہئے تھی۔

دوسرے دن جیمی کو اپنے کسی سرکاری کام سے کچھ عرصے کے لئے دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔

اس کی غیر موجودگی میں زوئی ایک بار اور ہمارے یہاں آئی۔ ان کے امدادی وفد کا ایک رکن بیمار پڑ گیا تھا۔ اس وجہ سے انہیں محاذ پر جانے میں تاخیر ہو رہی تھی۔

برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے ہم ساحل پر جا کر بیٹھ گئے۔ پولی دور ہاکس نے کی ریتلی لکیر کو غور سے دیکھتی رہی۔

''چنانچہ زوئی تم قطعی طور پر محاذ پر جاؤ گی..... دوسرے الفاظ میں یہ کہ تم اپنی شکست ماننے کے لئے تیار نہیں؟'' پولی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''یقیناً۔ کاہے کی شکست بھائی۔ ایک ہی نظریے کو تم مختلف طریقوں سے توڑ مروڑ کر اپنی ضدی روح کو سمجھانے کے لئے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتی ہو میری جان۔'' زوئی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ اب تم سب سے زیادہ عقلمند ہوگئی ہوں!''

''عقلمند مائی فٹ! ہم اپنے آپ کو کسی دلچسپ فریب میں مبتلا نہیں رکھتے تم صریحاً اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے کوشاں ہو۔ اور یہ تم اپنے پائپ میں رکھ کر پی لو۔ بقول شخصے!!'' پولی نے غصے سے کہا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو پولی ڈارلنگ۔ نظریوں کے اس الٹ پھیر کو جہنم میں ڈالو۔ لیکن انسان مر رہے ہیں۔ مر رہے ہیں۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں۔ کیا اس کا خیال تمہیں کبھی نہیں ستاتا۔ ایک لاکھ یا دس لاکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کا مارا جانا تمہارے نزدیک زندگی کی آفاقی وسعت کے مقابلے میں ممکن ہے کچھ نہ ہو، لیکن یہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے۔ کیا یہ بھی تمہارے محض کچھ نہیں، میں شامل ہے؟ تم ہر بات پر مجھے جذباتیت یا رومینٹک بننے کا الزام کیوں دے دیتی ہو۔'' زوئی نے جھنجھلا کر کہا۔

''میں تمہیں جذباتی بننے کا الزام نہیں دے رہی زوئی۔ زندگی کا ہر رویہ ہر نظریہ جذباتی ہے۔ جو امید یا پھر خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن میں تم سے محض یہی پوچھنا چاہتی ہوں کہ بروں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے اچھوں کو کیوں گھسیٹا جاتا

ہے۔ کیا۔تم اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ تمہاری جدوجہد یا تمہاری قربانیوں کی وجہ سے اندراور پدم یا ڈولی اور جیمی کا بچہ ایک بہتر دنیا میں سانس لے سکے گا؟ یقین جانو پچھلی جنگ عظیم میں شامل ہوتے وقت آج سے تیس سال قبل ہمارے باپوں کی نوجوان نسل نے ہمارے یعنی آنے والی اس موجودہ نسل کے لئے بھی یہی سوچا تھا، یہی امیدیں قائم کی تھیں اور ہم آج وہیں کے وہیں ہیں جہاں کھڑے تھے۔ معاف کرنا زوئی ڈارلنگ اس وقت تمہارے ساتھ کتنے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو واقعاً ان سب چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔جن پر ان کا خیال ہے کہ انہیں یقین ہے۔ اور پچھلی جنگ میں جتنے ان گنت نوجوان مارے گئے۔ان میں سے کتنے ایسے تھے جو واقعی لڑنا چاہتے تھے؟ حالانکہ میرے خیال میں شروع شروع میں ان میں سے بہت سے یہ سوچنے والا دماغ رکھتے تھے۔انسان پرستی کے جوش میں یہی سوچتے ہوں گے کہ اگر دنیا انہیں موقع دیتی تو وہ بھی ایک اور ریپورٹ بروک بن سکتے تھے۔ اور گولیوں کا نشانہ بنتے وقت بے حد میلوڈریمٹک انداز سے سوچتے ہوں گے کہ وہ بھی سپاہی شاعر یا سپاہی ادیب یا انسانیت کے خادم کی موت مر رہے ہیں.....!! پولی خاموش ہوگئی۔

''پولی ڈارلنگ۔تم قطعی ان لوگوں میں سے ہو جو چونکہ اپنے میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ اس لئے سب سے الگ تھلگ آئیوری کے برج میں بیٹھ کر دوسروں پر تنقید کرتے ہیں اور تشدد اور جنگ کے خلاف نظمیں لکھتے ہیں۔'' زوئی نے جواب دیا۔

''معاف کرنا زوئی پیاری ہم میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں لیکن تم کیا تیر مار لو

گی؟'' پولی نے کہا۔ زوئی ہنس پڑی۔ ''شٹ اپ!!'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

سورج غروب ہوتا جا رہا تھا۔ ساحل پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور سمندر اور آسمان کی تاریکی ایک دوسرے میں تیزی سے تحلیل ہو رہی تھی۔

''تم بہت سی باتیں ٹھیک کہتی ہو۔ تم افلاطون کی نواسی بقول نادر۔'' تھوڑی دیر بعد زوئی نے پھر کہا۔ ''لیکن ہم اس عالمگیر جدوجہد سے الگ بیٹھ کر محض فلسفہ ہی تو نہیں چھانٹ سکتے اور نہ انسان کی گری ہوئی حالت پر صرف مرثیے لکھ سکتے ہیں۔ میں کم از کم ان خیال پرستوں میں سے تو نہیں ہوں جو دن کے خواب دیکھتے دیکھتے ڈسی پیٹ کرتے ہیں۔ میں یقیناً بہت سے تیر مار سکتی ہوں۔ اگر تم اجازت دو!!''

میں چپ چاپ بیٹھی لہروں میں پتھر پھینکتی رہی۔ میں نے سوچا۔ پولی نے ٹھیک کہا تھا۔ بروں کی غلطیوں کا خمیازہ اچھوں کو کیوں بھگتنا پڑتا ہے۔ اور مجھے خیال آیا۔ ڈولی نے غلطی کی تھی اور اسے جیمی بھگت رہا ہے اور دفعتہً مجھے ایک اور خیال آیا۔ یا یہ یوں ہے کہ جیمی نے غلطی کی اور اب زوئی اسے بھگت رہی ہے۔ بالکل یہی بات تھی ان آفاقی مسائل کے مقابلے میں جن سے یہ دونوں لڑکیاں اس وقت ساحل پر بیٹھی اس سنجیدگی سے الجھ رہی تھیں، یہ بات بہت ہی عجیب اور ذرا مضحکہ خیز معلوم ہوئی لیکن یہ بہر حال حقیقت تھی۔ یعنی اگر جیمی اپنے انتخاب میں جلد بازی یا غلطی نہ کرتا تو اس وقت زوئی کو یہاں بیٹھ کر اس سنجیدگی سے ہمیں اور خود اپنے آپ کو اپنی منطق سے قائل کرنے کے لئے کوشاں نہ ہونا پڑتا۔ دیکھا آپ نے۔ کہ ان سارے آفاقی مسائل اس ساری دردسری ان تمام تصورات اور تخیلات کی بحث کا لب لباب اس کی اصل وجہ محض یہ تھی۔

''تم ان خیال پرستوں میں سے نہیں ہو جو محض خواب دیکھ دیکھ کر ذہنی طور پر ڈسی پیٹ کرتے ہیں۔ لیکن میری جان تمہارے ان آئیڈیلز نے اب تک خود تمہیں کتنا ذہنی، روحانی یا مادی فائدہ پہنچایا ہے؟ یا اپنے آپ کو یہیں چھوڑ کر تم اپنی پسندیدہ آفاقیت یا عالمگیر مسائل پر آ جاؤ۔ تو یہاں بھی ان سے اب تک کسی کو کیا فائدہ پہنچا ہے تمہارے یہ مشہور و معروف قیمتی آئیڈیلز، اسی وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب ایک دوسرے کو مارنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سب پھر چپکے بیٹھ جاتے ہیں اور بین الاقوامی کانفرنسیں کرتے ہیں یا ایک دوسرے کو طبی مشن یا امدادی یا GOODWILL کے وفد بھیجتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا ختم ہو رہی ہے۔ دنیا بڑی تیز رفتاری سے ختم ہو رہی ہے۔ سپین۔ چین۔ انڈونیشیا۔ کشمیر۔ تم کہتی ہو تمہارے سامنے ان انسانوں کا مطالبہ، ان انسانوں کی پکار ہے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم سے زندگی کا نور، پھولوں کی خوشبو، دن کی روشنی اور آفتاب کی گرمی چھینی جا رہی ہے۔ چھینی جا چکی ہے، آؤ ہماری مدد کرو۔ کوئی شخص اس وقت تمہارے جوش اور تمہاری رائے سے کامل اتفاق ظاہر نہ کرے تو تم کہو گی کہ انسانیت ایسے نازک ٹریجک دور سے گذر رہی ہے۔ اس وقت اپنے آئیوری کی برج میں بیٹھ کر ایسی قنوطی پنے اور غداری کی باتیں مت کرو۔ کیا تمہیں اپنے ملک سے محبت نہیں۔ کیا تمہیں انسانیت عزیز نہیں۔ ہم سب کو اپنے اپنے طور سے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یقیناً زوئی پیاری تم یہی سب کہنا چاہتی ہو گی۔ لیکن کیا تمہیں خود ان سب باتوں پر یقین ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو اپنے آپ پر یا ایک دوسرے پر یقین نہیں۔ ہم سب خوفزدہ ہیں۔ زندگی سے۔ ماضی سے۔ مستقبل سے۔ کیا۔

پولی نے ذرا ٹھہر کر اس سے آہستہ سے پوچھا۔

ساحل پر مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔

اور جب زوئی اپنی ایمبولنس کار سڑک کے چکر کاٹ کر پہاڑی کے نیچے لے گئی تو ہم دیر تک چٹان پر کھڑے اس کی دور اندھیرے میں غائب ہوتی روشنیوں کو دیکھتے رہے۔

دوسرے دن صبح صبح نادر نے اپنے دفتر سے ٹیلیفون کیا کہ اسے اسی وقت اچھن میاں سے معلوم ہوا ہے کہ ڈولی نے بالآخر جیمی سے طلاق حاصل کر لی اور وہ عنقریب اگلے ہوائی جہاز سے اپنے وطن واپس جا رہی ہے اور یہ بھی کہ اچھن خاں بہت چکرائے ہوئے ہیں کہ بھائی صاحب کو کیا جواب دیں گے۔

''چنانچہ اس قصے کا انجام اس طرح ہوا۔'' پولی نے بے حد تھکے ہوئے انداز سے ریسیور رکھ کر کہا۔

جیمی طلاق کے ضروری قانونی کاغذات پر دستخط کر کے پھر اپنے دورے پر واپس چلا گیا تھا۔ بہت دنوں تک اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ ہماری بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا لکھیں اور کس طرح لکھیں..... ''ڈولی کہاں ہے..... اب تک وہ غالباً کب کی حیدر آباد واپس پہنچ گئی ہوگی۔'' ایک دن کھانے کی میز پر امجد بھائی نے پوچھا۔

''حیدر آباد۔ نہیں تو۔'' پولی نے پڈنگ کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اس نے تو ٹوڈلز سے شادی کر لی۔''

''ہائیں..... !!!!!! سب ایک ساتھ چلائے..... میز پر زلزلہ آ گیا۔ کئی گلاس

ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گئے۔ جگ کا پانی سارا بہہ گیا۔ نادر کے حلق میں اچھو لگ گیا۔ دلہن بھابی کرسی پر گرتے گرتے بچیں۔ بھائی شمیم عرق گلاب کے لئے دوڑے۔

''کیا کہا۔ ذرا پھر سے بتانا.....؟؟'' نادر گلا پھاڑ کر چلایا۔

اب پولی کی انتقام لینے کی باری تھی۔ اس نے بے حد فنکارانہ انداز سے چمچہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا بتاؤں..... کوئی میں داستان امیر حمزہ سنا رہی ہوں..... واقعہ صرف یہی ہے کہ ٹو ڈلز نے ڈولی سے شادی کر لی۔''

''لیکن کب کس طرح کیسے؟؟؟'' امجد بھائی نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ تم بھی جانے کہاں کہاں کی چنڈوخانے کی اڑاتی ہو۔''

''چنڈوخانے کی کیا مجو بھیا۔ آج صبح ہی میرے پاس لکھنؤ سے رفیعہ کا خط آیا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے اور بے حد تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔'' پولی نے جواب دیا۔

''کیا..... کیا لکھا ہے اس نے؟'' نادر نے منہ کھول کر جلدی سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔ بس یہی۔'' پولی نے اطمینان سے مزے لے لے کر کہنا شروع کیا۔ ''کہ پچھلے دنوں ٹو ڈلز یہاں آیا۔ اور''

''کہاں آیا؟ یہاں آیا؟ تمہارا مطلب ہے یہاں؟؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں آیا اور ہم سے نہیں ملا۔'' نادر نے چکرا کر پوچھا۔

''ہم سے کیوں ملتا۔ جیمی بھی جب ڈولی سے شادی کرنے آیا تھا تو ہم سے کب ملا تھا؟ اور وہ تو یہاں صرف دن بھر کے لئے آیا تھا۔ یعنی اس کا ہوائی جہاز اسی ایر پورٹ سے جو اڑا تو بس اس نے ڈرگ روڈ پر آ کر دم لیا۔ اور اس نے کہا

کہ میں تو یہاں صرف انٹر ڈومینین /MERC مشن پر آیا ہوں۔ یعنی اپنے عزیز از جان دوست کی مدد صرف اسی طرح کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے شادی کر لوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جیمی کس قدر دکھی ہے۔ اور اس کی مدد اسی طرح ہو سکتی ہے کہ پیاری ڈولی قدوائی تم اسے قانونی آزادی عطا کر کے اس خاکسار سے شادی کر لو۔'' پولی نے بات ختم کر کے پڈنگ کھانی شروع کر دی۔

''لیکن پولی کس قدر فنٹاسٹک۔ یعنی کہ بالکل ہی فنٹاسٹک۔'' میری قوت گویائی میں نے محسوس کیا کہ جواب دے رہی ہے اور الفاظ ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ لہٰذا پھر میں نے خاموش ہو جانا مناسب سمجھا۔

''ہاں۔'' پولی نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اور یقین جانو۔ ٹوڈلز نے اپنی عمر میں سب سے زیادہ شرافت کا کام جو کیا ہے وہ یہی ہے۔ یعنی بالکل فرشتوں کا سا کام۔ اور رفیعہ نے اپنے خط میں روایت بیان کی ہے کہ۔''

''کیا۔ کیا روایت؟'' نادر نے بے صبری سے دریافت کیا۔

''روایت منقول ہے کہ۔'' پولی نے آنکھیں بند کر کے بے حد روحانیت کے ساتھ ارشاد کیا۔ ''کہ ٹوڈلز جب پروپوز کر رہا تھا تو اس کے گھنگھریالے بالوں والے خوبصورت سر کے گرد نورانی ہالہ سا بن گیا تھا۔ جس طرح یسوع مسیح یا کرشن کنہیا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ اور فضا میں فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور۔''

''اچھا بکواس بند کرو اور بتاؤ کہ رفیعہ نے کیا لکھا ہے۔'' امجد بھائی نے جھنجھلا کر کہا۔

''اچھا؟ یہ بات ہے؟ جایئے نہیں بتاتے۔'' پولی روٹھ کر بے نیازی سے پھر پڈنگ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''اچھا۔ اچھا۔ بتاؤ تو سہی۔ پھر کیا ہوا۔'' امجد بھائی کو اپنی چھوٹی بہن کی پھر خوشامد کرنی پڑی۔

''رفیعہ نے لکھا ہے کہ ڈولی اب مانگ میں سیندور لگاتی ہے۔ اور بے حد پیاری لگتی ہے۔ بالکل جیسے ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوئی کویتا۔ یا سوریا کانت ترپاٹھی یا سمترانندن پنت یا کوکل کی کوئی بے حد مدھر رچنا۔ یا فراق کی کوئی رباعی..... یا..... یا جیسے شام کلیان کا الاپ۔ پولی نے کہنا شروع کیا۔

''پولی خدا کے لئے اپنی تشبیہیں بند کرو۔'' دامن صبر بالآخر میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اور میں چلائی۔

''اور سنو تو پولی۔ اس کا کیا ہوا۔'' نادر نے پوچھا۔ ''اس حیدرآبادی سورما کا۔''

''تمہارا مطلب اس الہ آبادی سورما سے ہے جو کسی یار جنگ کا بیٹا نہیں تھا اور جو ایک مرتبہ حیدرآباد کرسمس کی چھٹیاں گذارنے گیا تھا.....؟'' پولی نے نہایت فصاحت و بلاغت سے دریافت فرمایا۔

''ہاں ہاں وہی..... میرا خیال تھا شاید ڈولی اب اس سے شادی کرلے۔'' نادر نے کہا۔

وہ..... وہ تو آج کل چٹگاؤں میں ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کر رہا ہے..... اور جناب، رفیعہ نے لکھا ہے کہ اب ٹوڈلز نے ڈولی کا نام پیار میں سندھیا رانی رکھا ہے میں نے تم سے ہمیشہ کہا تھا کہ پوم پوم ڈارلنگ کہ اگر ٹوڈلز انڈین

پولیس میں نہ ہوتا تو شاعری کرتا۔ اور اگر ایک زمانے میں زوئی فید سے عشق نہ کرتا تو بمبئی سے خام اشیا کی اسمگلنگ کرتا۔ اور۔ اور۔''

''خدا کے لئے پولی۔'' میں نے نڈھال ہو کر کہا۔

''اچھا۔ اور سنو تو سہی۔ رفیعہ نے لکھا ہے کہ ڈولی نے اس دیوالی پر لکشمی کے استقبال کے لئے اپنے گھر میں مختلف رنگ کے چاکوں سے بہترین نقش و نگار بنائے اور کروا چوتھ کا برت رکھا۔ جو ہندو لڑکیاں اپنے شوہروں کے لئے رکھتی ہیں اور وہ کہتی ہے کہ اسے ٹوڈلز کے مذہب کے سارے تہواروں اور رسموں میں یہ برت سب سے زیادہ رومینٹک لگتا ہے۔ میں نے تم سے ہمیشہ کہا تھا پولی ڈارلنگ کہ ڈولی ایک بے حد رومینٹک روح ہے۔ اور اگر وہ جوبلی ہل پر پیدا نہ ہوئی ہوتی .....''

''تو گھاس کھودتی ہوتی۔ خدا کے لئے پولی۔ تم چاہتی ہو میں خودکشی کرلوں؟'' میں نے عاجزی سے استفسار کیا۔

ہم سب کھانے کی میز پر سے اٹھ آئے اور نشست کے کمرے میں آ کر رفیعہ کے خط کو سب نے باری باری پڑھا۔ اور نادر نے سونے سے پہلے اپنے پانچوں اسپینل کتوں کو شب بخیر کہتے ہوئے ان کو مخاطب کیا کہ دوستو..... دنیا کا خاتمہ میری آنکھوں کے سامنے ہے..... اور وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ میں تمہیں لے کر جنگلوں کی طرف چلا جاؤں..... گڈ نائٹ۔

وقت گذرتا گیا۔

اور تب ایک روز جیمی اپنے دورے سے واپس آیا۔ جب وہ ہمارے یہاں

پہنچا۔ چھٹ پٹے کا وقت تھا۔ اور گھر کے لوگ کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور سارے کمرے سنسان پڑے تھے۔ باہر ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اور سمندر کی لہریں سرد اور خاموش تھیں۔ وہ تھکا ہارا اندر داخل ہوا اور ایک گہرا سانس لے کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ گویا وہ اس دنیائے فانی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھ کر، بڑی بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں بھگت کر آ رہا ہے۔ گیلری میں پہنچ کر اس نے پولی کو آواز دی۔ لیکن پولی کچھ دیر پہلے زوئی کے ساتھ ٹہلتی ہوئی ساحل کی طرف جا چکی تھی۔ وہ اس روز صبح سے ہمارے یہاں آئی ہوئی تھی۔ پھر جیمی اندر آ کر نشست کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ جہاں اسٹوو پر چائے کی کیتلی بڑی مصروفیت سے گنگنا رہی تھی۔ اور نادر کا ایک اسپینل کتا ایک صوفے پر آنکھیں بند کئے اطمینان سے غور و فکر میں مشغول تھا۔ جیمی اس کے قریب آ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور وہ بچوں کی طرح آنکھیں جھپک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اور اسے ایسا لگا جیسے وہ بہت دنوں بعد ایک بہت لمبے سفر سے بالآخر واپس آ گیا ہے۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور ایک کشن پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک جانی پہچانی جگہ پر موجود ہے۔ ایسی جگہ جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جو کسی پچھلے جنم کے کسی بھولے ہوئے دھندلے خیال کی طرح دفعتہً اسے پھر یاد آ گئی ہو۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس جگہ جھٹ پٹا پھیل رہا ہے۔ اور وہ اپنی چھوٹی سی ناؤ کو کدم اور مولسری کے سائے میں کنارے سے باندھ کر بھیگی ہوئی گھاس پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف بہت سے انسان چل پھر رہے ہیں۔ ایسے مرد اور ایسی عورتیں جو اس نے

صرف خوابوں میں دیکھی ہیں۔ اور وہ سب زندگی کے نور اور امن کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور اس کے چاروں طرف زندگی کی مدھم اور ٹھنڈی روشنی پھیل رہی ہے۔ اور گھاس اور چنار کے پتے اور مولسری کی ڈالیاں برکھا کی ٹھنڈی پھواروں سے بھیگ رہی ہیں۔ اور اس راستے کے دونوں جانب ایسے گھر، ایسے انسان، اور ایسے پھول ہیں جو اسے صرف سپنوں میں نظر آتے تھے۔ اور اس وقت وہ صوفے پر اس شریر، ضدی اور معصوم بچے کی طرح آنکھیں بند کئے پڑا تھا جو اپنے سارے چھوٹے چھوٹے دکھ بھول چکا ہو۔

اور پھر دفعتہً وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ دریچے میں جا کر اپنے سارے MANNERS ساری تہذیب سارا 'ریزرو' بھول کر وہ بچوں کی طرح پکارنے لگا..... زوئی..... زوئی..... کہاں ہو بھئی..... ادھر آؤ..... پولی بٹیا..... زوئی کہاں ہے..... زوئی۔

اور پھر وہ گیلری کا دروازہ کھول کر ستاروں کی روشنی میں باہر نکل گیا۔ جدھر ساحل کی سمت پولی اور زوئی ٹہلتی ہوئی گئی تھیں۔ ساحل کی چٹان پر پہنچ کر اس نے پھر پکارا..... زوئی..... زوئی.....

لیکن زوئی وہاں نہیں تھی وہ کچھ دیر قبل پولی کو خدا حافظ کہہ کر اپنی ایمبولنس میں دور پہاڑی کے نیچے پہنچ چکی تھی۔ اور رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس کی ایمبولنس کی پچھلی سرخ روشنیاں افق کے قریب پہنچ کر رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں اور زوئی آج کل کشمیر میں ہے۔ ترارخیل۔

لیکن ترارخیل یا نہیں ترا خیل۔ زوئی یقیناً عجیب و غریب لڑکی ہے۔ زوئی فرید

.....جس کے لئے ٹوڈلز کہتا تھا۔ کہ اسے دیکھ کر بے ہوش ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

اور ٹوڈلز کم از کم مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

انت بھئے رت بسنت میرو

لکڑی کا چھوٹا سا سفید پھاٹک کھول کر ٹونی پیزی کی کیاری میں کود آیا۔ چاروں اور پھول سفید تھے۔ زمین میں ابھی پانی دیا گیا تھا۔ بھیگی ہوئی گھاس میں اس کے چھوٹے چھوٹے فل بوٹ چمکنے لگے۔ چند کنکروں کو ادھر ادھر ٹھوکر مارنے کے بعد اس نے فاتحانہ انداز سے ہرے رنگ کے پردوں والے مکان کی طرف دیکھا جو سڑک کی دوسری جانب ٹونی کی آمد کی مطلق کوئی پروانہ کرتے ہوئے چپکا کھڑا تھا۔ ٹارارارارارارا۔ پھاٹک کے جنگلے پر چڑھ کر ٹونی زور سے چلایا۔ پیزی کے پھول ابھی سو رہے تھے۔ ایک قطار میں ہولی ہوکس کھڑے تھے۔ ان کے چوڑے پتوں پر سے پانی کی بوندیں گھاس میں گر جاتیں۔ درختوں کی ٹہنیوں میں سے دھوپ چھن رہی تھی۔ حوض کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اب یہاں وہ مزے سے رائے روجرز کی کہانی کا دوسرا حصہ پڑھے گا۔ جس میں اس نے سات ریڈ انڈین مارے۔

سامان اتار کر برآمدے میں رکھا جا رہا تھا۔ پھاٹک تک صندوق اور کریٹ پھیلے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے اس کا سرخ اسکوٹر ٹرک میں سے اتارا گیا تھا۔ ابو کے اسپینارڈ دوست اس کے کتے کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ ابو جو اس کے لئے اسکیٹس لائے تھے۔ انہیں پہن کر وہ اسکیموز کے ملک کی طرف سفر کرے گا۔ اور روکیز میں جا کر لون رینجر سے ملاقات کرے گا۔

''ای ہو۔'' ابو چلائے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر تینوں اسپینش دوستوں کے ساتھ بیٹھے وہ نہایت زور شور سے گا رہے تھے۔ ٹونی کو دیکھ کر انہوں نے زور سے ہوا میں ہاتھ ہلایا۔ ہرے پردوں والے مکان کی طرف بشاشت سے نظر ڈالی۔ جہاں اوپر کے برآمدے کی ریلنگ کے سہارے کوئی لڑکی دھوپ کے رخ بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی، یہاں اس کی صورت صاف دکھائی نہ دیتی تھی۔ لیکن اس کے بال جو ہوا میں اڑ رہے تھے اور اس کی آنکھیں جو بے حد کالی تھیں اتنی دور سے بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔

''ای ہو۔ ٹونی۔ ویٹ از سم ڈیم۔ واٹ؟'' ابو نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ پھر وہ اور ان کے دوست کسی بات پر بے حد محظوظ ہوئے غالباً وہ لوگ راستے بھر جو مسخرے پن کی باتیں رہی تھیں ان کا ذکر کر رہے تھے ابو نے لائیٹر کو ٹھونک بجا کر ٹھیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے تینوں دوستوں کے ساتھ نہایت بشاشت سے جٹ طیاروں کے انجنوں پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ ٹونی نے بے حد سمجھداری سے ان پر نظر ڈالی۔ ''باکل ٹھیک ہے ابو۔ اتنی پیاری دنیا میں تم کو، ہم سب کو اس سے بھی زیادہ خوش ہونا چاہئے۔ اگر تم چاہو تو تم بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رائے روجرز کا قصہ پڑھ سکتے ہو۔ لیکن تمہارے جوتوں کے بوجھ سے سارے پھول ٹوٹ جائیں گے۔'' احتیاط سے اس نے پنیزی کے پتوں کو چھوا۔

پراسرار صندوق اب فرش پر ادھر ادھر گھسیٹے جا رہے تھے۔ کئی دن تک ابو بچوں کی سی خوشی کے ساتھ کمرے سجانے میں جٹے رہیں گے۔ پھر وہ ابو کے ساتھ مل کر پچھلے برآمدے میں اپنی ورکشاپ تیار کرے گا۔ ممی کا اس کی اور ابو کی اس علیحدہ

دنیا سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا۔ ٹونی اور ابو۔ اس کو اپنی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا۔ تصویروں والی کتاب اٹھا کے اور اپنا کوٹ بڑے آدمیوں کی طرح کندے پر لٹکا کر بہت مدبرانہ انداز سے روش پر چلنا شروع کیا۔ ''میں تم سب کے محسوسات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' برآمدے کی سیڑھیوں پر جمع ابو اور ان کے دوستوں کو یگانگت کے احساس کے ساتھ دیکھا اور روش پر چلتا رہا۔ ممی تیزی سے سامنے سے گذر گئیں۔ اس نے ان کو کائی خاص نوٹس نہیں لیا۔

''ای ہو.....'' ابو نے پھر سیٹی بجائی۔ ان کے اسپینش دوست نے سامان میں سے گراموفون نکال کر لا پلوما بجانا شروع کر دیا۔

شور سن کر وہ ریلنگ پر جھک گئی۔ نیچے کا منظر جاڑوں کی مدھم دھوپ میں گھل کر چیزی کی کیاریوں تک پھیل گیا۔ سامنے کے مکان کے باغ میں چند سیاہ بالوں والے غیر ملکی اداس آواز میں پلوما کا نغمہ گا رہے تھے۔

جب کبھی کبوتری تمہارے دریچے میں آ کر بیٹھے تو اس کا خیال کرنا۔ کیونکہ وہ میری طرح ہے۔

جب کبھی یہ نغمہ بجایا جائے تو میرا خیال کرنا کیونکہ ہمیں یہ نغمہ پسند تھا۔ گذرے ہوئے وقت کے گہرے تیز رنگ سارے میں پھیلتے چلے گئے۔ سامنے کا منظر دھوپ کی زرد سطح میں روشن ہو گیا۔

اس منظر میں ایک پرانا مانوس چہرہ تھا۔ خوش باش لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے جانے پہچانے آدمی ہیں۔ کہہ دو کہ یہ تو جانے پہچانے.....

ان آدمیوں نے ٹوپیاں گھاس پر پھینک کر خالی کریٹ پر چائے کا سامان نکال

کر رکھا۔ بلو جینز پہلے ایک عورت نے ہنستے ہوئے ان کے لئے ٹوکرا گھسیٹا۔ دو کالے بالوں والے غیر ملکی پلو ما کا گیت الاپتے رہے۔

لیکن سنو۔ سنو لا پلو ما بجانے والو۔ تم جو ساری دنیا میں تاروں پر اور پردوں پر یہ راگ بجاتے ہو۔ تمہاری آوازیں گونجتی ہیں۔ لوگ اداسی سے ناچتے ہیں، معصومیت اور رنجیدگی کے ساتھ ان الفاظ کو دہراتے ہیں۔ لیکن پھر کچھ نہیں ہوتا۔

ٹونی.....! ٹونی ادھر آؤ۔ تمہارا اولٹین تیار ہے۔ نیچے کوئی کہہ رہا ہے۔

ٹونی.....؟ پیارے شریر آنکھوں والے بچے۔ میں نے ابھی تمہاری آواز سنی ہے۔ تم پنیزی کے پھولوں میں چہکتے پھر رہے ہو اور نیلے لباس والی تمہاری ماں

.....

اور اب دفعتہً ذہن پر ایک مکمل تاریکی چھا گئی۔ منظر کی روشنی، اور گاتے ہوئے وقت کے رنگ اس تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں یقیناً جاگ رہی ہوں۔ اور یہ شام کا سمے ہے میں ٹہنگ کر رہی ہوں۔ مجھے قطعی ساری روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ میرا گھر ہے۔ اس کے سامنے باغ ہے۔ اس کے پرے ایک اور گھر ہے۔ اب رات چھانے والی ہے۔ بارن کے جنگلوں پر بیٹھ کر وہ گتار بجاتے ہیں۔ وادی میں لالٹین کی روشنی اور چیڑھ کے پتوں کے دھوئیں میں تاریخ کے نظریوں پر بحث ہوتی ہے۔ اب کے جو کرسمس آئی تو انہوں نے مسلسل چھ دفعہ لا پلو ما بجوا کر سارے مجمع کو مستقل اسی پر ناچتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ کٹی بے حد ہنستی تھی۔ تو لوگ صریحاً کریک ہو۔

اور دن رات مہا بھارت..... جی نہیں جناب والا آج ہم صبح سے متواتر نہایت

صلح و آشتی اور مفاہمت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مثلاً ابھی میں اس کے رومال پر استری کر کے آ رہی ہوں۔

اور اس پر گرا دیا اپنا کیوٹکس ..... تم ہو کس لائق .....؟ بیٹھی اتر ا رہی ہیں، وہ دھاڑتا ہے۔

ماموں میاں کے ملنے والے بہت سارے بین الاقوامی شہرت کے انتہائی قابل اور سنجیدہ لوگ بیٹھے نہایت افلاطونی سے سگار پی رہے ہیں۔ وہ فون کرنے کی خاطر کھڑکی میں سے اندر کودی۔

یہ کیا آفت مچا رکھی ہے۔ ہر وقت ہو حق ..... ماموں میاں نے چونک کر کہا۔

ماموں میاں جیرلڈین سالرز کے چہیتے میک سالرز نے کل انتقال کیا ان کی وجہ سے ذرا اظہار افسوس کر رہے تھے۔

ایں ..... جیرلڈین سالرز کے چہیتے میک۔ کیا عمر تھی بچارے کی۔ ماموں میاں نے عینک پیشانی پر چڑھا کر افسوس کے ساتھ سوال کیا۔

آٹھ سال کے تھے غریب، اور نہایت ذہین۔

ماموں میاں نے ہڑبڑا کر فون اٹھایا۔ جیرلڈین سالرز کالج کی امریکن پرنسپل تھیں آپ کے پیارے بیٹے کے انتقال کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

وہ سرپٹ باہر بھاگی۔ گیلری میں سے وہ آ رہا تھا۔

''کہاں بھاگی جاتی ہو۔''

''مک سالرز ..... انہوں نے کل جان شیریں، جان آفرین کے سپرد کی

.....؟.....''خاصا شریف کتا تھا غریب۔ گو چور تھا۔''

''ہرگز چور نہیں تھا۔''اس نے لڑنا شروع کیا۔

''چور۔ اور جو گیٹ کریشنگ کرتا تھا مرحوم۔ کہیں چائے ہوئی آ گئے۔ اب کھڑے دم ہلا رہے ہیں۔ بہر حال اگر اس وقت تمہارے کالج کی کوئی خوبصورت لڑکیاں بھی مس سالرز کے وہاں موجود ہوں تو میں بھی تعزیت کی خاطر تمہارے ہمراہ چلا چلوں گا۔ کیا ایک سے ایک مدراسن کو چن چن کر تم دوست بناتی ہو۔''اس نے خفگی کے ساتھ کہا۔

راستوں پر دھوپ پھیل گئی۔ گلابی مکانوں میں سے دھواں نکل رہا ہے۔ خنکی میں پردے ہل رہے ہیں۔ عمیق ٹھنڈے کمروں کی کھڑکیوں میں فرن کے پودے رکھے ہیں۔ زرد کنارے والے کاغذ جن پر خزاں کے مناظر ہیں۔ امی بیگم کی تصویریں۔ جن پر سفید لیس میں ملبوس، وکٹورین صوفوں پر بیٹھی مسکرائے جاتی ہیں۔ ورک باکس میں سے پرانے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ ارما۔ ارما۔

ارما۔؟ ہاں۔ میں ارما ہوں۔ بیس سال میں نے اس گھر میں گذارے، نیلے پہاڑوں پر خچر پر بٹھا کر مجھے فرانسیسی گرامر پڑھانے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ چھ سال میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا۔ مالینی شوڈے میری دوست تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ارما تم زندگی میں مروگی مجھے معلوم ہے۔ وہ ویدانت کی بڑی استاد تھی۔ اور سیمل کے نیچے خیمے میں بیٹھ کر بڑی عقلمندی کی باتیں کرتی۔ ارما۔ وہ کہتی زندگی میں صرف جھوٹ ہے۔ مایا میں جو روشنی داخل ہوئی۔ وہ گیان کی تھی۔ اور گیان اس وقت اتم ہوا جب وہ مایا سے پھر باہر نکل گیا۔ ویسے مالینی شوڈے دن بھر برج

کھیلتی تھی۔ اور اپنی اماں کو خوش کرنے کے لئے اچار اور مربے بنایا کرتی تھی۔ ارما۔ اس نے کہا۔ زندگی میں صرف دل کی وہ بے اطمینانی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ موت آ جاتی ہے۔ موت اصل گیان ہے۔ شام کو مالینی اپنے چاروں بھائیوں کے ساتھ رمبا کے فینسی اسٹیپس کیا کرتی۔ ارما۔ وہ کہتی۔ تم بھی سایہ ہو۔ میں بھی سایہ ہوں۔ اوٹو بھی سایہ ہے۔

اوٹو.....؟ یعنی سید باقر اصطفےٰ رضوی۔ نام کی بوریت کی بھی ایک حد ہونی چاہیے۔

''اوٹو.....'' آنسو خشک کرنے کے بعد اہتمام سے پائنچے پھیلا کر قالین پر بیٹھنے کے بعد اس نے سوگوار آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''اوٹو نے ہمارا ساتھ کیا دیا۔'' بالکل اپنی اماں کے انداز میں کوشش کے ساتھ سنجیدگی اور ناراضگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''جی ہاں وہ میرا بھائی تھا ایک قسم کا۔ کزن ہونے کے علاوہ۔ یعنی میرے بابا نے اس کو متبنّیٰ بنایا تھا۔ وہ بابا کا بھانجا تھا۔ وہ ان کو ماموں میاں کہتا تھا۔ بچپن سے مجھے بھی بابا کو ماموں میاں کہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کو متبنّیٰ کرنے کے سات سال بعد میرے دونوں بھائی پیدا ہوئے۔ تو اس نے جلنا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں سے بھی جلتا رہا مستقل۔ پھر بابا کے مرنے پر برسوں اس نے کہا کہ جائداد میں میرا بھی صریحاً قانونی حصہ ہے۔ کیونکہ میں متبنّیٰ ہوں۔ اس نے یہ کبھی نہ کہا تھا۔ لیکن ہمدرد خواتین کو جو ماموں میاں کے پرسے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑی تفصیل سے یہ مکالمہ سنا۔ اپنی اماں کی طرح وہ سفید دوپٹہ اور کھڑے پائنچے میں ملبوس تخت پر چڑھی بیٹھی رہی۔ اور کچھ وقفے کے بعد وہ

آنسو خشک کرتی۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ جن میں سرخ پتے اڑ رہے تھے۔ اگر وہ اس وقت کمرے میں آ جاتا تو دھاڑ کر اس سے کہتا۔ ''یہ کیا مسخرہ پن لگا رکھا ہے۔ تم بالکل نا قابل اعتماد ہو۔'' (یہ اس کا خاص لفظ تھا) لیکن ماموں میاں کے مرنے کے بعد واپس نہ آیا۔ ویسے عموماً وہ اپنے کلب میں ہی رہتا تھا۔ دوستوں سے اس نے کہا۔ مور بڈٹی سے مجھے نفرت ہے۔ یہ لوگ مور بڈ ہیں۔ اسی مور بڈٹی کے تحت اماں نے مجھے متبنّیٰ کیا تھا۔

یہ لوگ.....؟ وہ ارما ہے۔ جس میں اس کا مطلق قصور نہیں۔ اس کا اب وہ کیا علاج کر سکتی ہے کہ وہ.....ایک مخصوص گھرانے میں پیدا ہوئی مثلاً اگر وہ آغا رفاقت حسین کے ہاں پیدا ہوئی ہوتی تو اس وقت برقع پہنے امیر الدولہ پارک میں کامدانی کی دوکان پر کھڑی کرن گوکھرو خریدتی ہوتی۔ یا وہ ودیا بھارگوا بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال اب وہ ارما تھی اس طرح کی بے تکی باتیں سوچے جانے میں کبھی کبھی اسے بہت مزہ آتا۔ ایک قسم کا ذہنی اوپیرا اپنے کرداروں سے جس طرح کی چاہے ایکٹنگ کروائی۔ اور جیسے چاہے مکالمہ ادا کروائے۔ اور ساتھ ساتھ فٹ نوٹ لکھے جا رہے ہیں۔

لیکن اب تو وہ اٹھائیس سال کی ہو چکی ہے (اس نے ایک نامعلوم سی پھریری لی) یہ کرسمس کی سہ پہر ہے، اپنی نند کی لڑکی کے لئے صبح سے وہ کوٹی بننے میں لگی ہے۔ اوٹو نے بنگلور جا کر اسے چند مشفقانہ خط لکھے۔ جن میں اس نے رائے دی کہ اسے یقیناً کہیں جا کر اور زیادہ تاریخ پڑھنی چاہیے۔ مثلاً ہوپکنز یونیورسٹی جہاں مالینی شوڈے گئی ہوئی ہے۔ جو اس کی گرو تھی۔ اور وہ خود بھی سیٹل ڈاؤن ہو

جائے گا (یہ اس نے اپنے دوستوں کو بتایا)

اوٹو کے چلے جانے اور ماموں میاں کی پہلی برسی کے بعد اس کا بیاہ ہوا۔ اس کا میاں بھی کہیں پر کسی زمانے میں اوٹو کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اور اوٹو کے متعلق کچھ زیادہ قابل ذکر رائے نہ رکھتا تھا۔ اور ہمیشہ اس کا پورا نام لیتا تھا۔ سید باقر اصطفےٰ رضوی۔

شادی بھی کوئی ایسا خاص ذہنی تجربہ ثابت نہ ہوئی جیسا کہ اس کا خیال تھا اور جس کی مالینی شوڈے کو توقع تھی (کالج میں ایک صاحبزادی اسماء سلطانہ تھیں۔ جس بیچلر سے بھی شامت کے مارے سے، ان کی ملاقات ہوتی ان کو فوراً یقین کامل ہو جاتا کہ بس اب یہ دو چار روز میں پروپوز کرنے والا ہے، اور عرصے تک جب وہ پروپوز کرنے ہی میں نہ آتا تو وہ ساری دنیا سے خفا ہو جاتیں اور زندگی کی زیادتیوں کی شاکی رہتیں۔ ان کا ایمان تھا کہ جتنے بھی انسان دنیائے فانی میں ان سے ملتے ہیں سب کے سب ان کے مداح ہیں۔ ارما کو زندگی کے متعلق ان کا اتنا صحت مند نظریہ بہت پسند تھا۔ اکثر اس نے مالینی شوڈے کے سامنے ان کی زندہ مثال پیش کی۔ لیکن مالینی شوڈے نے ہمیشہ سر ہلا کر سنسکرت کا کوئی اور مقولہ دہرا دیا اور منہ لٹکائے شلجم کا اچار بنانے میں مصروف رہی تم بالکل ڈی مورالائیز ہو چکی ہو۔ وہ جل کر مالینی سے کہتی)

اور اوٹو ہے۔ اس کا سامان ابھی اتار کر سامنے کے مکان میں رکھا گیا ہے۔ اور اس کی بیوی بلو جینز میں ملبوس ادھر ادھر حکم چلاتی پھر رہی ہے۔ شام کو اس کا میاں کہے گا چلو بھائی ارما ذرا رضویز کے یہاں ہو آویں۔ دوستوں سے وہ بے حد خوش

مزاجی کے ساتھ تعارف کروائے گا۔ یہ میرے سالے ہیں۔ ہاہاہا!!

چنانچہ بہت بڑی دنیا پڑی ہے۔ ہزاروں مشغلے ہیں۔ وہ خود بے حد ہر دلعزیز ہے اور کیا عمدہ گاتی ہے۔

لیکن اوٹو موجود ہے۔ پر وہ جا چکا ہے۔ وہ جا چکا ہے۔ لیکن موجود ہے، اور سب مایا ہے۔ اور اسے زندہ رہنا ہے۔ اس طرح کی کوئی قابلیت کی بات اس کی پیاری مالینی رانی اس سے کہتی اگر وہ یہاں ہوتی۔

پرانے خاندانی جھگڑوں قصوں کو بھول جاؤ ارما ڈارلنگ کل تمہارے بھائی صاحب اور بھاوج کو ہم کھانے پر بلاتے ہیں۔ اس کا میاں خوش دلی اور سادگی سے اس سے کہے گا۔

کیا آئیڈیل میچ ہے واہ وا۔ عمر بھر وہ اپنے اور اوٹو کے لیے دوسروں سے یہ سنتی آئی تھی۔ اوٹو اس کے ساتھ کس قدر محبت سے پیش آتا تھا۔ کمینہ وہ اس لئے بنا کہ دراصل اسے ارما کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔ اگر وہ ماموں میاں کے مرنے کے بعد بھی اتنا ہی فرمانبردار متبنّیٰ بیٹا بنا رہتا تو لامحالہ اس کو ارما سے بیاہ کرنا پڑتا۔ سارے عالم کو پتہ تھا کہ اوٹو کا بھیا کا بٹیا سے بیاہ ہوگا۔ اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ انتہائی کمینے پن پر اتر کر ان سب سے لڑائی مول لے اور ہمیشہ کے لئے خاندان سے علیحدہ اور آزاد ہو جائے۔ یہ سب اس نے خود سوچا تھا اور یہ سوچ کر ایک حد تک مطمئن ہوگئی تھی۔ اگر اس بلوجینز والی امریکن نما، لیکن خاصی حسین عورت کے بجائے وہ اس وقت اس شدید مالکانہ طمانیت کے ساتھ اوٹو کا سامان برآمدے میں رکھواتی ہوتی۔ اس کے دوست اس سے چائے کی فرمائش کرتے اور وہ چلاتا۔ ای

ہو۔لیکن ایسا کون سا فرق پڑا ہے۔کوئی بھی نہیں۔کل رات کو یقیناً میں ان لوگوں کو مدعو کروں گی اور اس قدر اخلاق اور یگانگت کا برتاؤ کروں گی کہ یہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے۔آخر فرق ہی کیا پڑتا ہے۔اس نے ہوا کی زد سے بچنے کے لئے ساری کو چاروں اور لپیٹ کر سوچا۔دراصل یہ سب ایک طرح کا ذہنی تاثر تھا۔جس سے میں عرصہ ہوا نکل چکی ہوں۔(پیٹرن بک اٹھا کر اس نے نند کی بچی کے لئے دوسرا نمونہ سلائی پر اتارا) گویہ کہ عورت۔

یہ عورت اوٹو کے گھر میں رہتی ہے۔سنا ہے کہ بدمزاج بھی ہے وہ۔اوٹو کی بیوی اور بد دماغ الگ اور عقل میں بہت کم۔

سر پر سے رومال ہٹا کر بلوجینز میں ملبوس عورت نے دوسرا ٹوکرا گھسیٹا۔کسی بات پر سب لوگ ہنسے۔اوٹو نے آواز دی۔ای ہو۔ڈارلنگ۔

ہاں۔کیا فرق پڑتا ہے۔ریلنگ پر سے ہٹ کر اس نے سوچا۔دھوپ ڈھلتی ہوئی پنیزی کی کیاریوں کے پرے چلی گئی۔کاسنی پھولوں کی بیلیں زور زور سے ہوا میں جھولنے لگیں۔

ٹونی نے ناقدانہ نگاہوں سے منظر کو دیکھا۔اس کے اتنے شاندار اور بالکل قطعی ونڈرفل بوائے روجرز سے بھی عمدہ ابو اب اندر چلے گئے تھے۔ان کے دوست گراموفون کے ریکارڈ سمیٹ رہے تھے۔ممی حسب معمول نوکروں پر چلا رہی تھیں۔شانوں پر کوٹ جھلاتا ہوا وہ روش کے اختتام پر پہنچا۔سامنے والے مکان کی دوسری منزل پر اتنا عمدہ کھلا ہوا شفاف فرش والا برآمدہ تھا۔کاش وہ اسی وقت وہاں پہنچ کر اپنے نئے اسکیٹس کا تجربہ کر سکتا۔ممکنات کا معائنہ کرنے کی غرض سے

چھوٹے چھوٹے پر اعتماد قدم رکھتا وہ زینے پر چڑھا اور ریلنگ کے سہارے بیٹھی ہوئی لڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

بلیک آؤٹ پوری کائنات میں پھیل گیا۔ رنگ اور فضا، اور محسوسات۔ ایک اچانک صدمے کے ساتھ بالکل اس اندھیرے کی تہہ میں جا گرے۔ ''آنٹی۔'' دوستی کے انداز میں اجنبی بچے نے ہاتھ بڑھائے۔ ''میں تمہارے برآمدے میں اپنے اسکیٹس پہن سکتا ہوں؟'' چھوٹی سی آواز میں اس نے سوال کیا۔

اندھیرے میں وہ کرسی پر سے اٹھی۔

''باہر جاؤ.....'' وہ دفعتہً چیخی..... ''چلو۔ واپس جاؤ۔'' اور بچے کو مخاطب کر کے ڈانٹنے کی بجائے وہ دیوار کے قریب بچھی ہوئی سیٹی پر اوندھی گر گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''نیچے جاؤ۔ چلو فوراً بھاگو یہاں سے۔'' روتے روتے وہ پھر چلائی۔

ٹونی نے اپنی پشت پر ہاتھ باندھ کر ایک لمحے کے لئے اس کو حیرت اور غور سے دیکھا۔ اور افسوس سے سر ہلا کر نیچے اتر گیا۔ بڑے انسانوں کی بعض حرکتیں اس قدر عجیب و غریب اور مسخرے پن کی ہوتی ہیں۔ اس نے خیال کیا۔

''ای ہو..... ویٹ از سم ڈیم ابو.....'' پنیزی کے پھولوں میں واپس پہنچ کر اس نے کہا اور پھر رائے روجرز کی کتاب نکال کر اس کہانی کے تیسرے باب میں منہمک ہو گیا۔ جس میں رائے روجرز نے چار ڈاکوؤں کو پکڑ کر مارا تھا۔

لندن لیٹر

دیباچہ:

معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زنانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیز سعیدہ بانو سلمہا اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں۔ بمبئی سے دلہن بھابی نے جو آم کا اچار میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندوستان دوکان میں مرچ اور مسالہ بہت مہنگا ملتا ہے۔ ایک شلنگ کی ایک پڑیا دھنیے کی سمجھ لیجئے۔ گرم پانی کے پائپ کے ذریعے میرا کمرہ گرم رہتا ہے (پھر کچھ لینڈ لیڈی کا ذکر خیر ہوتا تھا) یہاں آپا جانی زمین دوز ریلیں چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مفصل بیان) میں نے کل یہاں پلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا (ہندوستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لئے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا زکام اب کیسا ہے۔ اگلے خط میں میں برائٹن اور بلیک پول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دور افتادہ بہن ''سعیدہ''

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دور نزدیک سے رشتے دار عزیز

دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اپنی باقی عمر وہ وطن کے کسی گمنام مدرسے میں ہیڈ مسٹرس یا پھر اسکول انسپکٹرس بن کر گذار دیتی تھیں اور قصہ ختم ہو جاتا تھا۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دوسری اقسام کا بیان عرض کروں گی۔ ایک آغا اشرف کا ''بی بی سی سے آداب عرض'' تھا کہ کس طرح انگریز ناتسی بمباری کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور فتح انشاءاللہ اتحادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا چھپتا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ کل ہاؤس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ہائی کمشنر سے میں ملا..... اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں آج کل کینیا خوب پھول رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹا کم کر دیا ہے۔ آئندہ اگلے ہفتے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ ''تماشائی'' اور ''آئینے'' کا نامہ نگار خصوصی ان حسین و جمیل رسالوں کے کالموں میں یوں رقم طراز ہوتا ہے۔ ''پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملبوس دیکھا جو انہوں نے مجھے بتایا کہ جنیوا میں خریدی گئی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے۔ جنہیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دل کش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل اسکیٹ میں بھی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسلز کی ایک گمنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرہ دستیاب ہو گیا۔ مس فلاں جو مہاراجہ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں، کمانڈر صاحب کے اس کیمرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کو بھی فوٹوگرافی کا

بہت شوق ہے.....وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے یہی گوسپ ہوتی ہے۔ یہی خبریں، یہی لوگ۔

ان بین الاقوامی طیارہ گاہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھئے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ ادھر آ جا رہے ہیں۔ بغداد۔ بیروت۔ استنبول۔ روم۔ پیرس۔ جنیوا۔ نیویارک، کیا گہما گہمی ہے۔ کیا کانفرنسیں اور گارڈن پارٹیاں ہیں۔ اللہ اکبر

آیئے۔ کیوں نہ ''لندن لیٹر'' کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ ہارون الرشید کا عراق جہاں چاروں طرف بیکراں ریگستان ہیں اور جھلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نظر آ جاتی ہے۔ یا کوئی بدو خچر پر بیٹھا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ یا کبھی کوئی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اڑن قلعے پرواز کر رہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے؟ کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے نگڑ دادوؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحر ظلمات میں کیا سرپٹ گھوڑے دوڑائے تھے!!؟ مشرق وسطےٰ کے شہروں میں اب آپ کو صرف اطالنتک پار کے رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے۔ بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔

اس ریستوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکا کولا کے اشتہار لگے ہیں۔ ایک آدھ عراقی مادموذیل اونچی ایڑیوں کی سینڈل پہنے

سرعت سے گیلری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے۔ اطلانتک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے ہیں۔ یو۔ این۔ او نے انہیں یہاں عربوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستیوں میں جا کر دوائیں تقسیم کرتے ہیں۔ اور اپنے کیمروں سے تصویریں اتارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرق وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیپ پر جا رہا ہے۔ جس کے پیچھے پیچھے عرب بدو کا اونٹ بھی ہے (تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے) اس کے نگڑوا دار چرڈ شیر دل کے ساتھ مسلمانوں کو قلع قمع کرنے آتے تھے۔ اب وہ انہیں تہذیب سکھانے آیا ہے۔ اگر یہ لوگ اڑ کر وہ صلیبی جنگیں نہ کرتے اور جبھی یورپ کا لوہا مان لیتے اور ساتھ ساتھ عیسائی بھی ہو جاتے تو انہیں کاہے کو یہ برے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہر حال یہ انڈر ڈیولپڈ ممالک ہیں۔ اور یہ عالمگیر ہمدردی اور بھائی چارے کا زمانہ ہے۔ اور اس ایمرجنسی پیریڈ میں تثلیث اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک محاذ پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔

توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ جس میں موی ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ مادموذیل ام ریحان اور شرلے ٹمپرز میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور مادموذیل ام ریحان۔ بلکہ ان کے ساتھ خود ہماری اپنی نرگس اور ثریا اور مدھوبالا اپنے اسٹریم لائینڈ.....شام کے لباس

میں سب ایک ساتھ آواگارڈنر کے ساتھ فخر سے سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہیں)
بہر کیف تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ میری رسولؐ اور میرے امامؑ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل وصورت کے رہے ہوں گے یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امامؑ مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا۔ میرے اوپر کافی جذباتیت کی موڈ طاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی۔ کوکا کولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی۔

وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آرکسٹرا نے 'بلوز' بجانے شروع کر دیئے ہیں (ii) عرب بڑے سے مشہدی رومال سے اپنی پیشانی صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بوڑھے عرب! تم جو ایک پوری تاریخ کے، ایک بہت عظیم تمدن اور روایت کے بہت بیچارے نمائندے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں یہ مودیز کا رسالہ ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں، تمہارے پرکھوں نے تو مولا علیؑ اور جناب عباسؑ اور جعفر طیارؓ کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے ہوئے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمہارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کوکا کولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو۔ میرے بھائی! میرے پیارے ساربان.....!!

یہ بیروت ہے۔ یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور سمبل، کیا شاندار ترک ہے۔ پلونہ اور ادرنہ اور سالونیکا سب

ایک جھٹکا کے ساتھ کانوں میں گونج گئے ۔وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یو۔ این ۔او کا ایک اہم رکن ہے کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا ..... اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اسے سنایا جو میرے ابا کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے اس کے گوش گذار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا وہ اطمینان سے صرف یو۔ این ۔او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی ۔اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں، کامران لوٹنا..... !! بیٹوں کو لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

ادھر دو برطانوی بیٹھے ہیں ۔ہم فلاں فلاں کو سبق سکھا دیں گے ۔وہ آپس میں کہہ رہے ہیں ۔تذکرہ غالباً تیل کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن پنجابی ہندو لڑکا کھڑا ہے۔ جانے وہ یہاں کدھر سے آ نکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا ..... اردو بھی مطلق نہیں بول سکتا۔ میں نے ساڑھے چار سال کے طویل عرصے کے بعد ڈپلومینک کور کے افراد کے علاوہ پہلی بار آج ایک عام ہندو کو دیکھا ہے۔ حق ہمسائیگی ادا کرنے کے لئے میں

اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی بولتا ہے۔ جو میرے پلے نہیں پڑتی۔ مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے۔ جب میں کوشش کر کے زندگی میں پہلی دفعہ پنجابی میں باتیں کرتی ہوں..... قومی یا ملکی یگانگت کا عجیب وغریب احساس! ترک اور انگریز اور فرانسیسی دو رجنگلے کی دوسری طرف کھڑے رہ گئے ہیں۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا سمندر کے کنارے کنارے بکھرا ہوا بیروت دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ سمندر، نیلا میڈی ٹیرئین! نیلے میڈی ٹیرنین اور لبنان خدا تم دونوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے!! لبنان .....! خلیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کیتھولک لڑکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے ٹہلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں ان کے سنہری اور چاکلیٹ بال جھلملا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کیتھولک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرنچ بول لیتی ہو؟ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

فرنچ ویری گڈ۔ انگلیس نو..... پھر وہ خوشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ ان کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے، سکون سے مسکراتی ہے۔

یہاں دور دور انجیر اور زیتون کے درخت ہیں۔ جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی کیتھولک خانقاہیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے سایہ دار خوابیدہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پیکارڈ یا جیپ تیزی سے اس الوہی سکون کو منتشر کرتی

ہوئی گذر جاتی ہے۔

پھر سائیپرس ہے۔ سارا ترکی پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، چٹیل میدان، گیہوں کے کھیت، قہوہ خانے، بحیرۂ اسود، باسفورس، استانبول، پریوں کا شہر، روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں کا دارالسلطنت۔ کوئی چیز نئی نہیں، وہی گلیاں ہیں، وہی مسجدیں اور پل اور بازار۔ جب میں بہت بچپنے میں ان جگہوں پر آئی تھی۔ اس وقت کی یادوں کو کوشش سے اکٹھا کر کے میں نے اس زمانے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں.....؟؟

اجی قبلہ بہت فرق ہے۔ طیارہ گاہیں اور بن گئی ہیں۔ فوجی چھاؤنیاں ٹریکٹرز تک کھیتوں کی نرائی کے لئے منگوائے جا رہے ہیں۔ مذہب کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔

نامق کمال کا ترکی۔ اتاترک کا ترکی۔

میرے پیارے بابا، سجاد حیدر یلدرم کا ترکی۔

اور اب باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں اباصوفیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے ناچتے تھک گئی ہیں۔

اور اس شفق کے دھندلکے میں سارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الپس۔ جرمنی

المانیہ! آہ المانیہ!! (واہ المانیہ!!!)

بون ۔کولون ۔فرینک فرٹ

ان ناموں میں کتنا سحر ہے اے معزز ناظرین ۔لوہے کا جگمگاتا شہر فرینک فرٹ۔

فراولین کیا چاہئے؟ ایک ویٹر جھک کر پوچھتا ہے۔

فراولین کے پیارے بھائی فرٹز ۔تم تو ہٹلر یوتھ میں تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہئے ۔بڑا کنفیوژن ہے، بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔

مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم ۔کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے۔ برسلز ۔برسلز ۔گرجاؤں میں شام کی عبادت کے لئے گھنٹے بج رہے ہیں ۔ان کی گونج شمال کے کہر آلود سمندروں پر پھیلتی جارہی ہے۔

حضرات میرے پاس وہ کیمرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برسلز میں خریدا ہوتا تو کمانڈر فلاں کے ساتھ میں اس کے متعلق تبادلہ خیالات کرتی ۔اول تو مجھے فوٹو گرافی اچھی طرح سے نہیں آتی ۔دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں ۔کیونکہ میرے پاس وہ ٹورسٹ رویہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہٰذا ناظرین ، اب میں باسم سبحانہ' لندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔

دیباچہ ختم ہوا۔

حضرات! اس ہوش ربا، دیوزاد پری پیکر عروس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی و روحانی تعلق ہے۔ ذری آنریبل جان کمپنی کا خیال کیجئے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لئے یہاں سے لنگر اٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں۔ کیا کیا توپیں دغی ہیں۔ اللہ اکبر۔ چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ اور رونسٹن چرچل کے اوراق بھی ان گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگا لیجئے کہ پچھلے اسی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انہوں نے شعلہ بار تقریریں کیں ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور ایمنک منٹ میں آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جدوجہد کی ہے۔ ہمارے نیتاؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکر لی ہے۔ اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھئے کہ بالآخر ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں سے گویا ایک بار اتر

گیا۔ اب ہم یہاں ایک ہلکے پھلکے ضمیر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیتا اب لڑائی لڑنے کے لئے نہیں بلکہ بکنگھم پیلس کی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرتی ہے۔ تو ہم مطلق اس کا نوٹس نہیں لیتے۔ بلکہ جی بھر کے اس کے کمروں کو گندہ کرتے ہیں، اس کے وال پیپرز پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اس کے پردوں سے اکثر نظر بچا کر انگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔

یہ سب اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ بھلا ہم میں اور مثلاً ..... مثلاً ..... کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں، کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلمہ گو رہتا ہے۔ کئی مسجدیں ہیں۔ ایک آدھ فرزند کلیسا بھی گاہے بگاہے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے ملاح ہیں جو مختلف بندرگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں نوے ہندوستانی اور پاکستانی ریسٹوران ہیں۔ ہمارے ان گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری بیگمات ہیں، جب کوئی خاتون زرتار ''غرارہ'' پہنے سڑک پر سے گذر جاتی ہیں تو واللہ دیکھنے والوں کی طبیعت گلیڈ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا نا ..... بڑی گہما گہمی ہے۔

ہندوستان والوں کا بھی یہی احوال ہے۔ انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے نادر قلمی نسخے، مغل تصویریں اور ساری تہذیبی خزانے محفوظ ہیں۔

جس کی دیواروں پر سے میرے گورو ایل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کی جانشین، نئے بھارت کی سررنگ بالائیں اپنے دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ تلک جینتی منائی جاتی ہے۔

جی ہاں..... یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

سویز کے ادھر رہنے والوں کی اس نئی دنیا کی جھلک جب انگریز اپنے ملک میں دیکھتا ہے تو اسے بڑا اچنبھا ہوتا ہے۔ ساریوں اور ہندوستانی آرٹ کی تعریف کرتے کرتے اب اس کا حلق خشک ہو چلا ہے (میرے پاکستان پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں۔ جب میں اس ضمن میں 'ہندوستانی آرٹ' کا ذکر کروں گی۔ کیونکہ جب یہ لوگ لفظ پاکستان سے ہی زیادہ واقف نہیں تو پاکستانی آرٹ وغیرہ کا تذکرہ تو بہت دور کی بات ہے) ہندوستانی رقاصوں کے ایک ڈانس پروگرام سے اس ملک کی جتنی پبلسٹی یہاں ایک شام میں ہو جاتی ہے اس کا تدارک یا مقابلہ ہمارے ایک ہزار پمفلٹ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کتنا ہی ان کو اپنے ریفیوجی پرابلم، اپنے کشمیر کے کیس، اور اپنی ترقی کی اسکیموں کے متعلق بتائیں۔ لیکن پڑھے لکھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ جاننے کی مطلق خواہش یا پروا نہیں کہ ہمارا سکھر براج کیا شے ہے۔ یا ہم کتنی جوٹ ملز قائم کرنے والے ہیں۔ جبکہ شیریں وجیفدار کے بیلے یا نمی اور دلیپ کمار کی فلم 'آن' کو دیکھنے کے لئے لندن کا ایک عام شہری گھنٹوں لیسٹر اسکوائر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیو لگائے صبر و اشتیاق سے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن بہر حال، یہ

بالکل ایک دوسری بحث ہے۔

لندن کی کلچرل زندگی میں آرٹ کی نمائشوں، تھیٹر، اوپرا، بیلے اور کونسیرٹس کے ساتھ ساتھ ہندوستان رقص کے مظاہرے بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اب غالباً 'آن' کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ نمی جو پچھلے دنوں یہاں آئی ہوئی تھی اسے یہاں کے پریس نے کافی پبلسٹی دی اور برطانوی اور امریکن پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

نمی کے ذکر پر خیال آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

''آن' انتہائی بکواس فلم ہے۔ جس میں تازہ ترین موڈل کی کیڈی لیک کاریں اور تلواریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ڈویل لڑے جاتے ہیں اور ان سب لغویات کا اعلیٰ پیمانے پر ٹیکنی کلر مظاہرہ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں صرف ''چونی والوں'' کو بہت پسند آ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے چونی والے طبقے کی افتادِ طبع ساری دنیا میں تقریباً ایک سو ہے۔ ہالی وڈ کی اسی فیصدی تصویریں اسی عالمگیر طبقے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آن کے مقابلے میں ''ہم لوگ'' یا ''دھرتی کے لال'' یہاں ایک روز بھی نہ چال پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں پر صدیوں سے موجود ہے، یعنی مہاراجہ کے ہاتھی گھوڑے اور تلواروں کی لڑائیاں اور سونے کے محلات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بخیر و خوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا نائٹس برج میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکی اور سٹی آف لندن کا بنک کلرک خوش خوش گھر لوٹتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گلیمر کی

ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے انٹلکچوئیل اور بڑے مشہور کریٹک نے کہا کہ عالمگیر نمائش کے لئے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائریکٹر محبوب کو اطالوی فلم ''سائیکل چور'' دیکھنی چاہئے تھی یا دو چار فرانسیسی فلمیں، میں نے عرض کی کہ پہلے ہالی وڈ کے ان سارے ڈائریکٹروں کو بھی ''سائیکل چور'' دکھلائیے جو ''قسمت'' اور ''دمشق کا چور'' اور ''سلیو گرل'' اور ''بغداد'' جیسی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ یا جن حضرات نے ''کم'' تیار کی ہے۔ محض مسٹر محبوب کی ذہنی تربیت کے آپ کیوں اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا عکاس ان کا پریس ہے سنسنی اور تہلکہ ان کی مرغوب ذہنی غذا ہے۔ صرف بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ٹائمز مانچسٹر گارجین یا نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لئے وہ اخبار نکلتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا، ڈکیتی اور اسکینڈلز کا ذکر ہوتا ہے۔ ارسٹوکریسی اب یہاں آخری سانس لے رہی ہیں۔ لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر بے حد اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ فلاں کے بیٹے آنریبل فلاں نے کل رات مے فیئر میں اپنی پارٹی کے لئے شیمپین کی اتنی بوتلیں پیرس سے منگوائیں اور اسپین کی خانہ بدوش رقاصاؤں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھ گھنٹے کے لئے میڈرڈ سے بلوایا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی۔ یا یہ کہ کاؤنٹس فلاں اتنے منک کوٹ لے کر اطالوری ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔''

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض بعض تفصیلات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ، اور فٹ بال پول اور کرکٹ کا

اس قدر شیدائی ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورت حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈارلی ان کے لئے بہر حال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک ضرور موجود ہے۔ پچھلے دنوں یہاں روسی فلم ''زوال برلن'' دکھلایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے۔ ''برطانیہ ایک آزاد ملک ہے۔ اور ہم اس کے باشندے، اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں اور روسیوں کو فتح ان کی بے مثال بہادری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے۔ وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارف کے ساتھ امریکہ میں قطعی نہ دکھلایا جا سکے گا۔

آزادئ تقریر کا دوسرا مشہور و معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں لکڑی کے ڈبوں پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کے سیاستدان، ایجی ٹیٹرز، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہتے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کمیونسٹ پارٹی کا پوسٹر لگائے جراثیمی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے۔ ان سے دو قدم ہٹ کر ڈین آف کنٹربری کے خلاف چلا چلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہو گا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت

خداوند تعالےٰ کو سخت وسست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر یسوع مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک نومسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی جوش وخروش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سنتا ہے اور اسی طرح قہقہے لگاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

آزادئ تقریر محض ہائیڈ پارک تک ہی محدود ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے ٹائمز نے اس پر بڑا زوردار نوٹ لکھا کہ یہ رویہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے تو ہم ان کو ٹائمز بھی بیچنے کے لئے نہیں دیں گے۔ کیونکہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائمز یا کسی اور اخبار کے لئے بھی یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آزادئ تحریر پائندہ باد۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نیوز اسٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسٹ اینڈ اور چوراہوں پر پارٹی کے افراد اسے فروخت کرتے نظر آ جائیں گے۔

ایسٹ اینڈ .....!! پکیڈلی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ وائٹ چیپل یا اسٹیپنی گرین اتریئے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بمباری سے تباہ شدہ محلے ہیں اور دھوئیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ جہاں کی سڑکوں پر سے آپ رات گئے تنہا گذریئے تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی۔ ناتسیوں نے اپنی بمباری کا

نشانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا۔ جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجان آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنونشن نہیں ہے۔ ہر شخص بے حد دوستی کے موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان گنت ہندوستانی، پاکستانی اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برسوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ان کے لباس بھی اتنے ہی بدنما اور شکستہ ہیں۔ جتنے ان کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک ہندوستانی طعام خانے ہیں۔ جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نیگرو لڑکے اچکتے رہتے ہیں۔ ایک چائے خانے میں ایک روز ہم لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لیگ کا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس پر قائداعظم اور ہماری کیبنٹ کے افراد کی تصویریں تھیں۔ بے رنگ کرسیاں اور بھدی میزیں تھیں۔ ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤنٹر پر سے سیاہ فام، غالباً سلہٹ کا رہنے والا ویٹر چلایا۔ ''ون ٹی۔ ون رول''..... جین مین کراچی کی بندر روڈ کا کوئی ریستوران معلوم ہوتا تھا۔ ڈورچسٹر، کلریجز، مے فیئر؟ ..... جی ہاں۔ ان الف لیلوی جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل چکر میں آ جاتی ہے اور آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چائے خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان محض دریائے ٹیمز کا مغربی کنارہ ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور پیٹی کوٹ لین میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں ہیں۔ مونگ پھلی بیچتی ہوئی بڑھیاں سیکنڈ ہینڈ

مال کے انبار دور و یہ فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے نخاس کے بازار میں تھا۔ ذرا فرق نہیں۔

پھر یہ گلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر، ملبے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت کانے، یہاں سے تو کوئی پیکارڈیا سن بیم بھولے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں اور پھر چینل عبور کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا چھّم ہے۔ جس پر کہرہ چھایا ہوا ہے۔ کہرا جو چھّم کے سمندروں سے اٹھتا ہے۔

نیچے نیلا میڈی ٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم جو مارکوئس آف ٹوڈل ڈو کے ساتھ پندرہ منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

میری پیاری دوست خایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل سلم لینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے اجتماعی فارم دیکھو ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا جذبہ۔ ہمارے سامنے وہی مسائل اور دقتیں ہیں جو تمہیں درپیش ہیں۔ نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکر لے رہی ہے لیکن پھر بھی ہم اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور تم میں، یا ہم میں اور عربوں میں کیا فرق ہے۔ وہ خاموش ہو گئی۔

.....ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کر لیں۔لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا۔تا کہ مشرق وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے۔

وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔خایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔خایا روسی نژاد ہے۔یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔خایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ایک تو یہودی ویسے ہی بہت دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔اس لئے خایا کو کیمبرج میں عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔خایا یعنی حیاء،یعنی حیات،عبرانی میں خایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سمبل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ علاوہ ازیں میرے ملک نے خایا کو سرکاری یا اخلاقی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔میں خود خایا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔اس نے اپنے دستی بموں سے کتنے ان گنت عربوں کی جان لی ہو گی یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔وہ اطمینان سے بیٹھی پیانو پر کیکوسکی بجاتی رہتی ہے۔جب وہ جذباتی ہو جاتی ہے تو روسی گانے الاپنے شروع کر دیتی ہے روسی اس کی مادری زبان ہے۔عبرانی مذہبی اور سیاسی ، انگریزی، ادبی، اور فرنچ اس کی کلچرل زبان ہے۔وہ بڑی کٹر اینٹی برٹش آدمی ہے۔فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔سیاسی طور پر وہ

اشترا کی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ان سرد مزاج انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پراسرار اور پرکشش نظر آئی ہے۔ پائندہ باد خایا یعنی حیات۔

اس وقت خایا ڈاکٹر الٹ ملر سے ایلیٹ کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملر ہمبرگ کا انٹلکچوئیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ نمستے کہتا ہے اور 'ماری' کہہ کر پکارتا ہے۔ کیونکہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ''جرم سزا'' کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا پروفیسر ہے۔ یروشلم کی انٹلکچوئیل خایا کی ہمبرگ کے اس انٹلکچوئیل سے بالکل نہیں بنتی۔ کیونکہ خایا کو جرمنوں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملر کی عدم موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے۔ ذرا دیکھو تو اس منحوس مہا کوی کالی داس کے بچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے ہزاروں روسی یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمہارا وطن کہاں سے آیا۔ تم اسرائیلی ہو۔ میں اس سے بگڑ کر کہتی ہوں۔

یوکرین میرا وطن بالکل اسی طرح ہے جس طرح صوبہ متحدہ تمہارا وطن ہے، حالانکہ تم پاکستانی ہو۔ وہ چلا کر جواب دیتی ہے۔

.....اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں.....!! رونلڈ دوسرا سگریٹ رول کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ رونلڈ برطانوی ہے قوم کا اینگلو سیکسن اس گروہ کا ایک اور انٹلکچوئیل، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم

سب کی طرح بے تحاشا حاوی ہے۔ اور اپنے آپ کو ڈاکٹر لیوس سے زیادہ سمجھدار نقاد خیال کرتا ہے ڈاکٹر لیوس سے جو کیمبرج کے بڑے گروؤں میں سے ہیں۔ وہ اکثر الجھتا رہتا ہے۔ تم برصغیر ہند کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر الٹ ملر کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسٹفر لی سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کوسٹفر لی لوئی مک سنیس کے رفقاء میں سے ہیں۔ اور جدید شاعروں اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ابن خلدون کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے ان دونوں سے کہتی ہوں..... مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگور ہی نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور امام غزالیؒ اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجئے..... لیکن بھلا آپ عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا.....؟

ہم خطرناک پانیوں کی طرف..... رونلڈ آہستگی سے تیسرا سگریٹ جلا رہا ہے۔

چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک پانی ہیں۔ اور ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔

کیم آہستہ آہستہ بہتا جا رہا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سینکڑوں برس سے یونہی بہتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پرم روز کھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امنڈ رہے ہیں ویپنگ ونور کی شاخیں پانی کی سطح پر جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھول اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پل یہ انڈر گریجویٹ بحثیں سنتے آئے ہیں۔ بے حد

پرسکون ۔اور بے تحاشا خوبصورت منظر ہے جو کرسمس کارڈوں اور کیلنڈروں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے ۔چیری کے درخت ہیں اور ان میں چھپے ہوئے کاٹج اور ٹی گارڈن گرانچسٹر ہے ۔ جہاں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر، گرانچسٹر۔گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹ بروک کے میموریل پر ایک اکیلی ریتھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے گڈ اولڈ یونین جیک.....!! کوئی آہستہ سے کہتا ہے.....ہولی ڈے میکرز اور انڈر گریجویٹس کناروں پر دور دور تک ٹولیوں میں منتشر و یک اینڈ منا رہے ہیں۔ پانی کی لہروں پر ان گنت ڈونگیاں تیر رہی ہیں۔ابھی قریب سے جو نپٹ گذری ہے۔ اس کے سرے پر کھڑی ہوئی خایا نے جوش میں آ کر زور زور سے کوئی عبرانی لوک گیت شروع کر دیا ہے۔جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ڈاکٹر الٹ ملر آہستہ آہستہ ایک جرمن نغمہ الاپ رہا ہے۔ڈاکٹر نینسی کارلن و نیگرو روحانی گیت گنگنانے لگتی ہے۔انٹرنیشنل سمفنی شروع ہو جاتی ہے۔

''تم بھی کوئی ہندوستانی ، میرا مطلب ہے پاکستانی گانا گاؤ.....'' رونلڈ ذرا خفگی سے مجھ سے کہتا ہے۔نینسی آنکھیں نیم وا کئے اپنے وطن جنوب کے PLANTATIONS کے گیت گا رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارلن ۔یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔اس کی دادی حبشی سلیو گرل تھی۔جسے نیو اورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

لہٰذا اس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا۔ اور امریکن ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر مقالہ لکھ کر اس نے کولمبیا سے ڈاکٹریٹ لیا۔ اب وہ جنوب کی کسی بہت بڑی نیگرو یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔ نینسی بے حد پیاری لڑکی ہے۔ ہر وقت بشاش رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہے۔

''دیکھو..... تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسورتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔ لیکن نینسی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سمے ہنستی اور دوسروں کو ہنساتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلر پرولبم کے بارے میں تمہاری ہی طرح حساس ہے..... بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں.....'' رونلڈ مجھ سے کہتا ہے۔

نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں۔ جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب سے بڑے ذہن پرست ہیں۔ مثلاً یہ لڑکا رسل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے بلند پایہ نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایذرا پاؤنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نینسی ان سب کی دوست ہے کیونکہ بہر حال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی پکی امریکن ہے لیکن ان سب سے مختلف ہے۔ ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ نینسی، خایا یا رونلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس سے کتنی گمبھیرتا اور کتنے دکھ سے وہ 'نیگرو روحانی نغمہ' الاپ رہی ہے۔

نینسی کارلن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریک فاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا ''ہلوٹوپسی.....!!''

نینسی نے اس سے کہا۔'' دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوپسی کہہ کر پکارا ہے۔لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔''

''اوہ.....آئی ایم سوسوری ڈیر.....''انگریز لڑکی نے جواب دیا۔اور خاموشی سے پارج میں مصروف ہوگئی۔

''تم نے دیکھا.....''بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہوکر آہستہ سے کہا۔''یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تم سمجھتی ہونا.....میرا مطلب ہے کہ.....''

''الفاظ میں کیا رکھا ہے.....!!؟'' رونلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے کاہلی سے سوال کیا۔

''الفاظ.....؟ آپ کسی چینی کا چائنا مین کیوں کہتے ہیں اور کیا تم کو پتہ ہے کہ لفظ 'ایشیاٹک' کے پیچھے کتنی حقارت چھپی ہوئی ہے.....؟؟''میں نے جواب دیا۔

''اوہو.....!!اسی لئے اب تم لوگ اپنے آپ کو ایشیاٹک کے بجائے ایشین کے نام سے یاد کرتے ہو.....!''رونلڈ نے کہا۔

''جی ہاں جناب۔''میں غصے سے کود کر دریچے میں جا بیٹھی۔

''اچھا۔اچھا۔ایشین،ایشین،ایشین.....!!ٹھیک ہے؟''رونلڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہائے۔''میں نے نقل اتارتے ہوئے جواب دیا۔

سورج کنگز کالج کے پیچھے غروب ہوتا جا رہا ہے۔کورٹ یارڈ پر سائے طویل ہونے لگے ہیں۔پیٹر ہاؤس کوئنز کالج۔ایمونیل سڈنی سسکس۔ان ساری سحر انگیز عمارتوں پر تاریکی چھا رہی ہے۔تاریکی میں ایسا لگتا ہے کہ ابھی ان صدیوں پرانے گھسے پتھروں والے کوریڈوز میں سے قرون وسطیٰ کے راہب اور اسکالر کالے گاؤن پہنے شمعیں لئے ادھر سے ادھر گذر جائیں گے۔ان کمروں میں،ان سیڑھیوں پر اور ان کورٹ یارڈز کے درختوں کے نیچے کرسٹفر مارلو روجر بیکن، اولیور کروم ویل اور ان کے بعد کیٹس، بائرن اور نہ جانے کس کس نے اپنے طالب علمی کے زمانے بتائے ہیں۔اس پراسرار نیم تاریک ماحول میں اب تک ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

کیم اسی طرح بہتا رہے گا۔

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔بارش ابھی تھمی ہے۔فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی ہے۔تیز سبز گھاس نم ہے اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔پورب کے کھیتوں اور کنجوں پر بھی یونہی بارش ہوتی ہوگی۔پھلیندے اور کھرنی کے درختوں پر،بخشی کا تالاب اس وقت پانی سے بالکل لبریز ہو گیا ہوگا اور پیلے کنول وہاں تیرتے ہوں گے۔گومتی کے کاٹھ کے پل پر سے لوگ چولائی اوبھتوے کے جھوے اٹھائے ساون الاپتے گذر رہے ہوں گے۔

نوسٹیلجیا.....!!؟ نینسی آہستہ سے دریافت کرتی ہے۔لان پر ہمارے ساتھی

ادھر ادھر گروہ بنائے گھاس پر بیٹھے پروگرام کے مختلف حصوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں شاہ بلوط کی لکڑی کی دیواروں والے نیم روشن کمرے میں اس اسکٹ کی مشق کی جا رہی ہے۔ جو ہم نے ایلیٹ کے ''سوینی ایگنسٹیس'' کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ ہم ایک ایک جملے اور سین پر قہقہے لگاتے دہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی وائلن پر دیبر بجا رہی ہے۔ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کا اطالوی طالب علم گٹار بجا رہا ہے۔ آتشدان کے اوپر سے لیڈی سڈنی کی روغنی تصویر کاہلی سے جھانک رہی ہے۔ جنہوں نے پندرھویں صدی میں یہ کالج قائم کیا تھا۔

رسل فریزر فرش پر پڑے ہوئے گھنگروؤں کو بڑے غور اور دھیان سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ نینسی کارلن پیانو پر تن دہی سے وہ دھن بجانے کی کوشش کر رہی ہے جو میں نے ناچ کی لے کے لئے اسے سکھائی ہے..... رے واگے بندرابن میں بانسریا کھوب کھوب بجا دینا..... رے واگے۔

دھیم تانا دھیری نا تانا، دھی ری نا دھیم..... سب مل کر الاپنے لگتے ہیں۔

ٹیرفک!! رسل فریزر چلا کر خوشی سے کہتا ہے۔

ان سفید قوموں کا آرکسٹرا اب بندرابن کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انہوں نے آج تک نہ سنی تھیں۔ سب کے سب بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہیں۔

اوہ بوائے!! نینسی چلا کر کہتی ہے۔

کیا کلچرل ہارمنی پیدا ہوئی ہے واللہ!! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فارسٹر مجھ سے کہتے ہیں..... میں ہندوستان کو بھلا کس طرح بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں!

یس سر۔ میں کہتی ہوں۔

خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔

یس سر۔

تمہاری تہذیب۔

یس سر۔

تمہاری ساری جدوجہد۔

یس سر.....ٹوچیرز فار ڈیموکریسی۔!

فارسٹر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر، جنوبی انگلستان پر، موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹرا سٹنوف، ایڈتھ ایوانز اور میری مارٹن کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی اور کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کئے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز ہے۔ اوورسیز لیگ کی بھوری مہیب عمارت ہے جس میں بوڑھے آئی سی ایس اور نو آبادیات کے سابق گورنر دن بھر چپ چاپ بیٹھے وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گڈ اولڈ جے پور ریذیڈنسی یا ڈیر اولڈ چھتر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں ۲۰ء میں یا ۳۰ء میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں میں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوٹس کیا جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں

رعشہ تھا۔ میں نے پیالی اسے اٹھا کر دی۔

انڈیا.....؟ اس نے دوستی کے انداز میں سوال کیا۔

پاکستان.....!! میں نے اسی بشاشت سے جواب دیا۔

اوہ.....ونڈرفل.....ونڈرفل۔

آپ کبھی برصغیر جا چکے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

ہاں! جا چکا ہوں.....جا چکا ہوں.....اس نے پیالی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سنبھال کر اٹھائی۔

کسی خاص جگہ؟

بمبئی!

اچھا۔ کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں یا ایسے ہی؟ میں نے اخلاقاً مکالمہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔

نہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں نہیں۔

اوہ۔ آرمی؟؟

نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟

ہاں۔ ہاں۔ کئی سال۔ کئی سال۔

کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں۔ میرا مطلب ہے، بمبئی میں؟

ار.....میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔

اوہ.....

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابل رحم ہے۔ان کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آ چکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈ اور کاؤنٹ جن کے پاس لمبے چوڑے خطابات ،طویل وعریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے،اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ تماشائیوں کو اپنے کتب خانے، اپنے نفیس بیڈ روم اور ڈرائنگ روم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے۔اس سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔''موت کے محصول'' نے ارسٹوکریسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔

انگلستان کے لارڈز اور لیڈیز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہٰذا اے مومنو! لازم آیا تم پر کہ عبرت پکڑو اور درود سے کبھی غافل نہ ہو۔ پڑھو درود!

اب خاں صاحب سے بھی مل لیجئے جو پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جوش کے قریبی عزیز ہیں اور غالباً کسی زمانے میں میرے ابا کے کلاس فیلو تھے جو اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اسٹوڈیوز کے پاکستان سیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود ان کا لب ولہجہ اب تک ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا ہے۔ اردو بولتے ہیں تو ہمیشہ تھیٹر کو تھیٹھر اور ویسٹ منسٹر کو ویسٹ مینیسٹر کہتے ہیں۔ سینما کو انہوں نے

ہمیشہ بائیسکوپ ہی کہا۔لکھنؤ کے پرانے داستاں گویوں کے انداز میں قصے سناتے ہیں۔تیس سال گذرے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ ہائیڈ پارک میں انہوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کیا۔ خلافت تحریک آرگنائز کی۔اخبار نکالے۔لائیڈ جارج کے پاس پہنچ جاتے تھے اور اس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کہ آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجئے۔

اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے۔لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔کوئی خاندان نہیں ہے، اکیلے رہتے ہیں۔اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت چچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چودھری محمد علی ردولوی کی حکایتوں میں اور چودھری محمد علی کی حکایتوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر دھننے والے ہمارے پاکستان میں بہت کم ہوں گے۔

موسم گرما بھی گذرتا جا رہا ہے۔سیاح ٹریفلگر اسکوائر میں میں کبوتروں کو دانے کھلا رہے ہیں۔ٹیٹ گیلری میں پکاسو اور رائل اکیڈیمی میں دادنچی کی نمائش ہو رہی ہے۔ پکیڈلی سرکس میں وہاں کی مشہور عالم، سڑک پر چلنے والی، لڑکیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اونچی ایڑی کے جوتے پہنے گہرا میک اپ کئے کونوں کھدروں یا فٹ پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو 'ہلو ہینڈسم' کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی..... ہارٹ آف دی ورلڈ.....!! مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ سینما گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ ایک خوبصورت جواب آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے بکس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

''سلام میم صاحب.....!!'' وہ ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے۔

میری بہت ہی پیاری دوست فیروز جبیں اس سے پوچھتی ہے۔ ''کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟''

''نہیں..... میں ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا۔ اس لئے ہندوستان نہ جا سکا!'' وہ مسکرا کر کہتا۔

''اچھا.....!'' فیروز اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

''ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا''..... فیروز دہراتی ہے۔ اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے اور ابھی ایک جنگ اور ہوگی؟؟''

سامنے سے اطلانٹک پار والے سپاہیوں کا ایک غول گذر جاتا ہے۔

میں اور فیروز سینما کے اندر جا کر لا روند دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

لا روند..... زندگی کا میری گورواند.....؟!!

تو بھائی فیروز یہ سلسلے ہیں۔ رات کو میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔ یہ ہمارا پرانا لطیفہ ہے۔ یونیورسٹی میں ہم جب اکٹھے پڑھتے

تھے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن بھر کے سارے ضروری واقعات، یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکینڈلز ایک سانس میں گوش گذار کرنے کے بعد میں فیروز سے کہتی تھی۔تو یہ سلسلے ہی بھائی صاحب.....!!

فیروز کھانا پکانے میں مصروف ہے۔ چاروں طرف ضخیم کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔اس نے لکھنؤ سے اردو میں ایم۔اے کیا تھا۔اب وہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور انڈیا ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ فیروز جبیں ہندوستانی لڑکی ہے۔ ہندوستانی طالب علموں کی تہذیبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ جدوجہد ہماری روایت ہے۔

اور یہ کملا ہے۔میری بچپن کی رفیق کملا جسپال جس کا ذکر آپ نے اس ناچیز خاکسار کے افسانوں میں اکثر پڑھا ہوگا۔یہ صاحب ہندوستان کی فارن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رکن ہے، پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈ 'گول' کر کے کالج سے بھاگی چلی آ رہی ہے۔اس کا فلیٹ چیلسی میں ہے۔لہٰذا آرٹ وارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔

کینیڈا کا 'انٹلکچوئل' تاریخ اور پولیٹکل سائنس کا ماہر ارنی بلیٹن برگ جا ملینی رائے کی ایک تصویر کو بے دھیانی سے الٹ پلٹ رہا ہے۔ ارنی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ ہے اور دوسری کچھ اور اسی قسم کی چیز ہے۔دونوں کتابیں بڑے پروگریسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔اپنی کم عمری کو چھپانے کے لئے ہر وقت بے حد سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروگریسو.....؟ افوہ..... افسوس یہ ہے کہ تم تو چھپّم کے زوال پرست انٹلکچوئیل بھی نہیں ہو۔ کولونیل انٹلکچوئیل ہو..... میں اسے جلانے کے لئے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچوئیل ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ اور پھر کینیڈا کی یہ مخلوق.....؟ افوہ..... یہ کولونیل لوگ بھلا کیا کھا کر انٹلکچوئیل بنیں گے۔ بھائی جو تمہارے باپ کے چین اسٹورز ہیں کینیڈا میں، انہیں میں مگن رہو (ارنی جب اپنی بے تحاشا طویل و عریض امریکن کار میں سڑکوں پر سے گذرتا ہے۔ خصوصاً کنٹری سائیڈ کے قصبوں کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے، تو راہگیر رک کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انگلش کاریں جوان کے سامنے بالکل کھلونا، ایسی دکھلائی دیتی ہیں۔ ارنی کی کار کی وجہ سے رک جاتی ہیں کیونکہ اس کی 'اوٹوموبیل' سارا راستہ گھیر لیتی ہے۔ اور اس ماحول میں بے حد غیر ملکی نظر آتی ہے۔ راہ گیر حیرت سے امریکن کاروں کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔)

اور پھر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ..... (جھگڑا جاری رہتا ہے) برطانیہ عظمیٰ کے انقلابات.....!! میاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔ دو سال میں ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ مہینوں اور ہفتوں میں دنیا ادھر سے ادھر کر دی جاتی ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریولیوشن گھسٹا۔ پھر اسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ بھائی دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔ آیا خیال میں؟ میں کہتی ہوں۔

کیا میلوڈریمٹک اپروچ ہے آپ کی.....!! جم کہتا ہے۔

اور کیا کومک اوپیرا آپ سب کا ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ میں چڑ کر جواب دیتی ہوں۔

ارنی خاموشی سے مسکراتا رہتا ہے۔ دراصل ارنی کو تو ایلسٹری یا ہالی وڈ میں ہونا چاہئے تھا۔ اسٹیورٹ گرینجر یا کورنیل وایلڈ اس کو دیکھ پائے تو چلو بھر پانی تلاش کرتا پھرے۔ ارنی روسی نژاد ہے۔ اور صنف نازک اسے بے انتہا خوبصورت سمجھتی ہے۔

لیکن ارنی واقعی بے حد پروگریسو ہے۔ نہایت سمجھدار اور خاموش قسم کا پروگریسو اور جو کچھ وہ لکھ رہا ہے ٹھیک لکھ رہا ہے۔ کیا تم لوگوں کو بھی اپنی تواریخ بالکل نئے سرے سے اور نئے زاویے سے نہیں لکھنی چاہئے۔ وہ پوچھتا ہے۔

کولونیل.....!!

ابھی ابھی جم اپنے ایسوسی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ جم بھی رونلڈ کی طرح انگریز ہے۔ جدید سنگتراشی اس کا مشغلہ ہے۔ اور چونکہ وہ بھی چیلسی میں رہتا ہے۔ لہٰذا اسے بھی اپنے آپ کو فن کار سمجھنے پر مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مصر ہے کہ وہ بے حد پریکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ 'نمستے' کرتا ہے۔ اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے گھول کر پی رکھے ہیں۔ گاندھین طرز زندگی کا سخت قائل۔ دنیا کے سارے پرابلمز کا حل صرف اس نے دریافت کرلیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی CELLS بنانے چاہئیں ان میں رہتے ہوئے اور ان سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے۔ اور زندگی لامحالہ نہایت سیدھی سادی اور پرسکون ہو جائے گی۔ اسی شخصی درجہ معرفت کی آئیڈیلزم کے چکر میں

اس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوسی ایشن کی طرف سے پچھلے دنوں چند اللہ والے مہاپرش کراچی گئے تھے۔ان میں فرانسیسی ،سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ لالو کھیت میں کئی مہینے مہاجرین کے ساتھ رہے۔ دن رات لگ کر انہوں نے مکان تعمیر کئے۔دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چٹائیوں پر پڑ کر سو رہتے تھے۔کیا روحانی بلندی ہے واللہ.....!! میں جم سے کہتی ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ جم مذہبی بھی نہیں ہے۔لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔بڑا سخت PACIFICT۔اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔اچھا خاصا جین مت کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہئے۔اور سب کو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہنا چاہئے۔

جم اگر خدا پرست ہوتا تو بڑا عمدہ رومن کیتھولک فادر ثابت ہوتا۔

گڈ اولڈ جم۔

کرشنا مینن ریٹائر ہو گئے ہیں۔جب تک وہ ہائی کمشنر رہے انڈیا ہاؤس میں انہوں نے اپنی رہائش کے لئے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔جس میں ایک طرف چائے بنانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار بکھرے رہتے تھے۔دن بھر اور رات گئے تک وہ خود چائے بنا بنا کر پیتے جاتے تھے۔اور لگاتار کام کرتے تھے۔کام میں مصروف رہنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔

اب آپ بنا کچھ کئے کیسے رہ پائیں گے؟ میں نے ان سے پوچھا۔

میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا کروں گا!! انہوں نے کہا۔

اب آپ کتابیں لکھا کیجئے۔ میں نے عقلمندی سے ان کو مشورہ دیا۔

غالباً وہ انگلستان میں مستقل رہیں گے۔ جس طرح ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ محمد علی خاں ملیح آبادی کی طرح وہ بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس وقت تو وہ ارنی کو جسے وہ کینیڈین بش مین کہتے ہیں، پراٹھے کھلا رہے ہیں اور وہ سالن میں مرچوں کی زیادتی کی وجہ سے سوں سوں کر رہا ہے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور راہ گیر کو دھندلی، پرامید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوتا ہے:..... یہ میں نے جھیل اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے، لیکن چونکہ چاک سے سارے رنگ اجاگر نہیں ہو سکتے۔ اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لئے تصویر ایسی نہ بن سکی جیسی میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گذارنے کے لئے کوئی جگہ، یا سونے کے لئے کوئی پلنگ نہیں ہے.....وغیرہ وغیرہ۔

سڑکیں سنسان ہو چلی ہیں۔ زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں متوسط طبقے کے باولر ہیٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں

قلعہ بند ہو چلے ہیں۔

کوئی سیاح اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا بدمذاق شہر ہے۔ جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں کل پیرس جا رہا ہوں۔ شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیے گئے ہیں باہر خنک ہوا چل رہی ہے کل سردی ہوگی۔ نیچے سڑک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے کھچے پرچے سمیٹ رہے ہیں۔ جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ایوا پیرون مر گئی۔ شاہ فاروق کو نکال باہر کیا گیا۔ مصدق رونے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور فیروز اور کملا اور خایا اور نینسی۔ اور ان کے علاوہ رونلڈ اور رالٹ ملر اور ارنی اور جم سب سو جائیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن بھی ختم ہوا۔

کل کیا ہوگا۔ یہی سوال ۳۸ء میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو!

اب تمہاری خاطر کوئی ڈینیئل فیصلے کے لئے نہ آئے گا۔

جلاوطن

سندر لالہ۔ بجے دلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں

ناچے سری ہری کیرتن میں

ناچے

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گموں والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلےٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

''بندگی بھین صاحب.....'' رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

''بندگی..... بندگی.....'' ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

''راجی کھسی ہو بھین صاحب۔'' رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

''اور کیا۔ مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے۔'' انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

''بھین صاحب ناج پھٹک رہی تھی۔''

''تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہئے۔ چل ہٹا سب چیز۔''

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں۔لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر لٹکا کر انہوں نے اپنی بہن کو آواز دی ..... جیجی ..... جی ای ای ..... جی ای ی ی ..... (چھورا ہے اب تلک مورا بھین ..... ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی آم اب پیلے ہو چلے تھے۔ ''ٹھکرائن کی بگیا'' میں صبح سے لے کر رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا ۔

''آوت ہن بھین صاحب .....'' ہیم کرن نے دالان کا پیتل کا نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلے کے گودام میں سے باہر آ کر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آ گئیں۔

''جے رام جی کی بھین صاحب۔'' رسویے نے چوکے میں سے آواز لگائی۔ ''کٹہل کی ترکاری کھیو بھین صاحب؟''

''ہاں۔ ہاں۔ ضرور کھیبا بھائی۔'' ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آ گئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں سالگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت۔ لیکن باقی

کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آ جائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہئے ابھی سرین رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیما کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا۔ اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمر کھیں اور کموہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھا کر دادھی نا کت تا۔ دھا کر دا۔ ارے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دمینتی سے کہا۔ ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سے کھیلتی ہے۔ دمینتی بھاگ گئی۔)

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے، خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کھیم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

''نمستے ماما۔ ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔''

''چل چڑیل..... بہانے باز..... سبق سنا پہلے.....'' ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ

کر پاتے تھے)

''تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا۔'' (انہوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

''ارے باپ رے!!'' کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

''اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری۔''

''ہی ہی ہی۔ ماما۔'' کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

''اور تو ساری بھی تو پہنا کر کہ فراک ہی پہنے پھرے گی۔ باؤلی سی۔'' (انہوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

جی ماما۔ کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے۔ مگر ہیم کرن پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ، دقیانوسی سریواستو اگھرانے کی بٹیا۔ پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے۔ اور جو تے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پانی پیتے تھے۔ اور گو وہ ہوئے ان کو اب سات برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر ان کا رعب تھا۔ کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں۔ دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے

ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے ان کی بی بی سرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ افوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونڈیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونڈیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کینا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے۔ ''نل دمینتی'' اور ''شکنتلا ہریش چندر'' اور ''راج رانی میرا''..... اور اوپر سے ڈانس الگ..... گربا بھی ہو رہا ہے کہ آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں..... نندلال اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی..... جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھرو اپانی..... اور ساتھ ساتھ مونڈیرا سین گپتا ہے کہ فرائے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول..... وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخر انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا..... چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سر پھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ ''روپ متی باز بہادر'' خواتین کے

سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں سے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کرڈالی۔ اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا۔

ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ.....

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا..... بنات اسلام کو رقص وسرود کی تعلیم ..... اسکول کو بند کرو..... (یہ سب قصے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدر اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

''کیوں ری۔ ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ.....؟'' ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا۔ جس کا جواب دینے کے لئے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دوٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کرسکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے۔ اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہیلاو دیالہ تھا۔ جہاں اسے بھیجنے

کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں۔ اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کا مربہ تھے کھیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اسکے بیشمار رشتے کے بھائی تھے۔ اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لاویں۔ (نوٹنکی کے دنوں میں رسویا تک لہک لہک کر گاتا..... اب یہی ہے میں نے ٹھانی..... لاؤں گا نوٹن کی رانی.....) کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لیے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ پل اوور بن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں

اور پل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آ کر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھین صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں ان کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ ''ضلع کے روساء اور مقامی عمائدین شہر'' میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے ان معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے ان کی کبھی نہ بنی۔ اعلیٰ کچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن ہیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا۔ اور ہر مسلمان کے اپنے دسیوں مشغلے تھے۔ احراء پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا شاعری کرتے تھے۔ یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے

کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیرسرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم بالے میاں کی برات۔ پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیش کار۔ سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤنی میں 'آؤٹ ڈور' مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے گموں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے..... حکیم مارکہ دھاگہ خریدیے۔ پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو۔ چائے جا کر ماں کو دو۔ آ گیا۔ آ گیا۔ آ گیا۔ سال رواں کا سنسنی خیز

فلم ''لہری راجہ'' آ گیا۔ جس میں مش مادھوری کام کرتی ہے۔

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ 'بیرے' انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اورسول لائنز کی اس دنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی۔ گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو چن چنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی۔ اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب

واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وے مسٹر سکسینہ اور وے مسٹر فرحت علی۔ اور وے مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک مسیا نے بھائی لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقی ماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جونپور ایسی ڈل جگہ پر مس مک کنزی کا دم وہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ٹھوڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے۔ گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی۔ کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردسر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جوان دنوں بڑی معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھر تھر کانپتا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ

صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی: ..... آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی ''غیر منسلک'' خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکٹیوٹی ہو گئی۔ تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع ''اسٹیشن'' کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جونپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اتروالو مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دیتی آنا ری رام رکھی جھاڑو پیٹی)

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی دعوت میں آ گئی تھیں۔ 'کلکٹر کی بیوی' سے ملنے کے لئے 'عمائدین شہر' کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو

پوری میم ہے۔غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ناک کی کیل تو گئی چولہے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

''اے لو بٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا۔'' صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پہ انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

''اے ہاں سچ تو ہے۔کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔دور پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے!'' بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کھیم کی تو بہر حال، آج عید تھی۔اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چھپکا اور مگر کشوری بھی بہن آئی تھی۔لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔کھیم دور سے بیٹھی کنول مکاری کو دیکھتی رہیں۔کتنی سندر ہے۔اور پھر ایم۔اے پاس، ایم۔اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول مکاری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگوا سے کہیں زیادہ اچھی اور

ملنسار ہے رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں۔ اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور اوپر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے مینیجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے۔ ''اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں۔'' تو ان کے حلق میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گذار کر دی کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی۔ ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی۔ اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلّہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور

لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی۔ اور اداسی۔ اور ذلت تھی۔ اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آ کر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے مولسرے کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری؟ لاحول ولاقوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے ان سے کہا تھا۔ ''آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ

جائے گا۔ جب میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''تم کہاں چلی جاؤ گی؟''

''فوہ..... لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں؟''

''گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کرلو گی۔''

''میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس۔ میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔'' اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

''ارے جاؤ.....'' آفتاب رائے خوب ہنسے تھے..... ''میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے.....''

''ہاں..... بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر.....'' وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی۔ اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوتی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن

اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے۔ اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا۔ (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا، منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا) عزت نے عسکری سے کہا تھا۔ استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں وپیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔

''بی۔اے کے بعد تم کیا کرو گی.....؟'' ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔'' کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً ان کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر ان کی آئیڈیالوجی تھی۔ (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پر ایک روز، لندن میں، جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے۔ تو راہ میں انہیں مہیپل نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی۔ ''چائے پینے چلو تو ایک واقعہ فاجعہ گوش گذار کروں۔ کنول ماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پینتیس کے بیچ کا ہے.....''

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے ''ا

ن کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی اٹھلکچوئیل کی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہوگئی ہوگی۔ اب گلیڈ..... جگن ناتھ جین مائی فٹ..... کون تھا یہ الو..... میں نے کبھی دیکھا ہے اسے.....؟'' مہیپال کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہیپال رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوکنی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اداس ہے۔ اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

''بیوقوف بھی ہے.....؟'' آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

''خاصا بیوقوف ہے۔'' مہیپال رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

''..... پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟'' آفتاب رائے نے مہیپال سے مطالبہ کیا۔

''میاں آفتاب بہادر.....'' مہیپال نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا..... ''یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا..... جو افلاطون زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمہاری.....؟''

''کیا بکواس ہے.....'' آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہیپال رائے زادہ کو صریحاً غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا..... ''تو

میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ..... ''اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑو لے کر..... کیا کرتی؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیا۔ خیر چلو..... خیریت گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں۔ کیونکہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں..... تم کو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ کہ اس نے تم کو ایک بار عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافع بلیات ثابت ہوا.....''

''بیہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ۔'' آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز اتفاقاً اے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب لوں نہیں آئے..... کیس چوک بھئی موسے آلی..... پھر ارچنا سبز جی آ جاتی۔ اور کوئیل ایسی آواز میں گاتی..... آمی پوہوڑی جھورنا نکر مکر بو جوئے..... بو جوئے ہو..... اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت

کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھئی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انہوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی۔ اور سرخ ساری میں ملبوس تھی۔ اور آلتا اس کے پیروں میں تھا (آلی ری سائیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار..... وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی۔ اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں۔ اوپرنس ارجنا۔ (''ارے جا'' عسکری ڈانٹ بتاتا۔ ''اگر تم اس چکر میں ہو تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہا گرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے۔'' مہیپل اضافہ کرتا

جونپور آ کر وہ کھیم کرن دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے جل بھرنے چلی ری گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

''اری او باؤلی۔ بتا تو کیا کرنے والی ہے۔'' وہ سوال کرتے۔

''پتہ نہیں ماما'' وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

پتہ نہیں کی بچی۔ وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آ گیا۔ آفتاب رائے کو خیال آیا۔ شاید ایکے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں آئی تھی۔ انہوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا۔ تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، آگرہ، علیگڑھ، بریلی، مرادآباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ 'صوبے کی تہذیب' سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلے محلے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں

مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں۔ چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔ اور لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائینچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے ''اجار'' کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولیس کا عملہ اسی ۸۰ فی صدی مسلمان تھا محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بٹیا کا جہیز بنانا تھا۔ اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے۔ برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا۔ ہاتھی گھوڑا پالکی۔ جے کنہیالال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا۔ لہٰذا غیر شعوری طور پر IMAGERY بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور رنگھٹ کی گوپیوں کا

عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں۔ جنھیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ کارمرزاپور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردعمل ثابت ہوسکتا تھا۔

کس طرح انیسویں صدی کی وہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا۔ پہلے یہ کنول

کماری کو دپڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اتھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی۔

یہ میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انہوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا۔ بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ ان سے کہا گیا۔ ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ تمہاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ ڈھلمل یقین۔

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انہیں جونپور کا قاضی کہا کرتے۔ ''یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا..... ''جونپور کا قاضی''..... عرف ''میں شہر کے اندیشے میں دبلا کیوں ہوا.....!''

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پراسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اداسی تھی۔ اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہرے کے جنگل میں اگیا بیتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے

وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنور نرنجن داس کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

''عاشور کی شب لیلےٰ ارے سرہانے شمع رکھ کر۔'' بی مدن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔

''.....اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا.....'' بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

''اے لو دونوں سٹھیا گئی ہیں..... اے بیوی چاندرات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں.....!؟'' بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

''توبہ توبہ۔ کمبخت ایسی ساڑستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ بجھائی تھوڑی دے رہا تھا..... میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا..... اے بہن..... اے نیازی بیگم..... ذری اپنی عینک تو دینا.....'' بوامدن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بوامدن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

''اے بوامدن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں.....؟'' بڑی بھاوج نے

تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''لڑکیوں سے پوچھئے..... بڑی بھاوج..... نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھت ہیں۔'' بگن نے جواب دیا۔

''ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں۔'' بوامدن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بوامدن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظر استحسان نہ دیکھا تھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوامدن کے اس طعنے کا انہوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

''ڈولی اتروالو۔'' باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

''پردہ کرلولوگو۔ کہار اندر آتے ہیں۔''

فیرینی کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر مملہ تیز آواز میں چلائی۔ ''چھمو بیگم آ گئیں۔''

چھمو بیگم ڈولی میں سے اتریں۔ اور پائینچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ ''اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے۔'' انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں مملہ نے یہ سن لیا۔ ''اے چھمو بیگم۔ ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے۔ بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے۔ شیطان کے کان بہرے۔

ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کو لیکے نوبت راؤ کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اتا اتا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں۔'' اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

''اے بی ممولہ۔ ذری آپے میں رہنا۔ میں خود سے نہیں آ گئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آ کر مجلس پڑھ جاؤ۔ مجلس پڑھ جاؤ۔ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں۔ اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو۔' چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اٹھ کر باہر آئیں۔ ''اے ہے۔ یہ کیا کوا نوچن مچی ہے۔ اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم لوگ کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو۔ چل نکل ممولہ یہاں سے۔ ڈوبی جب دیکھو تب یہی فضیحتا شروع کر دیتی ہے۔ آؤ چھمو بیگم جم جم آؤ۔''

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوایئے بیگم صاحب۔

(ارے دیا رے۔ ساری دیہہ دکھن لاگت ہے۔ رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے چلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور ریڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑوہ ایک طرح کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا۔

جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور چرخ چوں کرتا ریڑھ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی چوپہلہ صرف صدر اعلیٰ کے یہاں تھا)

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ اور عینک لگا کر بڑے ٹھسے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بوامدن خود بڑی ہائی بروسوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمو بیگم کی پرواہ نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھنکے لگاتی بوامدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ ہاں یہ رام پور کی میر یاسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ بگن سلمہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بوامدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بوامدن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی اور بہاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کر دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھل کھل کر ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھمو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کبن صاحب بلکہ خود قبلہ جارچوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی فلسفے کے واقعہ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمو بیگم پل کی پل میں دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

'اے صاحبان مجلس..... جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کئے..... والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمیکس تک پہنچتی تھیں کہ ''اے بیبیو..... جناب عباسؑ نے رو کر کہا بالی سکینہ اٹھو.....'' تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاء اللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا ان کی رو د خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبریل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالت مآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں..... بیبیو..... میں کوئی مورخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی

تھے۔مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخ اول پر اتر آئے تھے۔اور نور کی جھاڑو سے رسالت مآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں..... اے بیبیو..... جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ان کا احوال مجھ سے سنو۔اور کان کھول کے سنو..... کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنہ بیبیو..... کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قل ھو اللہ احد. اللہ الصمد لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفو ا احد ..... یہ ون کیا ہے.....؟ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں۔مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادت علی اکبرؓ سے ملا دیا جاتا۔یہ چھمو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں۔لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔زندگی کا ایک چلن قائم تھا۔جس میں شادی بیاہ تیج تہوار،لڑائی جھگڑے،محرم،کونڈے جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت،غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ

رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ وسسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالہ پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہوگئی۔ سچ کہا ہے کہ بوا کہ زر، زمین، زن، تین چیزیں گھر کا گھروا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروالیا۔ اس پر بھی کہنے والوں بہن منہ کس نے بند کیا ہے محلے میں اڑ گئی کہ یہ جو چھوٹی اماں اپنے غلے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں اوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بوا مدن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمو بیگم کا ہے۔ حرافہ ایسی ادھر کی ادھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال کے سال منبر پر مولون بن کر

چڑھ بیٹھتی ہے۔ چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھمو بیگم جیسی کٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بوا مدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہی۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گل زہرا کو فدائی..... نوماؤں نے دیکھی درخیمہ سے لڑائی..... ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا..... اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے۔ جی ہاں۔ ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریڈیو پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آراء اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے تو بہ تو بہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کرتی گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے نٹنگ کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پر وہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی ''نظارے'' اور حجاب امتیاز علی کی ''ظالم محبت'' تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی سی ایس میں آ گئے تھے۔ گیننگ کالج سے ایم۔ اے ایل ایل بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دون کی لیتے تھے۔ کہ مس سکسینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پر گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈیاں باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اچھے سال ہی کھلے۔

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ

جاتا ہے۔اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔

(۵)

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔جب جگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفےٰ دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات سنایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹنٹ تھا۔مہنگائی شدید تھی۔لیڈر جیل میں تھے۔لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔حافظ ابراہیم کے استعفےٰ کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا: کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کر سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھ..... کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔پردے کے بڑے پابند۔کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج

نہ تھا۔ 'باعزت متوسط طبقے' کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں: (الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا (ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔ (ج) اعزا میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ (د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی سپتریاں اس وش ودیالے کی ودیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں

اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر مایا کھیم کو اتروانے کے لئے آ گئے تھے۔ اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۶)

''کھیم وتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد بینٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی۔ وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے اوپر جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اتر رہی تھی۔'' کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے۔

''کیا تم نے کبھی سوچا ہے۔'' اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے، ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری۔ چار سال بعد جب اس وقت کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر ''ہلو کشوری'' کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

''اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقاء نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتارام کا فلم ہوگ ء۔ بنو اچھے پڑوسی کرو بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری۔ یہی ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دوکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے۔'' کشوری چپ ہوگئی۔

آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا۔ اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر ''موجوں کے اوپر'' کا والز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

''آج میں کنول کماری کے ہاں چائے پر گئی تھی۔'' ارملا نے کہا۔ ''وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے ''مجلس میلے'' کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔''

کنول کماری؟ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سیکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروالیں۔ پام دت وغیرہ سبھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کرلیا۔''

سوریہ است ہو گیا۔ سوریہ است ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں ''میلے کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

''میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں۔ اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ ہم عصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں ہمارے متعلق ''اڈیٹوریل'' لکھتے ہیں۔ دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں۔'' کشوری نے کہا۔

چاروں اور آگ لگی..... دل میں بھوک پیاس جگی..... پگ پگ ہم گاتے..... ہم گاتے ہم گاتے..... لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

''میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندہ سمجھاؤں۔ اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا۔ تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہوگئی تھیں۔

''کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے۔'' روزماری نے اظہار خیال کیا۔

ہاں، جونپور میں، میرے محلے میں، شاید تین چار بچے کھچے سوگوار چہلم کے تعزیوں کے سارے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گذر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کشوری نے دل میں کہا۔

''برفباری شدید ہوگئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بےمصرف ہیں؟'' روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں۔ کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گاتے چلیں۔ لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول، پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا مہاسبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی

کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آ جاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش، مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ ہوگی۔ نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری ''شو ڈاؤن'' کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہوگئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا: آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آ کر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیوا جی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی۔ کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا..... ''کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائیک ہم نے..... آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔''

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے..... اری تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باؤلی سی۔ وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنگارے۔ ''بات یہ ہے مس عباس۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ سیاست اور حصول تعلیم کے درمیان جو.....''

''اجی ڈاکٹر صاحب لے بس اب رہنے دیجئے۔'' کسی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے قبلہ.....''

''ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے؟'' دوسری آواز آئی۔

''دیکھو میاں صاحبزادے۔'' آفتاب رائے نے رسان سے کہا۔ ''معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو۔''

''ہم کچھ نہیں جانتے۔'' انہوں نے شور مچایا..... ''معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔''

''ضرور مناؤ۔'' آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اکتا کر کہا۔

''اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔''

''ضرور کرو..... خدا مبارک کرے.....'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔ اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

''کٹر مہا سبھائی نکلا یہ بھی۔'' لڑکیوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفےٰ دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہو گا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادعلی کا ورد کیا کرتے۔ اور پولس ہر سمے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا آپ نے کراچی میں کتنی جائیداد خرید لی ہے۔ آپ خود کب جا رہے ہیں۔ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا

کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سمے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔وہی کشوری تھی۔جی کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاس ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ایم۔اے میں پڑھتی تھی۔اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم۔اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔اور ملازمت کرے گی۔ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔کالج میں پڑھایئے۔نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیئے۔اخباروں میں مضمون لکھئے۔ریڈیو پر بولیے۔کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ نچھو ہو۔لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آ جاتی۔دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا،چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ۔میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔میرے لئے لوکی کا حلوہ کون بنائے گا۔پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں۔دیوانے ہوئے ہو۔بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔آج نہ گئی کل گئی۔جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔سارے اچھے اچھے لڑکے ایکو ایک پاکستان چلے

گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبا دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا۔ بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا جو نپور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پالس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آ جاتا۔ بچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو بوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔

چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا۔ یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی توسٹی گم ہوگئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیرا ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنومکس کی ایم اے کو کہیں جونیئر لیکچرر شپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اور ویسے ایمان کی یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفادار کا کیا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پر اس کا یہی سننے کو ملتا۔ اور وہ گھوم پھر کے جونپور لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا۔ وہ تمہاری گوئیاں کھیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے بااثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں

گے۔ اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی۔ اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے ..... اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی اڑتی سنی تھی۔ کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں، ان کو مرارجی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کو ری پبلک لمپی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے بہر حال۔ ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل ''زیر زمین'' تھے۔

بچارے آفتاب رائے۔

آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق، اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھیں۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ اب وہ اللے تللے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہارنیں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس نگوڑی

مملہ رہ گئی تھی۔سو اس کی آواز کو بھی پالہ مار گیا تھا۔لیکن چھمو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری۔آ گئیں چھمو بیگم۔آؤ جم جم آؤ۔

چھمو بیگم چپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔''مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی۔اور یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوامدن اپنی پرانی ''دشمنا گی'' فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں۔''لو بوا غم حسینؑ کو یاد کرو۔اپنا غم ہلکا ہو جائے گا۔مولا تو ہر جگہ ہیں۔کیا پاکستان میں نہیں ہیں۔''

''ہاں۔ہاں۔'' باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی۔مولا کیا پاکستان میں نہیں۔تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔

''لو بوا۔ہم بھی چل دیئے پاکستان۔'' جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمو بیگم چاندرات کا بیان ختم کر چکیں تو بوامدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

''سچ کہو بوامدن۔'' بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیوی۔ہم بھی چل دیئے۔'' بوامدن نے اعتراف کیا۔

''کیسے چل دیں.....؟'' بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں۔سب فضیحتوں سے الگ۔سارے دلدر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر.....

''بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا۔ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آ جاؤ۔ کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔

''اچھا؟ شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں۔'' بڑی بھاوج نے کہا۔

عاشور کی شب کی لیلے۔ بوامدن نے جو حسب معمول عینک گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز ملائی۔ چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

(۸)

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آ کر دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈریمیٹک آرٹ جا کر کریوگرفی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور

لیڈی اولیویز اینتھی ایسکو۔ تھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستان بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئیل وٹلکچوئیل نہیں ہوں۔ سیدھا سیدھا آدمی ہوں اور جس ڈھرے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پائجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی ''ڈپلومیٹک وائف'' تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹ میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں ''نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن'' کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی جھپسٹ میں انٹلکچوئیل بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

سوریہ است ہوگیا سوریہ است ہوگیا..... ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

کنول دیدی۔ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے۔''

''ہاں ہاں بھئی .....'' کنول نے جواب دیا۔ ''اوہ وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ۔''

''ارے ہائے۔'' ارملا نے رک کر کہا۔ ''وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ چھین کر لے گئے۔ کہنے لگے کل دے دیں گے۔''

''ڈاکٹر..... آفتاب..... رائے.....؟'' کنول نے دہرایا۔

''ہاں ..... کنول دیدی.....'' ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ ''وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ برا ڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی۔''

''گڈ نائٹ ارملا۔''

''ارے ہاں۔'' اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا۔ ''کل آپ رائل کمانڈ پر فورمنس میں جا رہی ہیں؟ آپ کو تو سر رالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا۔''

''ارے نہیں بھئی۔'' کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی آواز میں کہا۔ (''یہ بھی اس کا ایک پوز ہے''۔ ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سیکنڈ سیکرٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا۔ ''جانتی ہے کہ

بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چڑیل کہیں کی'') نہیں بھئی ارملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں۔''

''اچھا۔ گڈ نائٹ۔''

''اچھی طرح سوؤ۔'' کنول نے کہا۔ ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ اجی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے۔ کہنے لگے کل دے دیں گے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ داسنتھی۔ اس نے چلا کر آواز دی۔ کھانا گرم پر لگا دو۔ اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتی ہو پوہوڑی جھورنا۔ نکر مکر بو جوئے بو جوئے ہو۔ اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لینٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔

میں نے کیا کیا تھا؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی۔ سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہو گا۔

ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ۔ ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا

تھا۔جن ڈھونڈھاتن پائیاں گہرے پانی بیٹھ۔

.....میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ملتا ہے؟

باہر اندھیرا تھا۔اور سردی۔اور بیکراں خاموشی۔میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر۔اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا۔تم کیوں چلے گئے تھے۔میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔تم اسی طرح رہتے۔اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر.....؟

نیچے کیرل گانے والے ہیتھ کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر۔اب جو میں ہوں۔اور جو تم ہو۔کیا یہی بہت ٹھیک ہے؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بور سے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ.....!!اور کمال یہ کہ عین مین اسی طرح کا آدمی جین نکلا.....) آفتاب کی بیوی۔یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔کوئی ہوگی چڑیل۔آخر میں سب کرکری کھاتے ہیں۔ثروت نے اضافہ کیا تھا۔خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی۔جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔لیکن فراٹے

بھرنے اور ہوا میں اڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں۔ اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے اپنی ساری برائیوں کی فہرست بنائی۔ لیکن پھر بھی بات کچھ ٹھیک نہ بیٹھی۔ بہر حال اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اترنی چاہئے تھی کہ یہ مہاپرش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آ کر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جے جے ونتی سنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے ماں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ۔ ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیپل کے بعد ایک روز اس نے ''گینگ'' کی باقی افراد سے کہا:..... بھئی نمبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چائے پیتے پیتے رک کے۔ دفعتہً کنولا رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا ہیپل کو فون کر دو۔ کہ آم خرید تا لائے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی۔ وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی۔ اور بیکراں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی

طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمنس ہیں۔ اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال، اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اترتا ہے۔ کیا الٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا۔ چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میخ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا۔ وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے۔ بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹری چمک رہی تھی۔ جی ہاں۔

اری ثروت۔ کر دک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا

ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوئی ہے (یا۔VICE VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔اب وہ کیا کر رہا ہے۔ڈاکٹر ڈی پی مکرجی کی طرح مہا گرو بن چکا ہے۔غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔یہاں پہنچ کر اسے عجیب وغریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا۔(وہ کون ہوگی۔کیسی ہوگی۔آفتاب کے ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا۔کیا بات ہے صاحب۔ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ۔اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے۔اور ٹینس کھیلا۔ادھر ادھر خواتین سے بھی مل لئے۔لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا۔بیچاریاں۔!! اور اپنا ہی بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا۔یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر۔تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی۔زندگی تمام ہوئی۔زندگی تمام ہوئی۔نچلی منزل میں ارملا ہریندرناتھ چٹوپادھیا کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔کہرہ اب کم ہو گیا تھا۔اور آسمان کا رنگ قرمزی

تھا۔ جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف۔ مشرقی یوروپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہوئے شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

صبح ہوئی، شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا۔ اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے۔ اور ابھی میں راستے ہی میں تھی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے۔'' کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں

منہمک ہوگئی۔

آج مڈ نائٹ ماس منانے جائیں گے۔ روز ماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم بروم پٹن اوریٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہنگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابل رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام ''آزادی سے فرار'' رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے ''آزادی کا شکرانہ'' کر دیا۔ آج کی رات میں وہاں امید اور نا امیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور ہے جانے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یک لخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آ جاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر بھی کوخوشی ہوتی ہے۔''

اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھا۔ ''لیکن پرانے دشمن سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی۔ آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آ گئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔ ارے کھیم۔ کھیما۔ میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہوگئی تھی۔ اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ کھیما رانی تم ہم کا نا ہیں چنہیں؟ میں نے بالکل بیساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی۔ ہلو کشوری۔ اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ یہ میرے پتی ہیں۔ کھیم نے اسی سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب۔ میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

''تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہئے۔'' کھیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھ دار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا۔ اچھا بہن جی۔ اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینز نگٹن میں رہتے ہیں۔ اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم۔ میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

''میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی۔ کہ رفیقو۔ انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا

تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لیے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کا فلم ہوگئی۔ میں نے اور کھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا۔ اور باقی تم جو کہتا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔ سمجھیں۔

''اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روزماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔'' اس نے روزماری کو مخاطب کیا۔ ''تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی۔''

''ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک ''سرد لڑائی'' کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔''

''ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے ہیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستان مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے؟؟''

وہ خاموش ہوگئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے

رہے۔سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں ''وائٹ کرسمس'' گائی جارہی تھی۔

''شاید میں نے تمہیں بتایا تھا۔'' ارملا نے نیچی آواز میں کہا۔''کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے میں نے ان سے پوچھا۔ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ ری پبلک لمبی ڈورا میں سفیر ہیں۔تم نے غلط سنا تھا۔! انہوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔تو کیا آپ بھی۔ میں نے سوال کرنا چاہا۔ہاں۔میں بھی۔اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے۔اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے ان کو نگل لیا۔ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے۔نجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔کیا کرتے ہیں۔اتنا عرصہ انہوں نے کیسے گذارا۔وطن واپس جانے کی اجازت انہیں کب ملے گی۔کیا ہوگا۔''

دور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔وہ سب باہر سڑک پر آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے۔اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔انہوں نے سوچا۔لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔لیکن دیکھو۔یہ راستے۔یہ جھیلیں۔یہ باغات۔ہمارے منتظر ہیں۔سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی۔لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد۔جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو

ہے۔وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزتھن وضع کے میز ہاؤس میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سیکرٹری کا مکان تھا۔اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔انہوں نے سوال کیا۔اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔گھاس کے ان راستوں پر۔زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھتنے؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا۔آؤ۔آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔میں تمہارے خدا کی آواز ہوں۔اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔اور ہر موت کا محافظ ہوں۔اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سمے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے۔اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے۔اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔پھر ایک دیوار ہے۔لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاستدان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہدنامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہدنامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے۔ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنولا رانی۔ کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آجاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے۔ کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

پرانے عہدنامے منسوخ ہوئے۔ کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گی۔ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے۔ مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔

لیکن کنول کماری۔ تم اب بھی رو رہی ہو؟

ختم شد۔۔۔